

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تسکین الحائض

فی

مخائن کفر الایمان

امانت شاه احمد رضا خان دہلوی کے تبرکات مبارکہ

تالیف: عید الرزاق بختر لوی حطاروی

مدرس جامعہ ضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی

مکتبہ ضیاء

بومہ بازار راولپنڈی

تَسْكِينُ الْجَنَانِ

فی

مَخَاسِنِ كِبْرِيَاءِ الْمَلِكِ

علمیہ الشاہ مولانا احمد رضا خان رحمت اللہ علیہ کے ترجمہ کا تعالیٰ جائزہ

تالیف

عبدالرزاق بھٹو لوی صاحب

خطیب مسجد غوثیہ الفیہ - ۱

اسلام آباد

تسکین الجنان فی محاسن کثر الایمان
 مولانا عبدالرزاق چشتی مجتهد الہدی
 محمد اسلم، محمد حیات ڈوگر، شاہ محمد چشتی قصور
 فون - ۳۱۳۶

صفحات
 تعداد پار اول
 ناشر
 پب
 ۱۱۰۰ (۱۹۸۴ء - ۱۹۸۵ء)
 مکتبہ ضیائیہ۔ راولپنڈی

انتساب

بمدرۃ المحققین استاذ العلماء استاذی المکرم حضرت

علامہ مولانا محمد اشرف صاحب سیالوی شیخ الحدیث سیال شریف

کے نام جنکی محنت و محبت اور روحانی توجہ کی وجہ سے ہی میں

نے تالیف کا یہ کام مکمل کیا، آپکی توجہ کے بغیر میرے لئے یہ

مرحلہ طے کرنا ناممکن تھا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکی اس مشفقانہ توجہ کو

میرے لیے رہنما بنائے رکھے اور آپکا سایہ تادیر قائم رکھے۔

پسِ خاطر

- ◆ استاذ العلام حضرت علامہ غلام محی الدین شاہ صاحب
 - (مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ رضویہ راولپنڈی)
 - ◆ مولانا حسین الدین شاہ صاحب نائب شیخ الحدیث جامعہ رضویہ راولپنڈی۔
 - ◆ مولانا محمد یعقوب ہزاروی صدر مدرس جامعہ رضویہ راولپنڈی۔
 - ◆ مولانا عبدالرشید صاحب قریشی مدرس جامعہ رضویہ راولپنڈی۔
 - ◆ مولانا ابوالفضل القدوتہ صاحب سیالوی بجا بڑا ضلع سرگودھا۔
 - ◆ مولانا گل احمد صاحب جامعہ نعمانیہ لاہور۔
 - ◆ مولانا شاہ محمد چشتی سیالوی خوشنویس قصور۔
- ان تمام حضرات کیلئے میرے دل میں انتہائی
احترام کے جذبات موجود ہیں کہ انہوں نے مجھے مشورہ دل سے نوازا۔

اظہارِ تشکر

عزیزم حافظ مولانا محمد اختر صاحب گجراتی ٹاشکویہ
ادا کرتا ہوں جنہوں نے ادراق میں بھرے ہوتے مضامین
کو جمع کرنے میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے
علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

مولانا غلام سرور صاحب امام مسجد بربکاتیہ لاہور
جنہوں نے طباعت میں امداد فرمائی ان کا بھی شکریہ گزار رہوں۔
اللہ تعالیٰ انکو جزا خیر عطا فرمائے۔

تقریظ

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا محمد گل احمد عتیقی شیخ الحدیث دارالعلوم نعمانیہ لاہور

امام اہل سنت حضرت علامہ مفتی شاہ احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، اپنے بیگانے سبھی آپ کے علمی کمال کے معترف ہیں، آپ کا ترجمہ قرآن آپ کے علم و فضل کا شاہد عدل اور روشن تر دلیل ہے گا بے تفاسیر کے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین کو آپ ایک جملہ میں نہیں بلکہ ایک لفظ میں سمجھ کر رکھ دیتے ہیں گو یا کہ آپ کا ترجمہ قرآن دریا اندر جناب یا سمندر کو زب سے میں بند کر دینے کا مصداق اتم ہے فاضل اجل حضرت علامہ مولانا محمد عبدالرزاق چشتی مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم سٹائنٹ ٹاؤن نے آیات کثیرہ کے تراجم کے ساتھ ان تفسیری مضامین کو بھی بیان فرما دیا ہے جس سے تراجم کو چاک چاند لگ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ فاضل کی عمر دراز فرمائے اور انہیں دین متین کی مزید توفیق عنایت فرمائے اور لوگوں کو ان کی کاوشوں سے بہرہ مند ہونے اور استفادہ کی توفیق بخشے۔ اللہم یرد فی ذہبنا سید المرسلین

محمد گل احمد عتیقی

شیخ الحدیث دارالعلوم نعمانیہ لاہور

marfat.com

Marfat.com

تقریب
استاذ الفاضل اذی المکرم علامہ عبدالحکیم شرف قادری شیخ الحدیث جانتظایہ رضویہ لاہور
نگاہِ اولین

کچھ کتابیں بہترین راہنما اور بہترین ساتھی کی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ کتابیں ہولناک
تباہی اور بربادی کا سامان ہوتی ہیں غرضیکہ کتاب کی اثر آفرینی سے انکار نہیں کیا جا
سکتا، انسانی تاریخ میں آج تک کتنی کتابیں لکھی گئیں، کوئی محقق انکا شمار نہیں کر سکتا،
لیکن یہ بات بلا خوف تو دیدہ ہی جاسکتی ہے کہ سب سے اعلیٰ سب سے زیادہ محل
اور لافانی کتاب صرف اور صرف قرآن پاک ہے جو تخریر و تبدل سے محفوظ اور بی نفع
انسان کے لئے پیامِ حیات ہے، پیامِ امن ہے، صراطِ مستقیم ہے اور انسانی زندگی
کے ہر گوشے میں راہنمائی کرنیوالی کتاب ہے۔

قرآن پاک کتابِ ثواب بھی ہے اور کتابِ انقلاب بھی، نبی اکرم، ہادی اعظم
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی بنیاد پر جو انقلاب بھی بپا کیا، تاریخ اس کی نظیر
پیش کرے قاصر ہے، وہ قوم جو ہر اعتبار سے پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق تھی اسے
مختصر ترین عرصے میں عظمتوں کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا کہ اس وقت کی روسپر پا و حکومتیں
روم اور ایران ان کے سامنے سرنگوں ہو گئیں، یہ وہ عظیم انقلاب ہے جس نے غیر
مسلم دانشوروں کو محو حیرت کیا ہوا ہے اور وہ اس گہنی کو سلجھانے سے عاجز نظر آتے ہیں
اسکے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی موجودہ حالت زار پر غور کریں تو سر بار زدامت سے جھک
جاتے ہیں، کہاں وہ شاندار عروج اور کہاں یہ افسوس ناک زوال؟ — وہ بظاہر ہے بقول شاعر

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر

اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

آج کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہم قرآن و حدیث پڑھیں، سمجھیں اور ان پر عمل کریں،
اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم علوم و بینیا اور عربی زبان میں اتنی مہارت حاصل کریں کہ قرآن و
حدیث کا عربی زبان میں مطالعہ کر سکیں اور ان کے مطالب و مفہم تک سائی حاصل کریں مگر آج

جبکہ ہم علوم دینیہ کے کوسوں دور ہیں اور عربی زبان سے بالکل ناواقف، ایسے حالات
 میں ہماری یہی خوش نصیبی ہے کہ ہم تراجم کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب مکرم
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احکام و تعلیمات جاننے کی کوشش کریں۔
 اردو زبان میں قرآن پاک کے بہت سے ترجمے سکھے گئے ہیں اور بازار میں
 دستیاب بھی ہیں لیکن ترجمہ کرنے کیلئے عربی لغت اور گرامر سے واقف ہونا ہی کافی
 نہیں ہے بلکہ بارگاہ الوہیت اور دربار رسالت کا ادب و احترام، عصمت انبیاء کا
 لحاظ، ناسخ و منسوخ، شان نزول سے واقفیت، بظاہر اختلاف رکھنے والی آیات
 کے درمیان تطبیق، عقائد اہل سنت، تفسیر صحابہ و تابعین اور تفسیر سلف صالحین پر
 گہری نظر اور عبور ہونا بھی ضروری ہے، امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ
 نے تقریباً پچاس علوم و فنون میں بے مثال مہارت، وسیع مطالعہ اور حیرت انگیز
 حافظہ عطا فرمایا تھا انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ کر کے عام المسلمین پر بہت بڑا
 احسان فرمایا، بلاشبہ ان کا ترجمہ تمام خوبیوں کا حامل اور قرآن پاک کا بہترین ترجمان ہے
 ان کے ترجمہ قرآن کی بے پناہ مقبولیت نے مخالفین کو سرسیمہ کر دیا ہے چنانچہ
 کئی کتابچے اور پمفلٹ اس ترجمہ کے خلاف دیکھنے میں آچکے ہیں، ایسے ہی ایک
 پمفلٹ کے شبہات کا ازالہ کرنے کے لیے فاضل نوجوان مولانا علامہ عبدالرزاق زید
 مجدہ نے پیش نظر کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں انہوں نے عالم اسلام کے مسلم مغربین
 کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کا ترجمہ ہی صحیح ترجمہ ہے
 مولانا عبدالرزاق زید علمہ ضیاء العلوم جامعہ رضویہ، سبزی منڈی، راولپنڈی کے
 مدرس ہیں اور علمی ذوق سے سرشار ہیں، ان کی یہ پہلی تحریری کوشش ہے جو لائق تبریک و
 تحسین ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ تصنیف و تالیف کے میدان میں انہیں
 مزید کام کرنے کی توفیق نصیب ہو اور ہمارے نوجوان علماء کو بھی قلم و قسط اس کا ہمتیہ
 کا شعور عطا ہو۔

محمد عبدالحکیم شرف قادری

جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

marfat.com

Marfat.com

ابتدائے سخن

جسے کائناتِ عالم پر انحطاط کے
 بادل چھپائے ہوئے تھے۔ علم و دانش کے چراغ بجھے ہوئے کھتے بلکہ عقل و خرد
 کا نام و نشان ایک تنکے کی طرح ہوا کی زد میں آنے کی وجہ سے مٹ چکا تھا۔ سوچنے
 سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ خلوص و ایمان داری کو حشم و حقارت سے دیکھا
 جاتا تھا۔ عیاری و مکاری کی عزت افزائی ہوتی۔ ڈاکہ زنی، سود خواری کو طرہ امتیاز
 بنا لیا گیا تھا۔ بد کرداری، شراب نوشی کو روحِ جاں سمجھا جاتا تھا۔ اپنوں، بیگانوں
 میں تمیز کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ زہر کو تریاق سمجھ کر بڑے شوق سے نوش
 کیا جاتا اور تریاق کو زہر سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا۔ غرضیکہ سلامتی
 کی کشتیاں طوفان میں گھر چکی تھیں۔ بے رحم موجیں اقوامِ عالم خصوصاً اقوامِ عرب
 کے سفینوں کو دھکیل دھکیل کر گرداب کے حوالے کر رہی تھیں۔
 ان طوفانوں سے بچنے آزمانی کرنے کی فکر سے بے نیاز، اپنے مستقبل کو
 درخشاں کرنے سے حشم پوشی، اپنی غلطیوں اور لغزشوں کا ازالہ کرنے کے بجائے
 شب و روز ان میں مصروف رہنے میں اترتا اور جوڑ لزلے ان کے اذہان و
 افکار کی دنیا کے فلک بوس الوان کو پوند خاک کر رہے تھے ان کی غارتگریوں
 اور فتنہ سامانیوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نہ کرنا ان کی رگ و جان میں سرایت کر
 چکا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ اخلاق اور شائستگی کا تصور کہیں خال خال
 نظر آتا، جائز و ناجائز، حسن اخلاق و بد اخلاق میں اکثریت کو کوئی تمیز نہ تھی۔
 شرم و حیا کا بھی جوازہ نکل چکا تھا۔ کعبہ شریف کا برہنہ طواف کرنے میں بھی
 عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

ایسے حالات میں یکایک ایک ہستی کا ورود ہوتا ہے جو مشفق و مہربان، مہربانی، مہربانی اور ہمہ تن صفاتِ حمیدہ اور اخلاقِ حمیدہ سے متصف، جنہوں نے ایک عظیم مدبر و مفکر کی حیثیت سے رگستانِ عرب کی بچھری ہوئی قوم کو اخوت و محبت، ایمان و ایقان کی وحدت کی سِلک میں پرو دیا۔ جنگِ جو، جاہل، غیر متدین، غیر مہذب، ناشائستہ سرکش اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والوں کو ایک مذہب، ایک تہذیب، تمدن اور ایک ہی نظام و قانون کے تابع بنا دیا۔ اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ امن و سکون، محبت و پیار کا سبق دیا تاکہ اس سرزمین پر بسنے والے اپنی صلاحیتوں کو نکلی اور اصلاحی سرگرمیوں میں حصہ کر سکیں تاکہ عداوت، حسد، منافرت، مجادلہ، مقابلہ کے شعلے ان کے خونِ عافیت کو جلا کر خاکستر نہ کر دیں۔ ایک مجبور حقیقی کا تصور دیا۔ روزِ محشر کے محاسب کا خوف دلایا۔ اعمال کے محرکات و عوامل سے ان کو خوب آگاہ کیا اپنے اخلاقِ لہجہ سے ان میں انقلاب پیدا کیا۔ اپنی فصیح و بلیغ کلام، شیریں اور مسخو رکھن زبان سے ان کے دلوں کی حقیقت کو یکسر بدل دیا۔

آپ سرزمینِ عرب کے ایک مہذب خاندان کے فرد ہونے کے ناطے، بنو سعد کی فضاؤں میں پروردہ ہونے کی وجہ سے فصیح ترین زبان سے آراستہ و پیراستہ تھے، بیسیہات و تمثیل، خطابت کا عجیب انداز اور ایسا اسلوب جس کی لطافتوں سے متاثر ہوتے بنی اسرائیل عرب بھی نہیں رہ سکتے تھے، انھیں بھی بر ملا کہتے ہوئے پایا گیا کہ ایک ہی مقام پر پرورش پانے کے باوجود آپ کی زبان لطافتوں سے مزین کیوں؟ ان کا جواب ان الفاظ میں دیا جاتا ہے: **ان اللہ عزوجل ادبجہ**۔

فاحسن ادبی و فنانات فی بنی سعد بن بکر۔ بیشک میری ساتی فصاحت اللہ عزوجل کی عطا کردہ ہے۔ اسی نے میرے ذوقِ ادب کو خوب تر بنایا ہے۔ میری نشوونما بنو سعد کی فصیح و بلیغ فضاؤں میں ہوئی۔“

جو امح الکلم آپ کا اعجازِ خاص تھا یعنی مختصر ترین کلمات جو معانی کی بہت بڑی وسعتوں کے حامل ہیں۔ آپ کے اجزائے کلام جو گوہرِ نایاب جو اہر درخشندہ معنوی

گہرائی کی وجہ سے دلوں پر تاثیر کرنے کے لحاظ سے مثال نہیں رکھتے۔ آپ کی کلام جو نسیم سحر کی طرح سہانی، آبِ جو کی طرح برودت سے لبریز، تیغِ برق کی طرح درخشاں بھتی ہی لیکن وحی کی کلامِ مبین نے حسنِ گفتار کو اور بھی منور کر دیا تھا۔ آپ کی زبان بے مثال سے حیرت انگیز کلام سن کر اقوامِ عرب متحیرہ گئیں۔ اس کی شدتِ تاثیر سے آپ کے دشمن بھی ڈرتے تھے کہ کہیں دل میں نہ اتر جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام عالمِ عرب کے شعراء، خطباء، ادبا کو ایک دفعہ نہیں بار بار چیلنج دیا کہ تمام مل کر اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت بنا کر لاؤ۔ لیکن مقابلہ کی طاقت نہ رکھنے وجہ سے انھوں نے سنی آن سنی کر دی۔ آج وہی فصحاء و بلغاءِ مقابلہ سے عاجز ہو کر سر جھیکائے نظر آتے ہیں جو ایک طرح مصرعہ پر طویل قصائد لکھا کرتے دوسروں کی ہجو میں اشعار کے انبار لگا دیتے کسی کی مدح و توصیف میں فصاحت کے چمکدار موتیوں کو ایک سیلک میں جمع کرتے نظر آتے لیکن سیدِ دو عالم کے سامنے انگشتِ بدنداں اور زبان پر مہرِ سکوت ہے۔

تیرے آگے لچے بے فصاحتے عرب کے بڑے بڑے

کہے کہ منہ میں زباں نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

میدانِ فصاحت میں کوئی شہسوارِ سبقت نہیں چل کر سکتا۔ بلاغت کی بلند منازل کی چوٹیوں کو کوئی گوہِ پیا سر نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کا کلام ہے جس کی توصیف میں سعدی رحمۃ اللہ علیہ جیسے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بہتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

اسی وجہ سے معانی و بیان و بدیع کے جمیع ضوابط کا حامل ہے۔ استعارات، مجاز، مرسل، حذف و ایصال جیسی بیشتر صورتیں مذکور ہیں جن کا ایک ساتھ لحاظ کرنا اسی کو زیب دیتا ہے جو جمیع نقائص و عیوب سے پاک ہو۔ سہو و نسیان۔ علم کی قلت و کثرت سے متصف ذوات کو ان کا مد نظر رکھنا ممکن نہیں۔ ان استعارات و

تائیل سے آسار کو کھولنے کے لیے اور انتہائی مختصر مضامین جو غیر محدود معانی و مطالب کو متضمن سمجھے ان کی وضاحت کے لیے اور اس کلام کے لطائف و حقائق بیان کرنے کے لیے کہیں علامہ فخر الدین رازی سب سے تحقیق و تدقیق میں غوطہ زن ہو کر جو اہر نکالتے نظر آتے ہیں کہیں علامہ سید محمود آلوسی علم و عرفان کے موتیوں کو جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہیں قاضی ثناء اللہ معرفت کے باغات سے پھول چھینتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ہی جلال الدین سیوطی اور جلال الدین معلی راہ حق سے بھٹکنے والوں کو اتھاراً حقائق و لطائف سے آگاہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں علامہ ابوالبرکات نسفی معارف حقائق کے بیان کے ساتھ ساتھ فقہی استنباط کرتے ہوئے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ہر دور میں محققین کلام الہی کے اسرار و رموز کو اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق بیان کرنے میں کوشاں رہے۔ مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اردو زبان میں کئی تراجم معرض وجود میں آئے لیکن جب ان تراجم کا تفسیر کے آئینے میں تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یقیناً ایک ہستی کا ترجمہ انفرادی حیثیت میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہوگا۔

وہ ہستی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ہے جس کی فراست ایمانی نے ہندو مسلم اتحاد کی قباحتوں کا سب سے پہلے اندازہ لگایا جس نے کسی کی پرواہ کئے بغیر گاندھی اور اس کے مکار چیلوں کے دام قریب کو قبل از وقت تاڑتے ہوئے مسلمانوں کو بانگِ دہل لکارا۔ اے مجاہدِ مصطفیٰ، خبردار! ہندو کے دام صید میں نہ پھنس جانا۔ وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر تمہیں ننگل جائے گا تمہیں نیست و نابود کر دے گا اور یا ہندوانہ طرز زندگی گزارنے پر مجبور کر دیگا۔ اس مردِ بدوش کو سیاسی بصیرت، بالغ نظری کے ساتھ ساتھ ایمانی فراست اور علمی وسعت کا بھی ایک عظیم تر مقام حاصل تھا۔ عقل و فرد کے ساتھ دین و ایمان سے بھی بہرہ ور تھا جس کا ذہن و ضمیر، قلم و زبان سبھی محبتِ مصطفیٰ میں غرق تھے جس کے سوزِ ایمانی اور حیثیتِ دینی نے

جمود و خمود کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ جو اسلام کی عظمت کا تمثیل، اسلام سے
 دلی وابستگی اور اسلام کی سر بلندی کی کوشش میں اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے
 تھا۔ وہ جس کے عقائد، اعمال، صوت، سیرت، رفتار، گفتار، نشست و برخاست،
 خور و نوش سب میں محبتِ مصطفیٰ کی جھلک نظر آتی ہے۔ علمی بصیرت کا یہ حال ہے کہ
 ایک ہی وقت میں تمام علوم پر جاوی۔

آپ کے ترجمہ قرآن پاک کو دیکھ کر پلا ترو ڈیوہ کہا جاسکتا ہے کہ تجھ پر رحمت
 کائنات کی خاص نظر اور خالق کائنات کا تجھ پر کرم ہے۔ ترجمہ میں مضمرین کے
 اقوال کو نظر میں رکھنا۔ راجح مرجوح کا لحاظ کرنا، مجاز و استعارات کو ترجمہ میں سمجھنا
 مقابہات کا ترجمہ اس طرح کرنا کہ ان کی حیثیت برقرار رہے یقیناً یہ احسان
 مالک الملک ہے۔ ممکن ہے کسی مسخ شدہ ذہن والے آدمی کے نزدیک یہ علمی کمالات
 کے مراتب کی بے بہا قدریں کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں لیکن خدارا ابھڑ کے ہوتے
 جذبات کی آرزو میں بہتے ہوئے مخالف کے احساس کے زیر اثر کوئی فیصلہ نہ کریں
 بلکہ ان سے باندھ ہو کر عدل و انصاف سے غور کریں۔ بے شک آپ جذبہ عقیدت
 نظر محبت کو بالائے طاق رکھ دیں لیکن حقیقت کا دامن تو کسی کے کھنڈے اور
 ملمح سازی سے نہ چھوڑیں۔ آج کل زندگی محض ہنگامہ آرائی سے عبارت ہے
 غور و فکر کی رسم یکسر ختم ہو چکی ہے۔ اپنے حریفوں پر الزام تراشی، بہتان بازی،
 غذائے رُح بن چکی ہے۔ سنگین الزام عائد کرنے میں ذرا بھرا احتیاط نہیں کی
 جاتی بلکہ دشنام طرازیوں عروج پر ہیں۔ ان سہم نغز شول سے لہرزہ براندام ہونے
 کی بجائے ان کو علم کا منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے۔ کاش! کہ غور و فکر سے کام
 لیا جاتا اور اگر فقط تحقیق و تدقیق میں اختلاف کیا جاتا تو وہی اختلاف باعث
 رحمت بنتا لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اے اعتراضات سے قوم کو فکری آتش
 کے گردابوں میں غلطان و پھاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو حقائق سے دور
 ہوں۔ بلکہ ان اعتراضات کے انکشافاتِ طغیانی کے بے رحم تھپیڑے بن کر ان

کی بزمِ نشاط کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

آئیے! چند ایسی مثالیں دیکھیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ ایسا سلوک کیا
گیاہے جیسے کوئی کینہ پرور شخص اپنے بدترین دشمن سے کرتا ہے لیکن اپنے گریبان
میں سجا نکلتے کی کوشش نہیں کرتا۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ پر اعتراض اس
طرح کیا جاتا ہے :- انا انزلنا الیک الكتاب بالحق

پ ۵ سورۃ نسا آیت نمبر ۱۰۵

اس آیت میں ”اے محبوب“ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں لیکن افسوس یہ نہیں
خیال کیا گیا کہ یہ ایک ”ک“ ضمیر کا مرجع بتایا گیا ہے کہ اس کا مرجع نبی کریم کا ذات
پاک ہے۔ معترضین کے اپنے اکابر کے تراجم میں اس طرح کی زیادتیاں سینکڑوں
کی تعداد میں موجود ہیں۔

چند مثالیں بطور نمونہ مولانا محمود الحسن کے ترجمہ سے پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ
چند بھی صرف پارہ اول سے ملاحظہ ہوں :-

و علم ادم الاسماء کلھا ثم عرضہم علی الملائکۃ
”اور سکھا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سنے کیا ان
سب چیزوں کو فرشتوں کے“

یہاں لفظ ”اللہ“ اور ”سب چیزوں“ اور ”پھر سب چیزوں“ کسی عربی لفظ
کا ترجمہ نہیں۔

انبتہم باسمائہم

”بتا دے ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام“

فرشتوں اور چیزوں ————— کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

فتاب علیہ ”پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر“

اللہ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

واشربوا في قلوبهم العجل

پڑائی گئی ان کے دلوں میں محبت اس بچھڑے کی۔

محبت کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

بما قدمت ايديهم

”بسبب ان گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں ان کے ہاتھ۔“

”گناہوں، اور بھیج چکے عربی لفظ کا ترجمہ نہیں کیونکہ ”قدمت“ کا لغوی معنی ”بھیج چکے“ نہیں۔

ام شربون

کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو؟

مسلمان، کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

طوالت کے پیش نظر چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ دیگر تراجم سے اور اسی ترجمہ سے سینکڑوں مثالیں پیش کرنا کوئی مشکل نہیں۔ پھر لفظ محبوب پر سی اعتراض کیوں؟ جبکہ حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کو محبوب کہنا اور محبوب جانا خود ارشاد مصطفیٰ ہے: لا یومن احد لخصه حتیٰ کون احب الیہ

من والدیہ وولده والناس اجمعین ”کوئی آدمی اس وقت تک مومن

نہیں ہو سکتا جب تک مجھے اپنے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے محبوب نہ سمجھے“

مقامات حریری کی ابتدا میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے نبی کریم کے اسمائے گرامی

پر مشتمل اشعار اور ان کا ان پر حاشیہ مکتبہ اشرفیہ لاہور کو بھی نکلنے کا سبب کہیں

ایسا ہی اضطراب تو درپیش نہیں آیا؟ جب کہ ملک سراج دین کی طباعت میں مولانا

کے اشعار اور ان پر حاشیہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے استدلالات مذکور

ہیں جو حبیب پاک کی مدح میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ اسی

اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو قصابی زبان سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس

میں فصاحت و بلاغت نہیں لیکن تقابلی جائزہ سے معاملہ دیگر گوں نظر آتا ہے

وكان من الكافرين

• اور تھا وہ کافروں میں کا۔ (مولانا محمود الحسن)۔

• اور وہ کافر ہو گیا (اعلیٰ حضرت)۔

شربعتکم من بعد موتکم

• پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے (مولانا محمود الحسن)۔

• پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا (اعلیٰ حضرت)۔

وكل انسان طائر في عنقه

• اور جو آدمی ہے لگا دی ہم نے اس کی بڑی قسمت اس کی گردن سے (مولانا محمود الحسن)

• اور ہر انسان کی قسمت اس کی گردن سے لگا دی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

واجتنبوا الطاغوت

• اور بچو ہر ونگے سے (مولانا محمود الحسن)۔

• اور شیطان سے بچو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

مذکورہ بالا چند مثالیں صرف بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ان سے ہر ذی شعور

انسان فصاحت و بلاغت کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس ترجمہ میں فصیح زبان کو

پیش کیا گیا ہے۔ اسی عظیم المرتبت ہستی پر دشنام طرازیوں کا سلسلہ اس انداز پر پیش

کیا جاتا ہے کہ بلاشبہ ان کالیوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کیسی عالم کی تحریر نہیں

بلکہ بدترین جاہل کا کلام ہے۔ کیونکہ اگر ہی علم ہے تو جہالت کسے کہا جاتا ہے؟

اعلیٰ حضرت کو جو گالیوں کی دی گئیں ان کی دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں۔ جو لفظوں

کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جائے کہ کس طرح پست ذہن رکھنے والے ہیں :-

① برصغیر پاک و ہند کے مبتدع اعظم و فتنہ تکفیر کے بانی مولانا احمد رضا خاں

② مذکورہ ترجمہ و تفسیر اسی فرقہ مضالک کے پیشوا مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور

اس کے خلیفہ مفتی نعیم الدین مراد آبادی کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے۔

③ مولانا بریلوی کے ترجمہ قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا انسان

مسلمانوں کا رہنمایا عالم اور اہلبیت کا امام تو کیا، ایمان ہی کے نور سے
خالی ہے۔

اگرچہ ایسی تازیا عبارات ہمارے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ حق تو یہ
تھا کہ اسی طرح کا جواب دیا جاتا لیکن پھر بھی اخلاق و سنجیدگی کا دامن کھامتے
ہوئے فقط اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے محاسن و کمالات تفاسیر کے آئینہ میں پیش
کئے جا رہے ہیں۔ جہاں دیگر ترجمین کی کشتیاں تلاطم امواج میں بھکولے کھاتی نظر
آتی ہیں وہاں محبت رسول کی وسعت علم اور وقت نظر صیے مضبوط و قوی تا خدا کے
سہارے کشتی صحیح و سلامت کنارے پر لنگر انداز نظر آتی ہے۔
ابھی تو تحقیق کے ابتدائی مراحل ہیں جس طرح تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا جائے
گا، اہل علم کی تحقیق و تدقیق سے انشاء اللہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے حسن و
جمال میں اور نکھار آئے گا۔

عبدالرزاق

تقریظ

اتاقہ المتحقیقین اتا فزی المکرم حضرت علامہ ابوالحنات محمد اشرف سیالوی صاحب المدالی
 شیخ الحدیث دارالعلوم ضیاء شمس الاسلام سیال شریف

یا اللہ جل جلالہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مترجم مکرم برادر عم عزیز حضرت مولانا محمد عبد الرزاق صاحب زیدت فواضد
 السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج شریف بہ خیریت موجود و خیریت مطلوب مکتوب
 گرامی ملایا دآوری کا شکریہ جناب نے بہت مستحسن قدم اٹھایا ہے اور جیسے کہ چند
 مقامات کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے آپ نے خوب معتدل انداز اور مہذب پیرائے
 میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی موزونیت اور معنوی عظمت ثابت کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے
 تھا کہ دوسرے حضرات کے متعلقین انصاف اور دیانت سے کام لیتے اور اس ترجمہ
 سے رہنمائی حاصل کرتے ہوتے اپنے بزرگوں کے تراجم درست کر لیتے اور آپ کی ذات
 سراپا کمال کی علمی فوقیت و برتری کا اعتراف کرتے مگر براہ ہوسد اور تعصب کا کہ وہ
 کمال حسن کو بھی نقصان اور قبح بنا دکھاتا ہے اور براہ ہوسد و عناد کا کہ وہ حق کے اعتراف و
 تسلیم کی طرف کبھی بھی مائل نہیں ہونے دیتا۔ بندہ نے متعدد مقامات تراجم کا تعابلی جائزہ
 لیا تو یوں معلوم ہوا کہ ایک طرف ماہر اور تجربہ کار احباب فن کا ترجمہ ہے اور دوسری طرف
 طلباء کا مشقی انداز میں ترجمہ جس میں قواعد و ضوابط اور اصولوں کی طرف ذرا بھرتو توجہ نہیں
 دی گئی بلکہ عظمتِ خداوندی اور عظمتِ رسالت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا تو کی ہیں
 مگر مکملہ غلط فہمیوں کو دور کر دینی معمولی کوشش کو یہی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی جبکہ
 اعلیٰ حضرت نے ہر ایسے مقام پر مفسرین کرام کی تفاسیر کا حاصل اور چوڑے ترجمہ میں پیش
 کر کے حق تعظیم بھی ادا کیا ہے اور عوام اہل اسلام کے ایمان کا تحفظ بھی فرمایا جزا اللہ
 احسن الجزاء اللہ تعالیٰ اس جناب کی اس محنت اور سعی جلیل کو بطغیل حبیب مکرم و جمہ
 مقربان بارگاہ ناز مشرف قبولیت بخشے اور موجب انصاف و دیانت بنائے۔ آمین والسلام

marfat.com محمد اشرف

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْغَفَّارِ وَالصَّلٰوةُ
وَالسَّلَامُ عَلٰی النَّبِیِّ لِشَهِدِ الْمَخْتَارِ وَعَلٰی اَصْحَابِهِ الْاَخْبَارِ وَعَلٰی اٰلِهِ الْاَظْهَارِ
اِمَّا بَعْدُ

فَاعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم پر ثابت رکھے۔ افراط و تفریط سے بچانے مقصد
کسی کی دلازاری نہیں کسی پر کچھ اچھانا کسی کو برا کہنا کسی کو گمراہ کہنا یا کسی کو جاہل
کہنا مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
ترجمہ کتر الایمان کے محاسن و کمالات بیان کرنے مقصود ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی بصیرت
اور علمی نکات پر رسائی اور تفاسیر کی آرام اور راجح اقوال سے باخبری پر مطلع کرنا
مطلوب نظر ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ اعلیٰ حضرت نے جس طرح شان الوہیت اور
مقامات نبوت اور فضائل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس کرتے ہوئے ترجمہ کیا
ہے یہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ بفضلہ تعالیٰ تفاسیر کی عبارات کو ساتھ پیش کیا جا رہا
ہے جن سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت کا عیاں ہونا مشکل نہیں۔ اگر کسی مقام پر
تفاسیر کے مختلف اقوال ہیں جن سے دوسرے تراجم پر بھی دلیل قائم کی جاسکتی ہو تو اس
کی نشان دہی بھی انشا اللہ موجود ہوگی۔ کوشش یہی ہے کہ عبارت آسان ہو تاکہ
اس کا سمجھنا صرف اہل علم پر موقوف نہ رہے بلکہ عام آدمی بھی اس سے فائدہ حاصل
کر سکے۔ امید ہے کہ انشا اللہ اس کو پڑھ کر انصاف کیا جائے گا اور ایک عظیم
ترین شخصیت اور تحقیق و تدقیق میں ایک خاص مقام رکھنے والے بزرگ کی شان میں
کچھ اچھانا بند کر دیا جائے گا۔ اگر تحقیقی طور پر کوئی اختلاف پیش کرے تو یہ اس کو

حق حاصل ہے لیکن بدزبانی اور طعن و تشنیع پر مبنی کلام اہل دانش کو زیب نہیں دیتی۔
اب قرآن پاک سے چند مقامات پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اعلیٰ حضرت کے
ترجمہ کی برتری روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ترتیب وار پہلے پارہ سے سلسلہ کلام
کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کہنے اور اس پر ثابت رہنے کی
توفیق عطا فرمائے اور میرے بچوں کو بھی اللہ تعالیٰ حق مسلک پر قائم و دائم رکھے!
وما توفیقی الا باللہ العظیم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

• شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے (مولانا محمود الحسن)۔

• شروع سامعہ نام اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والے مہربان کے۔ (شاہ رفیع الدین)

• شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام (عبدالمجید)

• شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔

(مولانا اشرف علی)۔

• شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (شاہ عبدالقادر)

• شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (فتح محمد)

• اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

عربی قواعد کے مطابق

تراجم میں فرق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی | بسم اللہ الرحمن الرحیم طرف مستقر ہے

جس کا تعلق کسی اسم یا فعل سے کیا جاتا ہے جس کو اپنی طرف سے اعتبار کرنا پڑتا ہے۔
اگرچہ کئی احتمال ہیں اسم ہو یا فعل، خاص ہو یا عام، اول ہو یا آخر۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت

کے ترجمہ میں لفظ اللہ پہلے ہے اور شروع بعد میں لیکن دیگر تراجم میں شروع پہلے اور لفظ اللہ بعد میں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتا چلتا ہے کہ اس کا تعلق بعد سے ہے۔ اسی ترجمہ کی تائید مدارک سے ملتی ہے جو اس طرح ہے :-

تعلق البار بمحذوف تقدیرہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرا اوائلو
یہاں میں پڑھتا ہوں یا تلاوت کرتا ہوں بعد میں ہے۔ خود ہی مفسر اس کی وجہ بھی
بتاتے ہیں : وانما قدر المحذوف متأخر الان الاعمین الفعل والمتعلق به هو
المتعلق به وكانوا يبدون باسماء الالهتهم فيقولون باسم اللات واسم العزى
فوجب ان يقصد الموحّد معنی ختصاص اسم اللہ عن وجہ بالابتداء و
ذابتقدیمہ وتلخیر الفعل وانما قدم الفعل في اقرا باسم ربك
لانها اول سورة نزلت في قول وكان الامم بالقاهرة اهـ وكان
تقدیر الفعل اوقع : یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ فعل کے مؤخر ہونے
کی وجہ یہ ہے کہ جس کا تعلق ہے فعل سے وہ بہ نسبت فعل کے زیادہ مقصود ہے کیونکہ
کافر اپنے کاموں کی ابتدا میں اپنے معبودانِ باطلہ کے نام لیا کرتے تھے "بسم اللات"
اور "بسم العزى" کہتے تھے۔ اس لیے مومن کے لائق بھی یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے
اہم گرامی کو اول میں لائے۔ یہی اسی وقت ہوتا ہے جب کہ فعل مؤخر ہو اور اللہ کا اہم گرامی
مقدم۔ اب واضح ہوا کہ اسی نقطہ کے پیش نظر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں لفظ اللہ کو پہلے
لایا اور شروع بعد میں جس کا دیگر حضرات خیال نہ کر سکے۔

پھر ایک سوال ہوتا ہے کہ اقرا یا اسم ربك میں فعل پہلے کیوں ہے اور
لفظ رب بعد میں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ سورۃ نزول میں اول ہے، اس
لیے کہ یہاں فعل قرأت اہم ہے لہذا اس کا پہلے ذکر کرنا ہی مناسب ہے۔ اسی وجہ
سے وہاں ترجمہ کرتے وقت پڑھ پہلے آئے گا اور رب بعد میں۔ اسی طرح مختصر معانی

میں بھی ہے: ولہذا رای التقدیم یفید الاختصاص والاهتمام بقدر المحذوف
 فی بسم اللہ مؤخر ای بسم اللہ افضل کذا یفید مع الاختصاص والاهتمام
 لان المشرکین كانوا یبدون باسم الہتہم فیقولون باسم اللات وباسم العزہی
 فقصد الموحّد تخصیص اسم اللہ بالابتداء للاهتمام والسرور علیہم۔

مطلب یہ ہے کہ جب تقدیم ظرف تخصیص و اہتمام پر دل ہے۔ اسی وجہ سے
 بسم اللہ میں محذوف مؤخر مانا جاتا ہے یعنی بسم اللہ افضل کذا کہا جاتا ہے تاکہ
 اختصاص و اہتمام کا فائدہ دے کیونکہ مشرکین اپنے معبودوں کے ناموں سے
 اپنے کاموں کی ابتدا کرتے تھے۔ کہتے تھے لات و عزیٰ کے نام سے ہماری ابتدا
 ہے۔ مومن اللہ کے نام سے ابتدا کرتا ہے۔ کہتا ہے، اللہ ہی کے نام سے شروع
 اس میں تخصیص بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ کے نام کو پہلے لانے میں اہتمام شان
 بھی اور کفار کا رد بھی۔ یہ مقصد اسی ترجمہ سے حاصل ہوتا ہے کہ کہا جائے اللہ
 کے نام سے شروع؛

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

- سب تعریفین اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔ (مولانا محمود الحسن)
- سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے۔ (فتح محمد)
- سب تعریف واسطے اللہ تعالیٰ کے جو پروردگار عالموں کا۔ (شارح الدین)
- سب خوبیاں اللہ کو جو مالک ہے سارے جہان والوں کا۔ (اعلیٰ حضرت)
- یہاں اعلیٰ حضرت نے رب کا معنی مالک کیا ہے اور دیگر حضرات نے پالنے والا
 معنی کیا ہے۔ اگرچہ رب یعنی مرقی یعنی پرورش کرنے والا بھی استعمال ہوتا ہے
 لیکن یہ خاص ہے، فقط پرورش کرنے ہی میں مستعمل ہے لیکن مالک عام ہے جو

اس کے ہر قسم کے تصرف کو شامل ہے۔ اسی ترجمہ کی تائید میں جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: سب العلمین ای مالک جمیع الخلق من الانس والجن و المملکة والدواب وہ تمام مخلوق کا مالک ہے۔ انسانوں، جنوں، فرشتوں، جانوروں وغیرہ کا۔ ناظرین کرام سے انصاف کی توقع ہے کہ کون سا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے! ان کے لیے سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

• بتلا ہم کو سیدھی راہ۔ (مولانا محمد رحمن)۔ بتلائیے ہم کو رستہ سیدھا۔ (مولانا اثر علی)

• ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ (مولانا مودودی)۔ دکھا ہم کو راہ سیدھی (شاہ فیح الدین)

• ہم کو سیدھا راستہ چلا۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے کہ ہم کو سیدھا راستہ چلا اور دیگر ترجمین نے ترجمہ کیا ہے "سیدھی راہ بتلا"۔ راہ بتلا یا دکھا، یہ دعا کافی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب نے کفار کو بھی سیدھی راہ بتلائی ہے ہدی للناس سے یہ واضح ہے۔ بلکہ کامل دعا یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں سیدھی راہ چلا یعنی اس پر ثابث و قائم رکھ تفسیر کمالین نے اس مقام پر لکھا ہے: والمستقیم المستوی والمراد به طریق الحق و منة الاسلام و اتباع القرآن یعنی مستقیم کا معنی سیدھا ہے اور مراد اس سے راہِ حق ہے اور اسی کے عین میں دین اسلام اور اتباع قرآن ہے۔ اس کے تحریر کرتے ہیں: فان قيل طلب الهداية من العوقن وهو الهدى تحصيل الحاصل قلنا المراد طلب الثبات عليه و حصول المراتب المرتبة عليه و الزيادة على الهدى الذي اعطوه یعنی اگر کوئی سوال کرے کہ یہاں مومن جو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہے یعنی راہ دکھلایا جا چکا ہے وہ پھر کیسے ہدایت کو طلب کر رہا ہے۔ یہ تو

حاصل شدہ چیز کا پھر سوال ہے ۔

اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہاں مراد اس ہدایت پر ثابت رہنا ہے اور جو مراتب اس پر مرتب ہیں ان کے حصول کی دعا ہے اور جو ہدایت اسے حاصل ہے اس سے اور زیادتی کا سوال ہے ۔ یہ صورت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ترجمہ ایسا کیا جائے جیسا اعلیٰ حضرت نے کیا ہے کہ اللہ! ہم کو سیدھی راہ چلا یعنی ثابت رکھ تاکہ اور مدارج حاصل ہوں ۔ صرف راہ دکھلانا یا بتلانا یہ کافی نہیں ۔ یہ تو کفار کے لیے بھی ثابت ہے ۔

الَّذِي ذَلَّلَ الْكِتَابَ لَا سَبِيحَ فِيهِ

- یہ کتاب کہ کوئی شبہ اس میں نہیں ۔ (عبدالماجد)
 - اس کتاب میں کچھ شک نہیں ۔ (مولانا محمود الحسن)
 - یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ۔ (مولانا اشرف علی)
 - اس کتاب میں کچھ شک نہیں ۔ (شاہ عبدالقادر)
 - یہ اللہ کی کتاب ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں ۔ (مولانا مودودی)
 - یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں ۔ (فتح محمد)
 - یہ کتاب ہے کہ نہیں شک یچ اس کے ۔ (شاہ رفیع الدین)
 - وہ بلند مرتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں ۔ (اعلیٰ حضرت)
- اس مقام پر اشارہ بعید کا (ذالک) لگایا گیا ہے نہ کہ قریب کا یعنی ہذا نہیں لایا ۔ حالانکہ بظاہر ہذا ہی لانا چاہیے تھا جس کا معنی ہوتا "اس" لیکن مقام قریب میں جب اشارہ بعید کا لایا جائے وہ بلندی مرتبہ عظمت شان پر دال ہوتا ہے ۔ اس ضابطہ پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی صحیح صادق آتا ہے دیگر تراجم اس پر صادق نہیں آرہے کیونکہ

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ واضح ہے ”وہ بلند کتاب“ بلند رتبہ کتاب یہ اشارہ بعید سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس پر تفسیر صاوی کی عبارت ملاحظہ ہو: ای هذا الم اشار بذلك الى ان حق الاشارة ان يوفق بها للقريب وانما اتى بما يدل على البعيد للتعظيم لسكون القرآن موضوع الارتفاع وعظيم القدس یعنی صاحب جلالین نے ہذا کا لفظ ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ یہاں حق یہ تھا کہ اشارہ قریب ہوتا لیکن اشارہ بعید لایا تعظیم کے لیے اس لیے کہ قرآن پاک رفیع القدر ہے اور عظیم القدر ہے۔ یہ معنی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے۔ اس ضابطہ کو مختصر معانی میں بھی پیش کیا گیا ہے اور تعظیم بالبعد نحو المذالك الكتب تنزيلا بعد درجته و رفعة محلہ منزلة بعد المسافة یعنی مسند الیہ کو معرفۃ اشارہ بعید کے ساتھ لانے کا یہ فائدہ ہے۔ وہ بلندی رتبہ اور رفعت مقام پر الیہ ہی دال ہے جس طرح مسافت بعیدہ پر دال ہے۔ لاریب فیہ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے: کوئی شک کی جگہ نہیں۔ لیکن باقی تراجم، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ دیگر تراجم سے یہ واضح نہیں کہ اس میں شک نہیں ہوتا چاہے یا اس میں کسی نے شک کیا ہی نہیں بیضاوی کی تفسیر دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہو جائے گی بیضاوی کی عبارت یہ ہے:۔ لاریب فیہ: معناه انه لو صوجه وسطوع برهانه بحيث لا يرتاب العاقل بعد النظر الصحيح بكونه وحيا بالغاحد الاعجاز لان احدا الا يرتاب فيه الا ترى الى قوله تعالى وان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا الآية یعنی قرآن پاک کے واضح ہونے کی وجہ سے اور روشن دلائل کے ہوتے ہوئے بعد از نظر صحیح عاقل اس کے وحی اور حدیجاً تک پہنچنے میں شک نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شک نہیں کرتا یا کسی نے کیا بھی نہیں حالانکہ قرآن پاک میں

لوگوں نے شک کیا ہے جس پر و ان كنتم في سريب مما نزلنا على عبدنا الآية
 شاہد ہے علامہ بیضاوی کی اس عبارت کی وضاحت میں شیخ زادہ کی عبارت یہ
 ہے: جواب عما يقال كيف يصح نفي جنس الریب عنه مع كثرة
 المرتابین وكثرة المرتاب تسلمت كثرة الریب یعنی علامہ بیضاوی نے سوال کا
 جواب دیا ہے کہ یہاں لافنی جنس تو جنس ریب کی نفی کر رہا ہے جو صحیح نہیں کیونکہ
 مرتابین (شک کرنے والے) تو کثیر ہیں اور کثرت مرتابین کثرت ریب کو مستلزم ہے۔
 یعنی زیادہ شک کرنے والوں کا ہونا شک کے زیادہ ہونے کو مستلزم ہے۔ علامہ
 بیضاوی کا جواب اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے
 کہ آپ نے اسی سوال و جواب کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ترجمہ کیا ہے، کوئی شک کی
 جگہ نہیں۔ اس ترجمہ پر بعینہ شیخ زادہ کی عبارت دال ہے۔ شیخ زادہ میں ہے:

فظهر ان معنى نفي الریب عنه نفي كونه محلا لمظنة لثبوت لا ان
 احدا لا يرد تاب فيه پس ظاہر ہوا کہ معنی یہ ہے کہ قرآن پاک
 شک کا محل (جگہ) نہیں۔ یہ معنی نہیں کہ کسی نے اس میں شک کیا بھی نہیں۔ اب
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت محتاج بیان نہیں۔

يُخِذِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا (۱)

• چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں۔ (مولانا
 اشرف علی)۔

• فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو کہ ایمان لائے (شاہ رفیع الدین)

• دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے۔ (مولانا محمود الحسن)

• دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے۔ (شاہ عبد القادر)

• وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں (مولانا مودودی)
• فریب دیا جاتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو (علیٰ حضرت)

اس مقام پر علیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ بتا چلتا ہے کہ وہ منافقین ظاہراً ایمان لاکر اور باطناً کافرہ کمر اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو اپنے خیال میں دھوکا دینا چاہتے ہیں یعنی حقیقتاً وہ دھوکا نہیں دے سکتے لیکن باقی تراجم سے بتا چلتا ہے کہ وہ اللہ سے دغا بازی کرتے ہیں یا چال بازی کرتے ہیں۔ اس طرح کے ترجمہ سے یہی بتا چلتا ہے کہ وہ فی الواقع اس دغا بازی میں کامیاب ہیں حالانکہ یہ درست نہیں۔

تفسیر کے مطابق علیٰ حضرت کا ترجمہ ہی درست ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: وہی انہم کیف خادعوا اللہ تعالیٰ فلما قلن ان يقول ان محادعة اللہ تعالیٰ ممنوعة من وجہین الاول انہ تعالیٰ يعلم الصائر والسراير فلا يجوز ان يخادع لان الذی فعلوه لو اظہروا ان الباطن بخلاف الظاهر لم یکن ذلك خداعاً فاذا کان اللہ تعالیٰ لا یخفی علیہ البواطن لم یصح ان یخادع والتانی ان اللہ تعالیٰ یعلم ما یعتقدوا ان اللہ بعث الرسول لیم فلم یکن قصدہم فی نفاقہم محادعة اللہ تعالیٰ فثبت انہ لا یسکن اجر ہذا اللفظ علی ظاہرہ بل لا بد من التاویل۔

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا تو ممکن ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتیں اور چھپی ہوئی کو جانتا ہے جب کہ منافق باطن کو ظاہر سے پوشیدہ رکھ کر کیسے اللہ تعالیٰ سے دغا کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے باطن کو چھپانا ممکن نہیں تو دغا کیسے ممکن ہے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ منافقوں کا یہ عقیدہ ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرف مبعوث فرمایا لہذا ان کا اپنے نفاق میں اللہ تعالیٰ سے دغا بازی کرنے کا اعتقاد ہی نہیں تھا پس ثابت ہوا کہ اس لفظ کو ظاہر پر رکھنا ممکن نہیں بلکہ اس کی تاویل ضروری ہے اس

کے جواب میں دو تاویلیں پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے تراجم کے مطابق کوئی تاویل بھی نہیں البتہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ایک تاویل کے مطابق کرنا ہی صحیح بھی ہے اور شان الوہیت کے مطابق ہے۔ وہ تاویل یہ ہے: **الثانی ان یقال صورة لهم مع الله حيث یظهرون الایمان واهم کافرون صورة من یخادع** وہ اپنے ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور حقیقت میں وہ کافر ہیں۔ لہذا ان کا معاملہ اللہ سے ایسا ہے جس طرح دعا بازی کرنے والے کا ہوتا ہے یعنی وہ اپنے خیال میں دعا بازی کرتا چلتے ہیں یہ نہیں کہ دعا بازی کرتے ہیں کیونکہ رب تعالیٰ سے دعا بازی ممکن ہی نہیں۔

اسی طرح اوسعود میں ہے: **ان الخدعة والحيلة والمکر واطهار خلاف الباطن فہی بمنزلة النفاق وھی مستحیلة فی حق اللہ تعالیٰ وصیغة المفاعلة تقتضی المشاركة فاشار الی جوابہ بما ذکرہ واصلہ انہا ظہرنا لیست علی بابہا وقولہ و ذکر اللہ جواب سوال اخر تقدیرہ کیف یخادع اللہ ای یحتال علیہ وھو یحلم الضمان فکیف قبل یخادعون اللہ فاجاب عندہ بما ذکرہ واصلہ ان الایة من قبیل الاستعارة التمثیلیة حیث شبہ حالہم فی معاملتہم اللہ بحال المخادع من صاحبہ من حیث القبح یہاں دو قسم کے سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ خادعون متخادعت سے کیا گیا ہے۔ یہ باب مفاعله سے ہے۔ وہ شرکتِ جانہین کو چاہتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی مکر، حیلہ، دعا بازی کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ لائق نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں متخادعت شرکت کے لیے استعمال نہیں بلکہ ایک ہی جانب سے استعمال ہے۔ پھر سوال ہوا کہ یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا بازی کرتے ہیں کیونکہ دعا باز تو اپنی چالبازیوں**

کو دوسرے سے مخفی رکھنا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اسرار اور مخفی اشیاء پر مطلع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں استعارہ تمثیلیہ ہے جس طرح دعا یا زبانی کا ترکیب ہوتا ہے اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ سے اپنے خیال سے اپنے معاملہ میں زبانی کے ترکیب ہو رہے ہیں۔ اب بات واضح ہے کہ دعا یا زبانی حقیقت میں نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خیال میں کرنا چاہتے تھے۔ لہذا اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں خوبی کا واضح ہونا مخفی نہ نہ رہا بلکہ روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِرِمِّهِمْ وَيُدْهِمُهُمْ فِي طَغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (پ ۶)

• اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔ (مولانا محمود الحسن)

• اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے۔ (شاہ عبدالقادر)

• اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے وہ ان کی رستی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے جاتے ہیں۔ (مولانا مودودی)

• ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے۔ (فتح محمد)

• اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بیچ سرکشی ان کی بہکتے ہیں۔

(شاہ رفیع الدین) • انھیں اللہ تیار رہا ہے۔ (عبدالماجد)

• اللہ ان سے استہزاء فرماتا (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اور انھیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے کہ اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔ یہی معنی مناسب ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ

ہنسی، مذاق، ٹھٹھا نہیں کرتا۔ ان الفاظ کو اس کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ اس پر مدار کی عبارت ملاحظہ ہو :

اللہ یستہزیئ بہم ای یجازیرہم علی استہزائہم فہی جزاء
 الاستہزاء باسمہ کقولہ تعالیٰ وجزاء سبیۃ سبیۃ مثلہا فن اعتدی
 علیکم فاعتدوا علیہ فی جزاء السبیۃ سبیۃ وجزاء الاعتداء اعتداء وان یکن الجزاء سبیۃ
 واعتداء وهذا لان الاستہزاء علی اللہ تعالیٰ لا یجوز من حیث الحقیقۃ لانه من باب المعبت وھو علی عند
 اللہ تعالیٰ کے استہزار کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان کو جزائے استہزار دیتا ہے
 جس طرح اللہ تعالیٰ نے یرائی کے بدلے کو یرائی سے اور حد سے تجاوز کے بدلے کو
 تجاوز سے تعبیر فرمایا حالانکہ فی الواقع وہ جزا یرری یا تجاوز نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی
 استہزار کے بدلے کو استہزار سے تعبیر فرمایا گیا۔ (گویا یہی اس کی شان کے لائق ہے)
 کیونکہ حقیقتاً ہنسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز نہیں کیونکہ ہنسی مذاق یہ ایک بے
 فائدہ کھیل ہے۔ اللہ تعالیٰ عبث، بے فائدہ کام کرنے سے ملتو بالا ہے۔ اسی طرح
 ویمدہم کا ترجمہ اعلیٰ حضرت کا یہ ہے ان کو مہلت دیتا ہے۔ یہ تفاسیر کے مطابق ہے جلالین
 مدارک میں ویدہم کا معنی یہ مدہم کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ان کو مہلت دیتا
 ہے۔ ایسے ہی یعدون کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کا ہی تفاسیر کے مطابق ہے۔ کیونکہ
 اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے 'بھٹکتے رہیں'، چونکہ تفاسیر میں یتزوج دون تھیوا ترجمہ
 کیا گیا ہے جس کا اردو میں مطلب 'بھٹکتے رہیں' زیادہ مناسب ہے۔ عبدالمجاہد کا ترجمہ
 لذت اور مراد دونوں کے مخالف استہزیی کا ترجمہ بنا رہا ہے، غلط ہے۔

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (پ ۱۰)

اور نہ ہونے وہ راہ پانے والے۔ (مولانا محمود الحسن)

marfat.com

Marfat.com

اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔ (مولانا اشرف علی) اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ (مولانا مودودی) اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔ (فتح محمد) اور نہ راہ پائے (شاہ عبدالقادر) اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔ (اعلیٰ حضرت) اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔ (شاہ رفیع الدین) اور نہ وہ راہ یاب ہوئے۔ (عبدالماجد)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے اُنیٹہ میں دیکھیں بفضلہ تعالیٰ صاف و شفاف نظر آئے گا۔ مدارک میں ہے: وما كانوا مهتدين لطريق التجارة وہ طریقہ تجارت کی راہ نہیں جانتے تھے؛ جلالین میں ہے: وما كانوا مهتدين فيما فعلوا اس پر حاشیہ میں ہے فما فعلوا ای طریق التجارة مقصد اس کا بھی یہ ہی ہے کہ وہ طریقہ تجارت کو نہیں جانتے تھے بفضاوی شریف میں ہے:

وما كانوا مهتدين لطرق التجارة فان المقصود منها سلامة من اضرار العمل والربح وهو لا يعد اضرارا للطلبين لان رأس مالهم كان الفطرة السليمة والعقل الصرف فلما اعتقدوا هذه الضلالات بطل استعدادهم واختل عقلم ولم يبق لهم رأس مال يتوسلون به الى درب الحق ونيل الكمال فبقوا خاسرين آيسين من الربح فاخذين للوصل -

یعنی وہ تجارت (سودے) کی راہ نہیں جانتے تھے کیونکہ تجارت میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ رہے اور نفع بھی حاصل ہو اور ان لوگوں نے دونوں کو ضائع کر دیا کیونکہ اصل ان کا سرمایہ فطرتِ سلیمہ اور عقلِ خاص تھا لیکن اعتقادِ باطل کی وجہ سے ان کی استعدادِ باطل ہو گئی، عقلوں میں فتور آ گیا اور ان کا اصل سرمایہ جو حق کو پانے اور حصولِ کمالات کا ذریعہ تھا وہ ضائع ہو گیا پس اس طرح وہ اصل مال کے ضائع کرنے کی وجہ سے خسارے میں ہوئے اور نفع سے محروم ہوئے۔

تفسیر بیضاوی کی وضاحت سے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید حاصل ہوئی۔
 اسی طرح بیضاوی پر شیخ زادہ میں یہ ہے: فظہران من اشتري الضلالتہ بالہدی
 كما یلذ بہ ان یکون خاسرا فی تجاسرہ یعنی جو شخص ہدایت کے
 بدلے گمراہی کو حاصل کرتا ہے وہ اپنی تجارت میں خسارے میں رہتا ہے: وما کانوا
 ھمتدین پر شیخ زادہ نے یہ تحریر کیا کہ ان العراج بعد ما لا ھتدوا عدم
 اھتدائہم بطریق القیادۃ ان کے ہدایت نہ پانے سے مراد یہ ہے کہ وہ سودے کی راہ
 نہیں جانتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی واضح ہو گئی اور کما معتبر تفسیر کے بحثوں
 کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ يَا

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور جب کہا پروردگار تیرے نے واسطے فرشتوں کے (شاہ رفیع الدین)۔

جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (مولانا اشرف علی)

اور (یاد کر) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں برکیٹ میں 'یاد کر' لفظ زائد ہے جو دیگر تراجم میں

نہیں، اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے جس کی طرف دیگر مترجمین نظر نہ کر سکے

تفسیر جلالین میں ہے واذکر یا محمد اذ قال رب انزل علیہ وسلم۔

اس پر محشی لکھتے ہیں: اشارہ الی ان الذی فی محل النصب وان العامل فیہا اذکر

مقدس قال ابوالبقاء فی تفسیر اذ قال هو مفعول بہ تقدیرہ اذکر اذ قال

یعنی یہاں اشارہ ہے کہ اذ محل نصب میں ہے اور اس کا عامل اذکر مقدر

ہے۔ ابو الیقار نے اذ قال کی تفسیر میں کہا ہے کہ اذ قال مفعول بہ ہے اور تقدیر عبارت کی یہ ہے اذکر اذ قال اس کا لحاظ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے یاد کر کے لفظ کو بریکٹ میں بڑھایا ہے۔ اسی طرح مدارک میں ہے اذ نصب باضمار اذکر یعنی اذ، اذکر کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ الَّذِينَ لَا يَظُنُّونَ بِ

مگر انھی پر جن کے دل پگھلے ہیں۔ جن کو خیال ہے۔ (شاہ عبدالقادر)
مگر ان فرماں بردار بندوں کے لیے مشکل نہیں جو سمجھتے ہیں۔ (مولانا مودودی)
مگر انہی عاجزوں پر جن کو خیال ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال کرتے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)
مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں) تجھیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں پروردگار سے ملنا (بھی) ہے۔ (عبدالماجد)۔

مگر ان پر جو دل سے میری طرف ٹھکتے ہیں تجھیں یقین ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔
اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے یظنون کا معنی یقین کیا ہے اور دیگر حضرات نے خیال اور سمجھنا لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے مفسرین کرام نے بھی معنی یقین کے لیا ہے۔ مدارک میں ذکر کیا گیا ہے: وَخَسِرَ يَظُنُونَ بِلِقَائِهِمْ
لِقَاءَ رَبِّهِمْ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَمْ يُرِيدُونَ كِبَارًا يَتَّقُونَ فَإِنَّ اللَّهَ يَخْتَصِمُ لِمَنْ يَشَاءُ فِي الْحُكْمِ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ
علی حسب ذلك واما من لم يوقن بالجزاء ولم يرحم الثواب كانت عليه
مشقة خالصه - چونکہ یہاں مقصد بیان یہ ہے کہ نماز لوگوں
پر مشقت ہے۔ وہ اسے گواہ سمجھتے ہیں لیکن جن لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اپنے رب
سے ملاقات کرنے والے ہیں ان پر گواہ نہیں۔ علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

یظنون کی تفسیر متیقنوں سے کی گئی ہے اس لیے کہ حضرت عبداللہ کی قرأت میں علو لفظ آیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ یقین کرتے ہیں کہ بے شک ضرور اللہ سے ملاقات ہوتی ہے اور ضرور جزا حاصل ہوتی ہے اور جس کو یہ یقین ہو اس کو یہ یقین کافی ہے وہ نماز کو گراں نہیں جانے گا لیکن جس کو یقین نہیں ہوگا جزا کا اس کو ثواب کی امید نہیں ہوگی۔ اس پر نماز خاص مشقت ہوگی۔

اسی طرح شیخ زادہ علی البیضاوی میں بیان کیا گیا ہے:- بیان لوجہ استعمال الظن بمعنی الیقین مع ان الظن هو الاعتقاد الراجع الذی یحتمل النقص والیقین هو الاعتقاد الراجع الذی لا یحتمل النقص فانہما الماشابہا من حیث ان کل واحد منها اعتقاد راجع مع ان یستعار کل واحد منها للاخر بحسب اقتضاء المقام فاستعیر لفظ الظن ہرنا بمعنی الیقین

یہاں یہ وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے اس لیے کہ ظن کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقص کا احتمال رکھے یقین کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقص کا احتمال نہ رکھے۔ اس لیے دونوں میں اعتقاد راجح پایا گیا ہے لہذا یہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ہر دو کو ایک دوسرے کی جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ اسی طرح جلالین میں بھی یظنون کی تفسیر یوقنون سے کی گئی ہے اور پھر اس پر حاشیہ میں یہ ہے: اشارة الى ان الظن ہرنا بمعنی الیقین یعنی یہاں یہ اشارہ ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے۔ اب تفاسیر کی عبارات دیکھنے سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت بخفی نہ رہی بلکہ خوبی واضح ہو گئی۔

اسی طرح فاشعین کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے "جو دل سے میری طرف ٹھکتے ہیں" یہ زیادہ واضح اور مناسب ہے بہ نسبت عاجز اور دل سے پگھلے کے۔

عاجز اور زبان میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ عزیز، محتاج، بے دست و پا۔ کسی کام کو کرنے کی طاقت نہ رکھنا۔ ان تمام معانی پر لفظ عاجز کا اطلاق ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح دل سے پگھلنا غیر معروف ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ معروف ہے اور اس میں کسی اور معنی کا وہم نہیں اور تفسیر کے مطابق بھی۔ جلالین میں ہے: الساکنین الی الطاعة اور جہل میں ہے الساکنین ای ماثلین اور معالم التنزیل میں ہے: فالخاشع ساکن الی طاعة الله ان تفسیر کی عبادات کا مشترکہ مفہوم یہی ہے کہ جو اللہ کی اطاعت کی طرف ٹھکتے ہیں یعنی دل سے میری طرف ٹھکتے ہیں۔

اَسْكُنْ بِ ع

رہا کرو۔ (مولانا محمود الحسن)۔ رہا کرو (شاہ عبدالقادر)۔ رہا کرو (مولانا اشرف علی)۔ رہو۔ (اعلیٰ حضرت)

وَاتَّقِ الزَّكَاةَ بِ ع

دیا کرو زکوٰۃ۔ (مولانا محمود الحسن)۔ دیا کرو زکوٰۃ۔ (شاہ عبدالقادر) اور زکوٰۃ دیا کرو۔ (فتح محمد) اور زکوٰۃ دیا کرو۔ (عبدالماجد) اور زکوٰۃ دو (اعلیٰ حضرت)۔

رہا کرو اور دیا کرو زکوٰۃ اردو محاورہ میں ایک کام کو جاری رکھنا اور اس میں تکرار کا ہونا سمجھ میں آتا ہے حالانکہ اصول فقہ میں ایک ضابطہ پیش کیا جاتا ہے کہ امر تکرار کو نہیں چاہتا بلکہ عبادات تکرار اسباب سے متکرر ہوتی ہے لیکن یہاں تو امر کا ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جو تکرار پر دال ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں تکرار نہیں۔

حاشی میں ہے: ولا موجب نہ فی التکرار ولا یحتملہ۔ کہ امر میں تکرار ہوتا ہے اور نہ تکرار کا احتمال جب امر میں تکرار کا احتمال تک نہیں تو ایسا ترجمہ جس میں صراحتہً تکرار سمجھ رہا ہو، کیسے صحیح ہوگا؟ حاشی کی اسی عبارت پر نامی میں یہ ہے فاذا قبل صل کان معناه افعل فعل الصلوٰۃ لا یقتضی ذلک التکرار ولا یحتملہ یعنی اگر کسی کو کہا جائے صَلِّ تو اس کا معنی ہوگا افعل فعل الصلوٰۃ مرة تو ایک دفعہ نماز ادا کر کیونکہ امر نہ تکرار کا مقتضی ہے اور نہ ہی اس کا احتمال رکھتا ہے۔ البتہ تکرارِ صلوٰۃ تکرارِ اسباب کی وجہ سے ہے یعنی جب بھی نماز کا وقت آئے گا، نماز لازم ہوگی۔ تو وقت کے بار بار آنے کی وجہ سے بار بار نماز لازم ہوگی، امر کے تکرار کی وجہ سے نہیں۔ یہاں بھی اسی ضابطہ کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اتوالزکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ زکوٰۃ دینا ثابت ہے اس امر سے البتہ ہر سال زکوٰۃ اس لیے لازم ہوگی کہ اس کے پاس اتنی مقدار میں مال ہے جس پر زکوٰۃ لازم آتی ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے۔ تو یہ زکوٰۃ کا تکرار سبب کے تکرار کی وجہ سے ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی اعتراض سے محفوظ ہے کہ امر تکرار کو نہیں چاہتا تو ایسا ترجمہ کیوں کیا ہے جس سے تکرار سمجھ میں آ رہا ہے۔ آپ کا ترجمہ تکرار کا معنی نہیں دے رہا۔

وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝۴

اور اس کو کہ میں نے تم کو پڑائی دی تمام عالم پر۔ (مولانا محمود الحسن)
 تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی تھی۔ (مولانا مودودی)
 اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ (فتح محمد)
 اور وہ جو میں نے تم کو پڑا کیا جہان کے لوگوں سے۔ (شاہ عیاد قادری)

اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر عالموں کے۔ (شاہ رفیع الدین)

کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی۔ (مولانا اشرف علی)

اور یہ کہ اس سارے زمانہ میں تمہیں بڑائی دی۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں بتی اسرائیل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ انہیں رب تعالیٰ نے اپنے انعامات یاد دلائے اور فرمایا: **وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ** اب اگر ترجمہ یہ کیا جائے، تم کو بڑائی دی تمام عالم پر۔ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ بتی اسرائیل کو فضیلت صرف اپنے زمانہ میں دوسروں پر تھی کہ ہر زمانہ میں انہیں دوسروں پر فضیلت دی گئی۔ بلکہ اس طرح کے ترجمہ کو دیکھ کر قوی دہم ہوتا ہے کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ ان کو فضیلت صرف ان کے زمانہ میں دوسروں پر حاصل رہی نہ کہ بعد میں آنے والوں پر بھی۔ اس پر تائید جلالین میں دیکھیں۔ **عالمین کی تفسیر اسی عالمی زمانہم سے کی گئی ہے کہ انہیں زمانہ میں اوروں پر فضیلت دی گئی تھی۔ اور اس کی زیادہ وضاحت کمالین میں ہے جو اس طرح ہے: یعنی ليس المراد بالعالم جميع ما سوى الله ليلزم تفضيلهم على هذا الامّة امة محمد صلى الله عليه وسلم بل المراد بالعالم كل موجود سواه في ذلك الوقت۔**

یعنی عالم سے مراد اللہ تعالیٰ کے بغیر جمع اشیاء نہیں تاکہ ان کی فضیلت نبی کریم کی امت پر لازم نہ آئے بلکہ عالم سے مراد اس وقت ان کے بغیر جو بھی تھے ان پر انہیں فضیلت دی گئی۔ ان تفسیر کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری کا انکار کیسے کیا جائے؟

اسی طرح ۲۵ **ع** **وَفَضَّلْنَاكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ** کے ترجمہ میں بھی مترجمین سے لغزش نہ ہوئی۔

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (پ ۶)

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش۔ (مولانا محمود الحسن)

نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی۔ (مولانا کورڈووی)

اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے۔ (فتح محمد)

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش۔ (شاہ عبدالقادر)

اور نہ قبول کی جائے اس سے سفارش۔ (شاہ رفیع الدین)

اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے۔ (مولانا اشرف علی)

اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی۔ (عبدالماجد)

اور نہ کافر کے لیے کوئی سفارش مانی جائے۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ کافروں کے لیے کسی کی

سفارش قبول نہیں لیکن دیگر تراجم سے یہ سمجھ آتا ہے کہ کسی کی سفارش کسی کے لیے

نہیں ہوگی حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ ایمان والوں کے لیے انبیاء، شہداء، صلحاء،

سفارش فرمائیں گے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید مدارک سے اس طرح ملتی ہے:

لَا تُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ لِلْكَافِرِينَ وَقِيلَ كَانَتِ الْيَهُودُ تَتَّقِيهِمْ ان اباؤهم

الانبياء يشفعون لهم فاوليسوا وهو كقولہ فاستنفعهم شفاعتہ

الشافعين تثبت المعتزلة بالادية في نفى الشفاعت للعصاة مرد

لان المعنى شفاعت الكفاس وقد قال عليه السلام شفاعتي لاهل الكبتون ^{بمعنى}

یعنی کافروں کے لیے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔

تفسیر کبیر میں اسی آیت کریمہ کے ماتحت بہت بسیط بحث کی گئی ہے۔ معتزلہ

منکرین شفاعت کے دلائل اور ان کا رد پیش کیا گیا ہے۔ تمام بحث کا ذکر کرنا تو اس مختصر

میں ممکن نہیں البتہ مختصر طور پر ذکر کی جا رہی ہے۔

اجمعت الامم علی ان لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم شفاعتہ فی الاخرۃ و حمل
 علی ذلک قولہ تعالیٰ عسی ان یبعتک ربک بما عملت و قولہ تعالیٰ
 ولسوف یعطیک ربک فترضی ثم اختلفوا بعد هذا فی ان شفاعتہ
 علیہ السلام لمن ترون للمؤمنین المستحقین للثواب ام تکون
 لاهل الکبائر المستحقین للعقاب۔ فذهب المعتزلة علی انها
 للمستحقین للثواب وتأثیر الشفاعتہ فی ان تحصل نہیادۃ من المنافع
 علی قدر ما استحقوه وقال اصحابنا تأثیرها فی اسقاط العذاب عن
 المستحقین للعقاب اما بان یشفع لهم فی عرصة القیامتہ حتی
 لا یدخلوا النار وان دخلوا النار فیشفع لهم حتی ینجروا
 منها و یدخلوا الجنة واتفقوا علی انها لیست بکفار۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں شفاعت کے حامل ہونے پر امت کا اجماع
 ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی عسی ان یبعتک ربک بما عملت اور اللہ تعالیٰ
 کا قول ولسوف یعطیک ربک فترضی اس پر دال ہیں۔ پھر اس میں اختلاف
 ہے کہ یہ شفاعت صرف مومنوں کو نفع دے گی جو مستحق ثواب ہیں یا کہ کبیرہ گناہوں کے
 مرتکبین جو عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو بھی نفع دے گی۔ معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ
 یہ شفاعت صرف ان مومنوں کو نفع دے گی جو ثواب کے مستحق ہوں گے۔ شفاعت
 کا فائدہ ان کو یہ ہوگا کہ ان کے ثواب اور منفعت میں ان کو استحقاق سے زیادتی حاصل
 ہوگی لیکن جمہور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ مستحقین عذاب سے عذاب کے معاف
 کرنے میں یہ شفاعت فائدہ دے گی۔ یا تو میدانِ حشر میں ہی ان کے لیے شفاعت ہو
 گی۔ لہذا ان کو جہنم کی آگ میں نہیں داخل کیا جائے گا اور یا ان کے جہنم میں داخل ہونے

کے بعد شفاعت ہوگی جس کی وجہ سے انی کو جہنم کی آگ سے نکال دیا جائے گا۔ البتہ کافروں کے حق میں شفاعت کے نہ ہوتے میں اتفاق یعنی کافروں کے لیے انبیائے کرام یا صلحیہ نے شفاعت کرنی ہی نہیں کہ ان کو نفع دے۔ معتزلہ نے گنہگاروں کے لیے شفاعت کی نفی پر جو اعتراض کیے علامہ رازی نے ان کا رد کیا ہے۔ ایک ان کی دلیل یہ ہے: وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَهَذِهِ نَكَرَةٌ فِي سِيَاقِ النَّفْيِ فَتَعْمُ جَمِيعَ الْمَوَاقِعِ الشَّفَاعَةُ اس مقام پر شفاعت نکرہ ہے اور سیاق نفی میں ہے چونکہ نکرہ تحت انفی عموم کا فائدہ دیتا ہے لہذا شفاعت کی تمام قسموں کی نفی ہو جائے گی یعنی کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس کا جواب اس طرح دیا گیا فہب (فہذا باطل)

ان العبارة بمعنى اللفظ لا بخصوص السبب الا ان تخصيص مثل هذا العام بذالك السبب المنصوص به كاف في دليل فاذا قامت الدلائل الدالة على وجع الشفاء وجب التخصيص الى تخصيصها یہ دعویٰ باطل ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہے خصوصی سبب کا نہیں اس لیے کہ عام کو خصوصی سبب سے کسی ادنیٰ دلیل کے پیش نظر بھی خاص کرنا صحیح ہوتا ہے اور جب وجود شفاعت پر واضح دلائل موجود ہیں تو اس کو خاص کرنا ضروری ہے مطلب یہ ہوا کہ عموم لفظ کا اعتبار اس وقت ہوتا ہے جب اس کی تخصیص پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکے۔ اسی طرح ایک اور دلیل منکرین شفاعت نے یہ پیش کی: مَا ظَلَمْنَا مِنْ جَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٌ يَطْمَعُ وَالظَّالِمُ هُوَ الَّذِي بِالظُّلْمِ وَظَلَمَ يَتَنَاوَلُ الْكَافِرُ وَغَيْرُ يَعْنِي اللَّهُ تَعَالَى لَمْ يَفْرَمَا يَكُ ظَالِمُونَ كَأَكْوَابِ مَدَدِ كَارِ نَهَيْسِ اَوْرَنْهِي اِنِ كَا شَفَاعَتِ كَرْنِي وَالْاِحْسَ كِي يَاتِ مَانِي يَاجَانِي۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ظالموں کے متعلق ہے اور ظالم وہ ہے جو ظلم کرے۔ یہ کافر اور غیر کافر سب کو شامل ہے۔ لہذا پتا چلا کہ فاسقوں کی کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس کا جواب اسی طرح دیا گیا: فَاَلْجَوَابُ عِنْدَانِ قَوْلُهُ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ جَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٌ نَقِضَ لِقَوْلِنَا لِلظَّالِمِينَ جَمِيمٍ وَشَفِيعٌ لَكِنْ قَوْلِنَا

للظالمين حميم وشفيع موجبة كلية ونقيض الموجبة الكلية سالبة جزئية والسالبة
جزئية يكفي في صدقها تحقق ذلك السلب في بعض الصور ولا يحتاج فيه الى
تحقق ذلك السلب في الصور وعلى هذا فنحن نقول بموجب لاف
عندنا انه ليس لبعض الظالمين حميم ولا شفيع يعاب وهم
الكفار فاما ان يحكم على كل واحد منهم بسلب
الحميم والشفيع فلا -

یعنی جواب یہ دیا گیا ہے کہ مال للظالمين من حميم ولا شفيع یہ نقيض
ہے للظالمين حميم وشفيع کی اور یہ موجبہ کلیہ ہے۔ موجبہ کلیہ کی نقيض سالبة جزئية ہوتی
ہے اور سالبة جزئية کے لیے یہ کافی ہے کہ بعض صورتوں میں سلب پائی جائے۔ جمع
صورتوں میں سلب کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض ظالموں
کا کوئی مددگار اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ وہ بعض ظالموں سے مراد کافر
ہیں۔ اگر تمام ظالم مراد لیے جائیں تو یہ درست نہیں۔

اور نفی شفاعت پر یہ دلیل قائم کی گئی من قبل ان یاتی یوم لا یسع فیہ
لاخلت ولا شفاعة۔ ظاہر الایۃ یقتضی نفی الشفاعۃ باسرها
یعنی اس مذکورہ آیت میں مکمل طور پر شفاعت کی نفی کی گئی ہے کہ قیامت میں کوئی دوستی
اور سفارش کام نہیں آئے گی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: فالجواب عنہ ما تقدم
فی الوجه الاول یعنی اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی پہلی آیت کا جواب دیا جا
چکا ہے۔ اسی طرح اور دلیل نفی شفاعت پر یہ دی گئی ہے: قوله تعالى فما
تنفعهم شفاعة الشافعين ولو اشریت الشفاعۃ فی اسقاط العقاب
لکانت الشفاعۃ قد تنفعهم وذلك ضد الایۃ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کو شفاعت
کرنے والوں کی شفاعت نفع نہیں دے گی۔ اگر شفاعت عذاب کے ختم ہونے میں

نفع ہوتی تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہ ہوتا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: قوله فما
تنقصهم شفاعته الشافعين فهذا واضح في حق الكفار وهو يدل
بسبب التخصيص على ضد هذا الحكم ^{مبين} في حق من يعني به آيت كريمه كافرين کے بارے میں
نازل ہوئی۔ لہذا یہ حکم ان ہی کو شامل ہے ان کی ضد مومنوں کو یہ حکم شامل ہی نہیں۔
جبکہ واضح و لائق قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں تو گنہگاروں کے
لیے انبیائے کرام صلیار کی شفاعت کا انکار ناممکن ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
لا يملكون الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمن عهدا اللہ تعالیٰ کے حکم
اور اجازت سے شفاعت کا حق حاصل ہوگا واستغفر لهم الرسول میں بھی
شفاعت کا ہی ذکر ہے کیونکہ گنہگاروں کے لیے طلب مغفرت شفاعت ہی ہے۔
مذکورہ بیان کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ کافروں کے لیے کسی کی شفاعت قابل قبول
نہیں البتہ مومن گنہگاروں کے لیے شفاعت قبول ہوگی۔ لہذا اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی
حق پر مبنی ہے مطلقاً شفاعت کے انکار پر دلالت کرنے والا ترجمہ کسی طرح بھی قابل
قبول نہیں۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا (پ ۱۶)

پھر تم نے عجل سے بھائے کا بچہ۔ (شاہ رفیع الدین)
پھر تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا۔ (عبدالماجد)
پھر تم لوگوں نے تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰ کے بعد۔ (مولانا اشرف علی)
پھر تم نے بنا لیا بچہ ایسی کے پیچھے۔ (شاہ عبدالقادر)
پھر تم نے بنا لیا بچہ موسیٰ کے بعد (مولانا محمود الحسن)
پھر اس کے پیچھے تم نے بچہ کی پوجا شروع کر دی۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر بعض تراجم میں ایک تو ”موسیٰ“ کسی لفظ کا ترجمہ نہیں بلکہ ضمیر کے مرجح سے سمجھ میں آتا ہے۔ مخالفین کو یہ اعتراض تو کرتا آتا ہے کہ ضمیر کا مرجح نبی کریم ہو تو ”محبوب“ ترجمہ میں کیوں آتا ہے۔ یہاں بعض تراجم میں ”موسیٰ“ کیوں آیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیگر تراجم سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ایک بچہ بنایا یا تجویز کر لیا۔ کیا ان پر ایک دوسرے کو قتل کرنا فقط اس لیے واجب تھا کہ انھوں نے بچہ کیوں بنایا یا بچہ کو خدا کیوں مانا؟ اور اس کی پوجا کیوں کی؟ اگر صرف بنانا مقصود تھا تو یہ فعل صرف سامری کا تھا، تمام کا نہیں۔ پھر دوسروں کا مواخذہ کیسے۔ یہاں تو یہ ذکر ہے انھوں نے بچہ کو خدا مان کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی۔ اس پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ واضح ہے۔ باقی تراجم سے مقصد واضح نہیں۔ اس پر زیادہ تفاسیر کی عبارات نقل کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں خود قرآن پاک کے دوسرے مقام پر واضح کیا گیا ہے کہ انھوں نے بچہ کو خدا مانا تھا۔ اس کی عبادت کرتے رہے فقالوا هذا **الْمَلَكُ وَالَّذِي مَنَّاسِي** پ۔ سامری اور اس کے متبعین نے دوسروں کو کہا:

”یہ ہے تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا“ اس سے آگے ان کا جواب حضرت ہارون علیہ السلام کے منع کرنے پر یہ تھا: **قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْكَ كَافِرِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ** پ۔ انھوں نے کہا ہم تو موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے تک اسی پر (گاؤ پرستی) پر قائم رہیں گے۔ تاہم صرف بیضاوی شریف کی عبارت پر اکتفا کیا جاتا ہے: **ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ الْجَمَادِ مَعْبُودًا** یعنی تم نے بچہ کو خدا، معبود بنالیا۔

فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ (پ۔ ۴)

پھر بعض کو تم نے بھٹلایا اور بعض کو تم ہی قتل کرنے لگے۔ (عبدالماجد)

(فتح محمد)
 ایک گروہ (انبیاء) کو تو جھٹلاتے رہے اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔
 پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو مار ڈالتے (شاہ عبدالقادر)
 کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔ (مولانا مودودی)
 پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کر دیا (مولانا محمد الحسن)
 سو بعضوں کو قتل کرنے سے بھڑکایا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالتے تھے۔ (مولانا
 اثر علی)

تم ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے
 ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں ایک ان تراجم میں یہ فرق واضح ہے کہ جہاں بھی یہود کا انبیاء کو شہید
 کرنے کا ذکر ہے وہاں ہی دیگر حضرات کے تراجم میں لفظ قتل استعمال ہوا ہے۔
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں لفظ شہید ہے جو ادب و احترام پر دال ہے کیونکہ ہر قتل شہادت
 کو مستلزم نہیں۔ اگرچہ انبیاء کرام کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے تخصیص تو ہے
 لیکن بات تو یہ ہے کہ ترجمہ کے الفاظ ہی سے کسی کے مقام کا پتہ چل جائے اور تفسیر
 کی طرف اشارہ ہو جائے یہ ہی ترجمہ کی کمالیت پر دال ہے۔ تفسیر جلالین کی عبات
 ملاحظہ ہو: ففی یقام منہم کذبتہم کعبی و فریقا قتلون ای کز کریا و یعی
 اسی طرح منہم کے ماتحت بین اسطورہ بحوالہ کمالین ای من الہسل
 الذلک غلب قولہ من سول یعنی انبیاء کی ایک جماعت جیسے عیسیٰ علیہ السلام
 کی انہوں نے تکذیب کی اور ایک جماعت جیسے زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو شہید کیا۔ اسی
 طرح مدارک میں بھی ہے: ففی یقا کذبتہم کعبی و محمد علیہما السلام
 و فریقا قتلون کز کریا و یحییٰ علیہما السلام یعنی ایک جماعت جیسے عیسیٰ علیہ السلام
 اور نبی کریم کی انہوں نے تکذیب کی اور جماعت جیسے حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام

کو انھوں نے شہید کیا۔ یہ مفہوم کون سے ترجمہ سے واضح ہے ذی شعور خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا (پ ۴)

اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ۔ (عبدالقادر)
اور جب ہم نے مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ
امن کی۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا (مولانا
مودودی)۔

اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔
(فتح محمد)۔

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا۔ (الْحَضْرَت)
اس مقام پر مشابہت کا ترجمہ اجتماع کی جگہ کیا گیا ہے اور الْحَضْرَت نے مرجع یعنی جائے
رجوع کیا اور یہ ترجمہ لغت کے مطابق ہے اور مقصد بھی بیان کرنے کا یہی ہے کہ لوگ اس
کی طرف بار بار لوٹتے ہیں اور دیکھنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی
فوقیت پر جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: مرجع ایثوبون الیہ من کل جانب
یعنی "مرجع بنایا کہ ہر جانب سے لوگ اس طرف لوٹتے ہیں" جلالین کے حاشیہ پر یہ ہے:
یثوبون ای یرجعون ثوب گرد آمدن مردم (مراہم) بھی معنی لوٹنا ہے۔
مدارک میں اس طرح ہے: صباة و مرجع للعجاج والعماس یتفرقون عند
تشریح یثوبون الیہ "حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لیے مرجع بنایا جو اس سے جدا
ہوتے ہیں اور پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں" بیضاوی میں ہے: مرجع ایثوبون الیہ
الزواجا والامثالہم "مرجع ہے کہ اس کی طرف زائرین لوٹتے ہیں" تفاسیر عبارات
سے یہ خود بخود پتا چل جاتا ہے کہ صرف اجتماع کی جگہ ترجمہ کرنے سے اس کا مرجع ہونا

تہیں سمجھ آتا کیونکہ اجتماع تو ایک مرتبہ بھی پایا جائے۔ اگرچہ یہ کہنا درست تو ہے کہ وہ اجتماع کی جگہ ہے لیکن بیت اللہ شریف تو بار بار لوٹنے اور مجتمع ہونے کی جگہ ہے۔ البتہ مرجح ترجیح کرنے سے اجتماع کی جگہ سمجھ میں آجاتی ہے کیونکہ حج کے لیے بار بار لوٹنا اجتماع کو بھی مستلزم ہے۔

وَدَاتٍ فِي الْآخِرَةِ لِمَنِ الصَّالِحِينَ (پ ۴۶)

اور وہ آخرت میں نیکیوں میں ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور آخرت میں نیک ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ (مولانا موڈودی)۔

اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں (مولانا اشرف علی)

اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہیں۔

(اعلیٰ حضرت)

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ تراجم ہی فرق یہ ہے کہ صرف نیکیوں میں ہوتا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان کو واضح نہیں کرتا اس لیے نیک تو غیر انبیاء بھی ہونگے حالانکہ مقام انبیاء اور غیر انبیاء میں بہت بڑا فرق ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو شامل ہے کیوں کہ آپ نے "خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے" ترجمہ کر کے یہ واضح کر دیا کہ خاص قرب کی قابلیت انبیاء کو ہی حاصل ہوگی۔ عام نیکیوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوگا لہذا صحیح مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح ہوا۔ اسی پر جلالین کی عبارت دیکھیں:

الذین لهم الدرجات العلیٰ صالحین کی تفسیر آپ نے ان الفاظ میں کی جس

کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو بلند درجات حاصل ہوں گے آپ ان ہی میں ہوں گے۔

اسی طرح شیخ زادہ برصاوی میں ہے: **قيل المراد بالصالحين الانبياء علی**

الصلوة والسلام لقوله تعالى ومن ذریتہ حارود و سلیمان و ایوب

الذین لهم کل من الصالحین وان ابراہیم علیہ السلام دعا ربہ

وقوله والحقني بالصالحين اى الامبياء الماضين فاجاب الله
 دعوتهم ومين انه معهم في الجنة یہاں بھی مقصد یہی بیان کیا گیا ہے کہ صالحین
 سے مراد انبیاء ہیں کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ آپ کی اولاد میں سے
 داؤد اور سلیمان اور ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، ایساں علیہم
 السلام تمام ہی صالحین سے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے
 میرے رب مجھے صالحین سے یعنی پہلے انبیاء سے لاحق فرما۔ رب نے اس دعا کو قبول
 کیا اور آپ کو بتایا کہ تم جنت میں ان کے ساتھ ہو گے۔ گویا یہ اسی خیر کا بیان ہے کہ آپ
 آخرت میں انبیاء کے ساتھ ہی ہوں گے جو خاص قرب کی قابلیت والے ہیں۔

قُلْ بَلِّغُوا بَرَاءَةً حَنِيفًا ۝۱۱

کہنے کے کہہ کر نہیں بلکہ ہم نے اختیار کی راہ ابراہیم جو ایک ہی طرف کا تھا۔ (مولانا محمد الحسن)
 اب کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیم پر ہیں گے جس میں کبھی کا نام نہیں۔ (اشرف علی)
 ان سے کہہ بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ۔ (موردی)
 تم فرماؤ۔ بلا کہیم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر مٹل سے جدا تھے۔ (اشرف علی)
 اس مقام پر قل کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ کہ اور تم فرماؤ یہ
 دونوں ترجمے اسی لفظ قل کے ہیں۔ ان میں جو فرق ہے وہ بیان وضاحت کا محتاج
 نہیں۔ اس مقام پر حنیفا کا ترجمہ بعض حضرات نے کیا ہے "ایک ہی طرف کا۔" حضرت
 نے اسی لفظ کا ترجمہ کیا ہے "ہر مٹل سے جدا تھے۔" پہلی بات تو یہ ہے کہ عام اردو
 زبانی کے محاورات سے واقف آدمی سمجھ لے گا۔ ایک ہی طرف کا ہونا اور مٹل سے
 جدا ہونا، ان دونوں میں سے یقیناً دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ پھر بھی اعلیٰ حضرت
 کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہونا۔ اس پر جلالین نے حنیفا کی جو تفسیر کی ہے وہ شاہد ہے :
 حال من ابراہیم ما مثلاً عن الادیان کلہا الی الدین السقیم
 : جیسا حنیفا ترکیبی لحاظ سے لفظ ابراہیم سے حال سے اور اس کا مطلب یہ ہے

کہ تمام باطل دینوں نے جدا ہونا ایک دین مستقیم پر قائم ہونا۔ مدارک نے اس طرح بیان کیا الحنیف المائل من کل دین باطل الی الحق یعنی ضیف کا مقصد یہ ہے کہ ہر باطل دین سے جدا ہونا، دین حق کی طرف متوجہ ہونا بیضادی میں یہ ہے (حنیفا) مائلا عن الباطل الی الحق باطل سے جدا ہونا۔ حق کی طرف توجہ۔ مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ تو حقیقت سے بالکل دور ہے کیونکہ حنیفا کا ذکر ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے نہ کہ ملت کے یعنی یہ حال واقع ہو رہا ہے لفظ ابراہیم سے لیکن مودودی صاحب کا ترجمہ صرف خیالی ہے۔ عربی گرامر کی مطابقت سے اسے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اسی طرح مولانا اشرف علی صاحب نے حنیفا کا ترجمہ کیا ہے۔ (جس میں کبھی کا نام نہیں) یہ کوئی لغوی ترجمہ نہیں) اور نہ ہی مقصد کو واضح کرتا ہے۔

لَا تَفْرِقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ (پہلے)

نہیں جدائی ڈالتے ہم درمیان کسی ان میں سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ (عبدالماجد)۔
ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ (اشرف علی)۔
ہم فرق نہیں کرتے ان سب میں سے کسی ایک میں بھی۔ (مولانا محمد الحسن)۔
ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ (مولانا مودودی)۔
ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

ان تراجم میں فرق سمجھنے سے پہلے اس پوری آیت کا مفہوم ذہن میں رہے کہ اس آیت میں خطاب مومنوں کو ہے کہ تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف آتا رہا یعنی قرآن پاک اور جو ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر آتا رہا یعنی صحیفے اور جو عطا کیا گیا مولے

علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو یعنی تورات اور انجیل اور جو باقی انبیائے کرام کو اپنے رب کی طرف سے عطا ہوئے یعنی کتب و آیات۔ ہم ان میں کسی ایک پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔

اب اس آیت کریمہ کے مفہوم کے بعد واضح ہو کہ صرف اتنا کافی نہیں کہ ہم ان میں فرق نہیں کرتے کیونکہ فرق تو ہم کرتے ہیں اور قرآن پاک کو افضل الکتب مانتے ہیں۔ لہذا یہاں جس فرق کی نفی ہے وہ یہی ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض کتب پر ایمان ہو اور بعض پر نہ ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر جلالین میں اس طرح تفسیر پیش کی گئی ہے: **خَوْنٌ مِنْ بَعْضٍ وَنَكَهٌ بِبَعْضٍ كَالْيَهُودِ وَالنَّصَارَى** ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان رکھیں اور بعض کے ساتھ کفر کریں۔ جس طرح یہود و نصاریٰ کرتے تھے۔ مدارک میں بھی اسی طرح یا لفظ دیگر مفہوم پیش کیا گیا ہے: **اِى لَاحِقٍ مِنْ بَعْضٍ وَنَكَهٌ بِبَعْضٍ كَمَا فَعَلَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى**۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کے مطابق ہے جب کہ دیگر تراجم قابل اعتراض ہیں۔

فَسَيَكْفِيكُمْ اللَّهُ (پ ۱۴)

تو تمہاری طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے۔ (اشرف علی)۔
 سواب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 سواب کافی ہے تیری طرف سے اللہ۔ (مولانا محمود الحسن)۔
 سواب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں ہے۔ (عبدالماجد)
 نو! اے محبوب! عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا (اعلیٰ حضرت)
 یہاں لفظ اللہ فاعل ہے اور "کے" ضمیر اور "ہم" ضمیر مفعول ہیں۔ بظاہر دونوں معنوں کو عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اللہ نبی کریم کی طرف سے ان کو کافی ہو۔ یعنی عذاب دے۔ یا یہ معنی ہو کہ اللہ ان کی طرف سے نبی کریم کو کافی ہو کہ وہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں بلکہ خود ہی گرفت میں آجائیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے عین

مطابق ہے۔ مدارک میں ہے: ضمان من اللہ لا ظہار رسولہ علیہم
 قد اخذ وعدہ بقتل بعضهم واجلاء بعض یعنی اللہ تعالیٰ نے
 ذمہ داری اٹھائی ہے کہ نبی کریم کو غالب کریگا ان پر یعنی اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت
 کرے گا۔ اسی وعدہ کو اللہ نے اس طرح پورا فرمایا کہ بعض ان میں سے قتل ہو گئے اور
 بعض جلاوطن۔ ایسے ہی جلالین میں یا محمد شقاہم سے تفسیر کی گئی جس کا مطلب
 ہے کہ اے نبی کریم آپ کو اللہ کافی ہے ان کی مخالفت کے باوجود۔ کیونکہ شقاق کا
 ترجمہ خود مفسر نے پہلے خلاف کر دیا ہے۔ اس آیت کریمہ کے اختتام پر بھی جلالین میں
 مدارک کے مطابق ہی عبارت ہے: وقد کفاه اللہ ایاہم بقتل قریظۃ
 ونفی النصیب وخریب الجذیۃ علیہم اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کی ان کی طرف سے
 کفایت کی تو قریظہ قتل ہو گئے اور نصیر جلاوطن ہوئے اور ان پر جزیرہ مقرر ہوا۔ شیخ
 زاوہ حاشیہ بیضاوی میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے: فسیکفی اللہ ایاک امر
 الیہود والنصارى بحفظک من شومہم ونصوک علیہم یعنی اللہ تعالیٰ آپ
 کی یہود و نصاریٰ کی طرف سے کفایت کرے گا۔ ان کے ناپاک ارادوں کو ختم کر کے
 آپ کی حفاظت فرمائے گا اور آپ کو ان پر غالب فرمائے گا۔
 تفاسیر کے بیان کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کریں تو آپ کی وسعت علمیت
 کا اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔

وَيَكُونَنَّ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (پ ۴)

اور ہووے پیغمبر اور تمہارے گواہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 اور رسول ہو تم پر تانے والا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 اور پیغمبر آخر الزمان تم پر گواہ بنیں۔ (فتح محمد)۔
 اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔ (محمود الحسن)۔

اور رسول تم پر گواہ ہو۔ (مولانا مودودی)

marfat.com

Marfat.com

اور رسول گواہ ہیں تم پر (عبدالماجد) اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی علیہ وسلم گواہ ہوں۔ (اثرف علی)۔ اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ (اعلیٰ حضرت)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت لوگوں پر گواہی دے گی اور آپ اپنی امت کی صداقت کی گواہی دیں گے اور ان کے نگہبان ہوں گے۔ دیگر تراجم نے صرف گواہ ذکر کیا جب کہ اعلیٰ حضرت نے نگہبان و گواہ ذکر کیا ہے۔ اس معنی پر مدارک دال ہے :

لما كان الشهيد قال في جوابه بكرة استعلاء كقولہ تعالیٰ كنت انت الرقيب عليهم چونکہ گواہ نگہبان کی طرح ہوتا ہے اسی وجہ سے جس طرح رقيب نگہبان کے بعد کلمہ علی آتا ہے اسی طرح یہاں بھی لایا گیا ہے بیضاوی نے بھی اسی طرح بیان کیا کہ جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کر دیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے کے لیے تبلیغ پر گواہ طلب کرے گا۔ انبیاء کرام امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ پیش کریں گے۔ پہلی امتیں کہیں گی، تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا۔ ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان پر گواہی کے لیے نبی کریم کو لایا جائے گا۔ آخر مقصودی عبارت ملاحظہ ہو: فيؤتى بمحمد صلى الله عليه وسلم فيسأل عن حال امته فيشهد بعد التتميم وهذه الشهادة وان كانت لهم لكن لما كان الرسول عليه السلام كالرقيب المدهين على امته عدى بعلى نبى كريم صلى الله عليه وسلم كولايا جائے گا۔ آپ اپنی امت کی عداوت کی گواہی دیں گے۔ اگے علامہ بیضاوی نے ایک سوال کا جواب دیا ہے کہ شہادت کے بعد علی آئے تو یہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ جب کسی کے حق میں شہادت دینی ہو تو شہادت کے بعد لام آتا ہے۔ اس کا جواب علامہ نے دیا کہ اگرچہ نبی کریم کی شہادت ان کے حق میں ہوگی لیکن آپ چونکہ ان کے لیے رقبوں (نگہبانوں) کی طرح ہیں اس وجہ سے علی سے متعدی کیا ہے۔ چونکہ آپ نگہبان ہیں نہ کہ یہ مراد ہے کہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اسی سوال و جواب کو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں نگہبان کا

لفظ بڑھا کر مندرج کر دیا جس کی حقیقت سے دیگر مترجمین بے خبر رہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ رُوحَنَا

اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں (فتح محمد)۔ اور جس سمت قبلہ پر آپ رو چکے ہیں وہ تو محض اس کے لیے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے (اشرف علی)۔ نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں (محمود الحسن)۔ اور وہ قبلہ جو ہم نے ٹھہرایا جس پر تو تھا، نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں۔ (شاہ عبدالقادر)۔ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لیے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔ اور نہیں کیا تھا ہم نے قبلہ جو تھا تو اوپر اس کے مگر تو کہ جانیں ہم۔ (شاہ رفیع الدین)۔

یہاں تحویل قبلہ کا ذکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ پہلے کعبہ تھا۔ مدینہ طیبہ میں آکر سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس قبلہ بنایا گیا۔ پھر نبی کریم کی مرضی کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اس واقعہ کو رپ قدوس نے ذکر فرمایا کہ تحویل قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور کافر میں فرق ہو جائے کہ کون نبی کریم کی تابعداری کرتا ہے اور کون شک کرتا ہے اور رُوگردانی کرتا ہے۔ اب اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ عام تراجم میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو اس لیے تبدیل کیا کہ اسے متعین اور متکین کا علم ہو جائے۔ اس میں ایک وہم ہوتا ہے جو تفاسیر نے ذکر کیا اس کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ اس وہم کو تقویت ملتی ہے۔ وہ وہم جو تفاسیر میں ہے وہ دیکھیں: فان قيل كيف يكون علمه تعالى غاية الجعل وهو لم يزل عالما بصلوٰى

اعتراض کیا جاتا ہے کہ علم کو جعل کی غایہ بنانا صحیح نہیں کہ قبلہ اس لیے بنایا کہ ہم جانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ازل لاً عالم ہے۔ جواب اس طرح دیا گیا ہے قلت هذا و اشباعه با عنبسا التعلق المحالى الذى هو مناط الجزاء والمعنى لیتعلق

علمنا به موجودا۔ یعنی یہاں جزا کا تعلق موجود کے علم سے ہے۔ اسی جواب

کوہ ابرک میں زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ قال الشيخ ابو منصور، معنی قولہ
 لنعم کائناتنا موجودا ما قد علمناہ انہ یکون ویوجد فاما لکنہ تعالیٰ عالم فی
 الازل بکل ما اسراد وجودہ انہ یوجد فی الوقت الذی شاء وجودہ
 فیہ ولا یوصف بانہ عالم فی الازل بیانہ موجود کائن لانہ لیس
 بموجود فی الازل فکیف یعلمہ موجودا فاذا صا ما موجودا
 یدخل تحت علم الازل فیہ سیر معلوما لہ موجودا کائناتنا
 والتعین علی المعلوم لا علی العالِم۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو
 علم ازل حاصل ہے کہ فلاں چیز نے موجود ہونا ہے لیکن پہلے علم کا تعلق غیر موجود سے جو
 بعد میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ چیز موجود ہوگی اب موجود سے متعلق ہوگا۔ یہاں علم میں
 تبدیلی نہیں بلکہ معلوم میں تبدیلی ہے۔ پہلے علم وہ تھا کہ معلوم مقام ظہور میں نہیں تھا۔
 اب علم ہے کہ معلوم مقام ظہور میں ہے۔

اب آپ تراجم میں فرق دیکھیں کہ یہ کہا جائے تاکہ ہم معلوم کریں تو یہ اعتراض مندرج
 ہوگا یا یہ کہا جائے کہ ہم دیکھیں تو اعتراض مندرج ہوگا۔ یہ ہے مولانا احمد رضا خاں صاحب
 رحمۃ اللہ علیہ کی علمی بصیرت جس میں صاحب نظر کو اعتراف کرنے میں کوئی کلام نہیں۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۗ إِنَّهَا لَآيَةٌ لِّلَّذِينَ يَنظُرُونَ ۗ (الانبیاء: ۱۰۷)

اور اگر تم یا وجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی وحی خدا) آپکی ہے ان
 کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد)
 اور کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہے بے
 انصافوں میں۔ (شاہ عبدالقادر)

اور اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں اور (اور وہ بھی) آپ
 کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے لپٹنا آپ ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔ (اشرف علی)

اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا
بے انصافی میں۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی
تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ (مولانا مودودی)۔

اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے
پاس علم آچکا ہے تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔ (عبدالماجد)۔
اگر تو پیروی کرے گا خواہشوں ان کے کی پیچھے اس چیز کے کہ آئی تیرے پاس علم
سے تحقیق تو اس وقت ظالموں سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور (اے سننے والے کے) باشد! اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ
تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستم گار ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں دیگر تراجم میں انک من الظالمین کی نسبت نبی کریم کی طرف کی
گئی جس میں ولئن اتبعتم کے ساتھ کوئی بالفرض کی قید کا اضافہ نہیں ہوا۔
بظاہر عام ترجمہ سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم سے یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری
ممکن ہے اور اگر آپ نے تابعداری کر لی تو معاذ اللہ آپ بے انصافوں، ظالموں سے
ہوں گے۔ حالانکہ یہ تصور بھی ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے جلالین میں ہے: انک من

اذان اتبعتم فرضا من الظالمین۔ یعنی یہ کلام بالفرض محال پر مبنی ہے
صاحب مدارک نے کہا: و فی ذلك لطف لهما معین و ترویح للثبات
علی الحق و تخذیر لمن یترک الدلیل بعد اناوتہ و یتبع
الہوی و قبل الخطاب فی الظاہر لنبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد انہ اس میں سامعین پر
مہربانی ہے اور حق پر ثابت رہنے کے لیے براہ گنجتہ کیا گیا ہے۔ اور جو شخص دلیل
کے روشن ہونے کے بعد چھوڑتا ہے اور خواہشات کے درپے ہوتا ہے اس کو ڈرایا
گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مراد
امت ہے۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں (اور اے سننے والے کے) باشد! کا

اضافہ کیا ہے تاکہ تفاسیر کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہو جائے بیضاوی نے بھی علی بسبیل الفرض و التقدید ذکر کیا ہے محشی نے کہا ہے کہ یہ سوال کا جواب ہے اتباع اہواء المخالفین لیس بہ محتمل فی حقہ علیہ السلام للقطع بعصمتہ من المعاصی کیونکہ نبی کریم سے مخالفین کی خواہشات کی اتباع کا قطعی احتمال منتفی ہے کیونکہ آپ تو معاصی سے معصوم ہیں۔ بیضاوی نے علی بسبیل الفرض و التقدید کے الفاظ ذکر کر کے جواب دیا ہے کہ یہ کلام بالفرض ہے نہ کہ حقیقت۔ محشی نے اس کا جواب بھی نقل کیا ہے فی عادة الناس ان یوجہوا امرہم فیہم الی من ہوا اظہر منزلة عندہم اسر شاد اللغین و تاکیدا کہ عام لوگوں کی عادت ہے اوامر و نہی کو بڑے کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اگرچہ مقصود اس سے غیروں کو ہدایت دینی ہوتی ہے۔ اس مقام پر یہی صورت ہے جس کو اعلیٰ حضرت نے اختیار کیا ہے۔

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُسْتَرِينَ (پہلے)

تو وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔ (محمود الحسن)۔
حق ہے پروردگار تیرے کی طرف سے پس مت ہو شک لانے والوں سے (شافیہ الدین) (اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے پروردگار کا طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد)۔

حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا (شاہ عبدالقادر)۔
یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لہذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔ (مولانا مودودی)۔

یہ امر حق سے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو کہیں شک کر نہ والوں میں ہرگز نہ ہو جانا۔ (عبدالماجد)۔

سو ہرگز شک و شبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا۔ (اشرف علی)۔

(اے سُننے والے) یہ حق تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو) تو خبردار تو شک نہ کرنا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی مترجمین نے شک کی نسبت نبی کریم کی طرف کی اور یہ ترجمہ کیا کہ تو نہ ہو شک لانے والا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے اس نازک مقام کو تفاسیر پر نظر رکھتے ہوئے اپنے ترجمہ سے حل فرمایا۔ (اے سُننے والے) لفظ اضافہ کیا تاکہ نبی میں مخاطب نبی کریم نہ ہوں بلکہ عام امتی ہو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر بیضاوی کی عبارت بطور تائید دیکھیے

مترجم منقولین بقصد واختیار بل ما تحقق الامر انہ بحیث لا یشک فیہ

ناظر اول امر الامة بالكتساب المعاصر المزیجة للشک علی الوجه الابلغ

اس پر محشی کی عبارت اس طرح ہے: فان الانسان کمالا ینفخ عمالا

یتوقع منه لا ینوی ایضا عمالا مدخل فیہ للقصد واختیار کالشک والجهل

والجور والعطش فاذا اوصفت صوة النبوی فی مثل هذه المواضع لا یراد

بها حقيقة النبوی بل یقصد بها شیء اخر فقوله تعالیٰ فلا تکون من الممتدین

من قبیل الخطاب العام الواحد علی صوة النبوی والمقصود منه

اخبار كافة الناس بان المقام ليس بمظنة لان ليس تاب فيه عن الانعام

دون عبارتوں کا خلاصہ کلام اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

شک سے نہیں روکا گیا کیونکہ آپ سے تو شک کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ جس

مقام پر نبی کی توقع نہ کی جاسکے وہاں نبی نہیں پائی جاسکتی۔ اسی طرح جہاں قصد

اختیار نہ پایا جاسکے وہاں بھی نبی نہیں پائی جاتی۔ لہذا یہاں حقیقتاً نبی نہیں پائی

گئی بلکہ یہاں عام خطاب ہے جو صورتاً نبی ہے۔ مقصد یہاں عام لوگوں کی خبر دینا

ہے کہ یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں کسی ایک کو شک نہیں کرتا چاہیے حقیقت یہ

ہے کہ جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایمان افروز ہے اس کا کوئی نامی نہیں جس میں

تفسیر و لغات پر نظر ہوتی ہے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک

وَمَا أَهْلًا بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ (پارہ ۱)

(محمود الحسن)

اور جس پتیر کا نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا۔
اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو (مولانا مودودی)
اور جو (جانور) غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہے حرام کیا ہے۔ (عبدالماجد)
اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور جو کچھ پکارا جاوے اوپر اس کے واسطے غیر اللہ کے (شاریح الدین)
اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ (العلحضرت)

مسئلہ یہ ہے کہ جو جانور ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کے بغیر کسی اور نام سے
ذبح کیا گیا وہ حرام ہے جس طرح کفار اپنے بتوں لات و عزی کے ناموں سے اپنے
جانوروں کو ذبح کرتے تھے ایسے باطل طریقوں سے روکا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ
ایسے مذبوہ جانور حرام ہوں گے۔ اسی طرح اگر ذبح میں غیر خدا کا تقرب حاصل کیے
گو یا اس کو معبود سمجھے تو یقیناً وہ جانور حرام ہوگا اگرچہ اس کے ذبح کے وقت اللہ کا
نام بھی لیا گیا ہو لیکن اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے اور اس مذبوہ کا
گوشت اولیاء اللہ کے ایصالِ ثواب کے لیے تقسیم کیا گیا ہے یہ ارادہ خواہ قبل از ذبح
موجود تھا یا بعد از ذبح، ہر حال میں وہ جانور حلال ہوگا۔ اس مسئلہ پر قطب الاقطاب
حضرت پیر مہر علی شاہ گوٹروی رحمہ اللہ کی اعلیٰ کلمۃ اللہ ایک جامع اور تحقیق پر مبنی کتاب
ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ یہاں تو صرف بیان کرنا مقصود ہے کہ کون سا ترجمہ
تفسیر کے مطابق ہے۔ وما اهل به لغير الله اي فبع على اسم غيره تعالى والاهلا

رفع الصوت وكانوا يرفعونه عند الذبح لا الهتم

(جلالین) جو جانور غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو اہلال کا معنی آواز بلند کرنا مشرک
ذبح کے وقت اپنے معبودوں کا نام لیتے تھے ای رفع به الصوت عند ذبح

للصوم (بیضاوی) یعنی ذبح کے وقت بتوں کا نام لیا جائے اسی ذبح للاصنام
 فذكر عليه غير اسم الله واصل الاهلال كرفع الصوامي فمع بالصوم للصوم وذلك قول اهل الجاهلية
 باسم اللات والعزى (بتوں) یعنی غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ اصل اہلال آواز کو بلند کرنا
 ذبح کے وقت بت کا نام لیا جائے۔ زمانہ جاہلیت میں وہ باسم اللات، باسم العزى کہتے
 تھے۔ غیر کے تقرب کی وجہ سے ذبح کرنا ارتداد اور ذبیحہ حرام۔ اس کی وضاحت بھی
 شیخ زادہ میں موجود ہے جس کا مقصد غیر اللہ کے لیے جانور کو خاص کرنا اور اسے محبوب
 سمجھنا ذبح کے وقت بھی یہی ارادہ ہو فمضى قوله وما اهل بلغيا اللہ ما
 ذبح للاصنام والطواغيت قال العلماء لو ذبح مسلم ذبيحة وقصد بها
 التقرب الى غير الله صار مرتداً وذبيحة ميتة (غیر خدا) بتوں شیطانوں
 کے نام ذبح کے وقت استعمال کرنا یا مسلمان کا غیر خدا کو محبوب سمجھ کر اس کا تقرب چاہنا
 یقیناً یا عیب ارتداد و حرمت ہے۔ بات تو اس مسئلہ میں ہے کہ ذبح کے وقت خدا کا
 نام لیا جائے۔ اسی کو محبوب و وحدہ لا شریک لہ سمجھا جائے۔ فقط کسی جانور کے گوشت
 کی تقسیم سے کسی بزرگ کے لیے ایصالِ ثواب مقصود ہو اس میں کوئی قباحت نہیں۔
 یہ مسئلہ علامت حضرت کے ترجمہ سے بخوبی واضح ہے۔

قَالَ تَبَشِّرُوهُنَّ

پھر ملو اپنی عورتوں سے۔ (محمود الحسن)۔
 اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شبِ باشی کرو۔ (مولانا مودودی)
 سو اب تم ان سے ملو ملاؤ۔ (عبدالماجد)
 آپ (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو۔ (فتح محمد)
 پس اب ملا کرو ان سے۔ (شاہ رفیع الدین)
 تو اب ان سے صحبت کرو۔ (اعلیٰ حضرت)

وَلَا تَبَشِّرُوهُنَّ

marfat.com

Marfat.com

اور نہ ملو عورتوں سے (محمود الحسن) تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو (مولانا موودی)

بیویوں سے صحبت نہ کرو (عبدالماجد) ان سے مباشرت نہ کرو (فتح محمد)

اور مت ملو ان سے (شارح الدین) اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ (العلحضرت)

یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور دوسروں میں فرق سمجھنے کے لیے ایک تویہ خیال

کیا جائے عورتوں سے ملو، یا ان سے صحبت کرو یا ان سے شب بانشی کرو۔ ایک ہی معنی

میں استعمال ہوئے ہیں یعنی جماع کرنا۔ نہ ملو عورتوں سے یا ان سے مباشرت نہ کرو۔

یہ اسی پہلے معنی کی نفی ہے یعنی جماع نہ کرو۔ لیکن اعلحضرت کے ترجمہ میں ”صحبت کرو“

پر نفی نہیں کہ ترجمہ یہ ہوتا ان سے صحبت نہ کرو۔ لیکن آپ نے ترجمہ کیا ہے ”اور عورتوں

کو ہاتھ نہ لگاؤ“ وجہ فرق کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ

باشی و ہن میں امر کا تعلق رمضان کی راتوں سے ہے اور ولا تباشروہن

کی نہی کا تعلق اعتکاف سے ہے۔ باشی و ہن کا ترجمہ سمجھنے سے پہلے اصل وجہ نزو

کو ذہن میں رکھیں: عن ابن عباس کانوا علی عہدہ صلی اللہ علیہ وسلم

اذا صلوا العشاء حرم علیہم الطعام والشراب والنساء و فی البخاری عن البراء

کون المنع مقید بالنوم قال الحافظ محتمل ان یکون لا تقید بالحقیقة

انما هو بالنوم و ذکر صلوة لکون ما بعد ما مظنت

النوم غالباً۔ - حاشیہ جلد اولین بحوالہ کمالین -

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم کے زمانہ میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے

بعد کھانا پینا، جماع کرنا منع تھا۔ بخاری شریف میں حضرت برار سے مروی ہے کہ یہ

حکم سونے کے بعد تھا۔ ان دونوں حدیثوں میں محاکمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ حکم حقیقتاً

نیند سے ہی مقید تھا لیکن چونکہ بعد از نماز عشاء عام طور پر سویا جاتا ہے لہذا ایک جگہ

نماز عشاء کا ذکر ہے دوسری جگہ نیند کا۔ لیکن یہ حکم کئی صحابہ کرام کی معذرت پر

منسوخ کر دیا گیا اور جماع کو یا کھانے پینے کو رات میں جائز کر دیا گیا۔ لیکن رمضان کے

دن میں شہوت سے ہاتھ لگانا، بوس دکانا منع نہیں جب کہ انسان کو اپنے آپ پر اکتفا

ہو۔ اموال نہ ہو یا وہ نے صیری سے کام لے کر غلطی نہ کر دے۔ لیکن اعتکاف کی حالت میں جس طرح صحبت کرنا منع ہے اسی طرح اس کے دوائی بھی منع ہیں یعنی شہوت سے ہاتھ لگانا یا یوس و کنار۔ اب اس مسئلہ کی حقیقت جاننے کے بعد دونوں ترجموں میں پھر توجہ کریں۔ یہ مسئلہ صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو گا کہ رمضان شریف میں جماع کی قید کو اٹھایا گیا لیکن اعتکاف کی حالت میں جماع سے اور اس کے اسباب سے بھی ممانعت ہے ۵ ہدایۃ کتاب الصوم میں دیکھیں ولا یأس بالقبلة اذا امن علی نفسه ای الجوارح والانزال ویکرہ اذا لم یامن۔ روزے کی حالت میں جماع یا انزال کی فکر نہ ہو تو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ غلط ہو تو مکروہ ہے (بیشتر طیکہ انزال یا جماع نہ ہو ورنہ دونوں کا حکم علیحدہ لیکن اعتکاف میں کیا حکم ہے ہدایۃ باب الاعتکاف - ویحرم علی المعتکف الوطی لقولہ تعالیٰ ولا تباشروہن وانتم عاکفون فی المساجد و کذا اللمس والقبلة لانه دواعیہ فیصوم علیہ اذہو محظوبہا کما فی الاطمان بخلاف الصوم لان اللفظ یرکنہ لا محظوبہ فلم یتعد الی دواعیہ

حالت اعتکاف میں وطی حرام ہے اور اسی طرح بوس و مس بھی منع ہے جس طرح احرام میں منع ہیں لیکن یہ روزے کا حکم نہیں کیونکہ وہاں جماع سے رکنار کن صوم ہے یہ فرق واضح کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے۔ ارباب ناظرین! خدرا انصاف کریں۔ اسی فقہی فرق پر کون سا ترجمہ دال ہے اور کون سا کوسوں دور ہے۔ اسی پر شیخ زادہ کی عبارت بھی شاہد ہے: واما اذا المسہا بشہوة او قبلھا اذ باشر یا فجمادون الغریح فہو حرام علی المعتکف شہوت کے ساتھ مس اور بوسہ اور بغینہ و تبطن سب ہی معتکف پر حرام ہیں۔

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامِ مَسْكِينٍ ۖ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا (محمود الحسن)
جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں (مومنون)
اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک
مسکین کا کھانا ہے۔ (عبدالماجد)۔

اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے
محتاج کو کھانا کھلائیں (فتح محمد)
اور اوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کی بدلہ ہے کھانا ایک فقیر
کا۔ (شاہ رفیع الدین)

اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دے ایک فقیر کا کھانا (العلحضرت)۔
یہاں روزے کا فدیہ دینے کا ذکر ہے۔ آیا فدیہ وہ شخص دے جو روزہ رکھ
سکتا ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یا کہ حکم ابھی باقی ہے۔ فدیہ دینے کا حکم اس
شخص کو ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس مقام پر العحضرت
کا دوسرا قول ہے۔ یہ ہی زیادہ معتبر ہے اگرچہ پہلے قول کو بھی ذکر کیا گیا ہے :
وعلى الذين لا يطيقونه كلبوا ومرضوا لا يرجي بركه (جلالین)
فدیہ ان لوگوں پر ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے بڑھاپے کی وجہ سے یا
مرض دہی کی وجہ سے۔

حاشیہ جلالین میں اس طرح ہے : قوله على الذين لا يطيقونه واعلم
ان عند اكثر المفسرين فيه قولان احدهما ان المراد بالذين يطيقون
الاصحاء المتقين خیرهم فی ابتداء الاسلام بین الامورین بین
ان یصوموا و بین ان یفطروا و ایفدوا و لا یشق علیهم
لانهم كانوا المیتعون و انما نسخ التمییز و نزلت العزیمتہ بقوله فمن شق
منکم اشهر فلیصم و ثانیہا ان یکون لا یحذو فاهو واقع فی
کثیر من استعمال الفصحاء كما فی قوله تعالی یبئ ان الله نکم

اَنْ تَصِيَلُوْا وَاَنْ تَصِيَلُوْا وَكَانَ الْمُعْفُوْنَ وَهِيَ الذِّمَّةُ لِمَنْ لَا يُطِيقُوْنَ فِدْيَةَ طَعَامِ مُسْكِيْنَ -
 بے شک اکثر مفسرین کے اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس سے مراد وہ
 لوگ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں، صحیح ہوں، مقیم ہوں۔ ان کو ابتداء میں اسلام دواموں میں
 اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا افطار کریں اور فدیہ دیدیں تاکہ ان پر شاق
 نہ ہو کیونکہ ان کو روزہ رکھنے کی پہلے طاقت نہ تھی۔ پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا :
 مِنْ شَهَادَتِكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ - دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں محذوف
 ہے نصیحت کے استعمال میں ایسا کثیر الوقوع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں
 بَيْنَ اسْتِثْنَاءِكُمْ اَنْ تَصِيَلُوْا (یہاں بھی لا محذوف ہے اور معنی ان
 لا تَصَلُوْا ہے)۔ اس مذکورہ آیت میں معنی یہ ہے کہ وَاَنْ تَصِيَلُوْا لِمَنْ لَا يُطِيقُوْنَ
 فِدْيَةَ اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ دیں۔ اسی لفظی والے قول پر ایک اور
 صورت پیش کی گئی ہے۔ قَوْلُهُ يَطِيقُوْنَ قَالَ فِي تَفْسِيْرِ الشَّيْخِ يَطِيقُ
 مَنْ اَطَاعَ فَلَانِ اِذَا سَأَلْتَ طَاقَةَ وَالسُّهْمَةَ لِلسُّلْبِ اِي لَا يَقْدِرُ
 عَلَى الصَّوْمِ يَطِيقُوْنَ بِاِبْنِ اَنْعَالٍ سَعَى حَسْبُ كَالهَمْزِ سَلْبُ كَيْ لِيَةِ آتَا هِيَ - اَطَاعَ
 فَلَانِ كَمَتِّ هِيَ جَبَّ كَسَى كِي طَاقَتُ سَلْبُ هُوَ جَائِزٌ - يِهَاهُ بِي هَمْزِ سَلْبُ كَيْ لِيَةِ هِيَ
 مَعْنَى يِهْ هُوَ كَا كَهْ جَوْرُ وَرُزْهُ رُكْحَنُ كِي طَاقَتُ هِيَ رُكْحَنُ - زِيَادَةُ لِيَنِدِيَهُ قَوْلُ يِهْ هِيَ
 هِيَ كَهْ يِهْ حَكْمُ مَنْسُوْخٍ هِيَ بَلَكُ شَيْخُ فَانِي كَيْ حَقِّ مِي بَاقِي هِيَ -

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّغِيثُ إِلَى نَسَائِكُمْ (پ ۶۲)

حلال کی گئی واسطے تمہارے رات روئے کی رغبت کرنا طرف بیبیوں اپنی کی۔

(شاہ رفیع الدین)

تمہارے لیے روزوں میں راتوں کو اپنی بیبیوں کے پاس جانا حلال ہوا (مومودی لانا وادی
 حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے (محمود الحسن)
 حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے (شاہ عبدالقادر)

روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا۔
روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال ہوا۔ اعلیٰ حضرت

فَلَا رَفَثَ (پ ۲۵)

تو بے حجاب ہونا جائز نہیں (مولانا محمود الحسن)۔

کوئی شہواتی فعل سرزد نہ ہو۔ (مولانا مودودی)۔

تو بے پردہ ہونا عورت سے۔ (شاہ عبدالقادر)

تو (حج کے دنوں میں) نہ عورتوں سے احتلاط کرے۔ (فتح محمد)

تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

ان دونوں مقاموں میں رَفَثَ کا معنی ایک ہی لیا گیا۔ ایک جگہ مثبت، ایک

جگہ منفی۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے مثبت مقام میں جماع معنی لیا ہے کیونکہ عورتوں کے

پاس جانا محاورۃ جماع ہی ہے۔ برخلاف دوسرے مقام کے وہاں صرف جماع

کی نفی نہیں بلکہ عورتوں کے ساتھ صحبت کا تذکرہ بھی منع کیا گیا ہے۔ وجہ فرق کیا

ہے؟ پہلی آیت کی وجہ تو باشی و ہون کے ضمن میں گزر چکی ہے کہ رمضان شریف

میں رات کی قیود کو اٹھایا اور جماع کو حلال کیا گیا۔ اب معنی بے حجاب ہونا یا بے

پردہ ہونا، رغبت کر لیا جانے، یا عورتوں کے پاس جانا کر لیا جانے، ایک ہی صورت

ہے۔ لیکن دوسرا مقام حج کے احکام میں ہے کہ حج میں رَفَثَ منع ہے۔ اب یہاں

صرف جماع منع ہونا کافی نہیں بلکہ عورتوں کے سامنے ذکر صحبت بھی منع ہے۔

مدارک میں ہے: فَلَا رَفَثَ ہوا لجماع او ذکرہ عند النساء الخ

رَفَثَ جماع ہے یا جماع کا عورتوں کے سامنے ذکر کرنا۔ ہدایہ میں بھی رَفَثَ کے

معنی ذکر الجماع بحضرة النساء موجود ہے۔ اسی طرح درمختار میں ہے: یستغنی

عن رَفَثِ الجماع او ذکر بحضرة النساء یعنی رَفَثَ سے بچے۔ رَفَثَ کا معنی جماع

ہے اور اسی طرح عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا۔ علامہ شامی نے

بکھڑا لہجہ پر تحریر فرمایا: قول ابن عباس یعنی حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا منع ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر نظر کی جائے تو یقیناً سمجھ آئے گا کہ آپ نے اس فقہی یاریگی کو مد نظر رکھ کر ترجمہ کیا جب کہ دیگر حضرات اس کو نہ سمجھ سکے۔

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (پہلے)

پھر طواف کے لیے پھر وہاں سے سب لوگ پھریں (مولانا محمود الحسن)
پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں۔ (شاہ عبدالقادر)
پھر بات یہ ہے کہ اے قریشیو! تم بھی وہیں سے پلو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

زمانہ جاہلیت میں قریش کا دستور تھا کہ حج میں یہ عام لوگوں کے ساتھ مقام عرفات پر کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ تکبیر کی وجہ سے یہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ رب قدوس نے ان کو اس طریقہ سے روکا کہ تم بھی لوگوں کے ساتھ ہی ٹھہرو اور وہاں سے ہی لو جہاں سے اور لوگ لوٹتے ہیں۔ تم مزدلفہ ہی سے پلٹ کر نہ آ جاؤ۔ یہ مفہوم اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے بہت واضح ہے جب کہ دیگر تراجم میں اس طرح نہیں کیونکہ دیگر تراجم سے یہ نہیں پتا چلتا کہ یہ حکم قریش کو ہے یا اور لوگوں کو۔

جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: ثُمَّ أَفِيضُوا يَا قُرَيْشُ مِنْ بَيْتِ

أَفَاضَ النَّاسُ أَي مِنْ عَرَفَاتِ بَانَ تَقْفُرَ أَبْهَاتِ بَلْعَرَفَاتِ
مَحْرَمِ أَي مَعِ سَامِرِ النَّاسِ وَكَانُوا لَا يَقْفُونَ
بِعَرَفَاتِ وَكَانُوا يَقْفُونَ بِالْمَنْزِلَةِ تَرْفَعَا
عَنْ الْوَقُوفِ
اے قریشیو! تم بھی وہیں سے (عرفات) سے پلو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ مارکیں بھی ایسے ہی ہے، ہذا امر قریش بالاضافة من عرفات الی جمع وکانوا یقفون

بجمع و سائر الناس بعراقات و يقولون نحن قحطان (سكان) حرمہ فلا نخروج
 میں قریش کو حکم ہے کہ تم بھی عوفات سے پلٹ کر مزدلفہ میں آؤ کیونکہ وہ مزدلفہ میں پھر
 تھے اور دوسرے لوگ عوفات میں ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم چونکہ حرم کے رہنے والے
 ہیں لہذا حرم سے نہیں نکل سکتے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلْمٍ مِنَ الْعَمَامِ (پ ۶۵)

کیا وہ اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں۔ (محمود الحسن)
 کیا لوگ ہی انتظار رکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں (شاہ عبدالقادر)
 یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں
 ان کے پاس آویں۔ (اشرف علی)۔

کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے
 ساتھ لیے خود سامنے آ موجود ہو (مولانا مودودی)۔

یہ لوگ (تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں
 میں آجائے۔ (عبدالماجد)

نہیں انتظار کرتے مگر یہ کہ آوے ان کے پاس اللہ بیچ سالیوں کے بادلوں سے
 (شاہ رفیع الدین)۔

کا ہے کے انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں
 میں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی ترجمہ علامہ حضرت کا تفسیر کے مطابق ہے لیکن دوسرے تراجم میں
 یہ ذکر ہے کہ اللہ آئے، خود سامنے آ موجود ہو۔ سب تراجم اللہ تعالیٰ کی شان کے
 لائق نہیں اور تفسیر کے برخلاف ہیں۔ کسی مفسر نے خود اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر
 نہیں کیا۔ توحید کے دعوے دار شان الوہیت کو سمجھنے میں قاصر ہے: الا ان یاتیم

اللہ ای امہ کقولہ او یاتی امر سبک انی عذابہ فی

ظلل جمع ظلۃ من الغمام السحاب (جلالین)

مگر یہی کہ اللہ کا امر آئے جس طرح دوسرے مقام پر اویا تھی مری بک ہے۔ وہاں بھی اس کا عذاب مراد ہے یعنی اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں: الا ان یاتیم اللہ ای امرہ وباسہ (مدارک) یعنی اللہ کا امر اور عذاب آئے اوان یاتیم اللہ ای یاتیمہ امرہ اوباسہ (بیضاوی) مگر یہی کہ اللہ کا امر اور عذاب آئے

فَاْتَوْا حَرْثَكُمْ اَنْ تَشْتُمُوْا (پتہ ۲)

جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (محمود الحسن)۔

سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (شاہ عبد القادر)۔

تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو۔ (علیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی ایک فرق تو یہ ہے کہ فاتوا، اتیان سے ہے جس کا معنی آنا ہے نہ کہ جانا۔ البتہ اس کے دوسرے معانی میں سے ایک معنی کسی سے گزرتا۔ اس توجیہ سے جانا معنی کیا جائے تو کچھ بات بنتی ہے۔ تاہم یہ وجہ کوئی اتنی اہم نہیں۔ زیادہ جو باعث گرفت بات ہے وہ یہ ہے کہ انی شتم کا معنی۔ جہاں سے چاہو یہ سراسر تمام تفاسیر اور اصول فقہ کی جمیع کتب کے مخالف ہے اس لیے کوئی شخص اردو پر مکمل دسترس رکھنے والا کبھی تائید نہیں کر سکے گا کہ لفظ جہاں کیفیت کا معنی دیتا ہے بلکہ یہ مکانیت کا معنی دیتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو یہ کہنا ہو کہ تو لاہور، کراچی، پشاور، اسلام آباد میں سے جس شہر میں جانا چاہے جاسکتا ہے۔ اسے یہ کہا جائے گا۔ تو جہاں چاہے جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر یہ کہنا مقصود ہو تو سبق یاد کر چاہے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر یا لیٹ کر۔ یعنی جس حال میں چاہے اسی طرح تو یاد کر سکتا ہے مقصود تو سبق یاد کرنا ہے۔ اب اس جملے کو اردو گرامر میں اس طرح بیان کیا جائے، جہاں چاہے سبق یاد کر۔ یہ غلط ہے۔ اردو زبان کی مشہور کتاب فیروز اللغات نے بھی لفظ جہاں کا استعمال اس طرح کیا ہے۔ جہاں۔

جس جگہ جس وقت جس گھڑی۔

اب اس مسئلہ کو سمجھنے کے بعد اصل آیت کے مقصود کی طرف آئیں۔ آیت کریمہ میں اپنی عورتوں سے جماع کا ذکر ہے۔ عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے۔ عربی زبان میں لفظ اتی بمعنی این کے بھی آتا ہے اور کیف کے بھی صرف لفظ اتی کو دیکھنے سے تو دونوں معنی صحیح ہیں۔ لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ اتی بمعنی این (جگہ) کے لینے میں خرابی ہے تو یقیناً یہ ایسی غلطی ہے جس کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ یہودی عورت سے دیر کی طرف سے فرج میں وطی کرنے سے بچے کے بھینگا ہونے کے قائل تھے۔ اس کا رد کیا ہے کہ دیر کی جانب سے وطی فرج میں کرنے سے یہ صورت نہیں۔ اس تفسیر سے اتی کو بمعنی جہاں کے کرنا کیسے صحیح ہے۔ پھر بھی جس طرح ہی معنی کرنا صحیح ہوگا۔

اب اصل مسئلہ سمجھنے کے بعد دیکھیں۔ اسی مسئلہ کو نور الانوار نے اس طرح بیان کیا: مثالہ المشکل قوله تعالى فاتوا حرثكم اني شتم فان كلمته اني مشكل فجئی تاسمة بمعنی من این کما فی قوله تعالى انی لک هذا ای من این لک هذا لریح الا انی کل یوم وتناقض بمعنی کیف کما فی قوله تعالى انی یکون لی غلام ای کیف یکون لی غلام فاشبه مہنا انہ بای معنی هو فان کان بمعنی این یکون المعنی من ای مکان شتم قبلا وحبلا ففعل اللواطة من امرئته وان کان بمعنی کیف فیکون المعنی بایتہ کیفیۃ شتم قائما او قاعدا او مضطجعا فیدل علی تعمیم الاموال دون المعال فاذا تاملنا فی لفظ الحرث علمنا انہ بمعنی کیف لان الدبر لیس بموضع الحرث بل موضع الفرات

اصول فقہ میں اسی کو مشکل کی مثال بنایا گیا ہے فاتوا حرثکم انی شتم۔ اس جگہ کلمہ اتی مشکل ہے۔ کبھی این کے معنی میں آتا ہے جیسا قرآن پاک میں ہی استعمال ہے اتی لک هذا حضرت زکریا نے حضرت مریم سے یہ سوال کیا کہ ہر دن آنے والا رزق

تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے اور کبھی ہی لفظ انی بمعنی کیف کے آتا ہے جس طرح قرآن پاک میں آیا ہے: انی یکون لی غلام حضرت زکریا کو جب بیٹے کی نشأت دی گئی تو آپ نے کہا کہ میرا بیٹا کیسے ہوگا۔ اب مذکورہ مثال میں جب غور کیا کہ کس معنی میں لیا جائے کیونکہ یہاں اشتیاء ہوا۔ دیکھا کہ اگر این کے معنی میں لیا جائے تو معنی یہ ہوگا جس مکان سے چاہو وہی کر سکتے ہو۔ اس طرح قبل اور دبر دونوں مکالوں کا ثبوت ہو گیا۔ اس طرح لواطت ثابت ہوگی۔ اگر بمعنی کیف کے لیں تو معنی یہ ہوگا جس طرح چاہو، کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر۔ یہ معنی عموم احوال پر دال ہوگا۔ لیکن عموم محلّیت پر دال نہیں ہوگا۔ اب تامل کیا کہ لفظ حرث کا استعمال بمعنی کھیتی کے ہے تو خود واضح ہوا کہ جس طرح کے معنی میں لینا ہی درست ہے اس لیے کہ مقام پیداوار قبل ہے نہ کہ دبر بلکہ دبر تو فقط ایک گندگی کا مقام ہے۔ اسی طرح مدارک میں ہے: فالقوا حرثکم انی شتمتہ جامعوہن مق شتمتہ او کیف شتمتہ بارکۃ او مستلقیۃ او مضطجعة۔ ان سے جب چاہو جس طرح چاہو جماع کرو خواہ وہ حالت بروک، استقامت یا اضطجاع ہو۔ جلالین میں ہے: فالقوا حرثکم ای محلتہ و هو القبل انی کیف شتمتہ من قیام و قعود و اضطجاع و اقبال و ادبار منزل رد القول الیہود من انی امرتہ فی قبلہما من جہتہ دبرہا جاء الولد احوال جماع فرج میں ہی ہو جس طرح چاہو حالت قیام ہو یا قعود و اضطجاع ہو۔ خواہ آگے کی جانب سے یا پیچھے کی جانب سے ہو۔ یہود کا رد کیا گیا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ اگر پھلی جانب سے جماع ہو تو بچہ احوال ہوگا۔ اب یہاں سے بھی واضح ہوا کہ صحیح معنی جس طرح ہے۔ اگر معنی جہاں کیا جائے تو ساری توجہات باطل ہوں گی۔ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا کہ یہ معنی جہاں والا کرتا قلط ہے۔

و للمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین (پہ لفظ)
 اس آیت کریمہ کے ترجمہ میں اعلیٰ حضرت پر بہت اعتراض کیا گیا ہے۔ جس انداز پر
 زبان استعمال کی گئی وہ اور اعتراض کی پوری تفصیل بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کو جواب
 سمجھنے میں دقت درپیش نہ آئے۔

معرض کی بحث دیکھنے کے بعد تبصرہ تفاسیر کے آئینے میں دیکھیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر معرض کی بحث: طلاق شدہ عورت (عنوان) البقرہ میں

طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے طلاق شدہ عورتوں کے ساتھ حسن
 سلوک کرنے اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا حکم بطور یاد دہانی کے مکرر

فرمایا اور کہا: و للمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین

اس جگہ مترجم حضرات نے متاع بالمعروف کا ترجمہ، کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا (تھانوی)
 فائدہ دینا سا تھا اچھی طرح کے (شاہ رفیع الدین) خرچ دینا ہے موافق دستور کے
 (شاہ عبدالقادر) کپڑے کے جوڑے وغیرہ سے کچھ سلوک کرنا (ڈپٹی تدیر احمد) کیا تاکہ
 اس آیت میں طلاق شدہ عورتوں کے حقوق واجبہ اور اخلاقی حسن سلوک کی تمام صورتیں
 شامل ہو جائیں۔ وہ صورتیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مہر مقرر تھا اور اب خلوت و طلاقات کے بعد طلاق دے دی گئی تو اب عورت کو

پورا مہر دیا جائے گا۔ اور تا عدت نان و نفقہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

۲۔ مہر مقرر نہ تھا اور خلوت کے بعد طلاق دے دی گئی تو اب مہر مثل واجب ہوگا۔

اور عدت کا نان نفقہ بھی۔

۳۔ مہر مقرر تھا اور خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اب آدھا مہر واجب

ہوگا۔

۴۔ لڑکی صغیرہ اور ناقابل خلوت ہے یا قابل خلوت ہے مگر خلوت

نہیں ہوئی تو اب اسے کپڑا ایک جوڑا دینا واجب ہوگا اور اس پر عدت نہ

ہوگی۔ ان تمام صورتوں میں عورت کو فائدہ پہنچانا صادق آتا ہے کہیں پورے مہر کی صورت کہیں مہر مثل کی صورت میں اور کہیں آدھے مہر کی صورت اور آخری مسئلہ میں صرف ایک جوڑا کپڑے دینے کی صورت میں۔

اس آیت مذکورہ میں تمام صورتیں شامل ہیں اور قرآن کریم نے اس کے لیے ایک عام لفظ (متاع بالمعروف) استعمال کیا ہے لیکن مولانا احمد رضا خاں صاحب نے متاع بالمعروف کا ترجمہ یہ فرمایا ہے "اور طلاق لینے والیوں کے لیے بھی مناسب نان نفقہ ہے یہ واجب ہے پر مینر گاروں پر"۔ خاں صاحب کے ترجمہ کے مطابق مذکورہ چوتھی صورت بھی آیت کے حکم (نان نفقہ) میں شامل ہے کیونکہ وہ بھی طلاق والیوں میں شامل ہے حالانکہ یہ وہ طلاق والی ہے جس پر عدت واجب نہیں تو پھر شرعی نان نفقہ کید بطور حسن سلوک کے صرف کپڑے کا ایک جوڑا دینا کافی ہے ہو سکتا ہے کہ مولینا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرہوم نے پیروی کی ہے لیکن بقول رضا خانی حضرات کے جس مجتہد و فقیہ بے مثال نے فتاویٰ رضویہ کے نام سے بارہ ہزار صفحات پر مشتمل فقہی مسائل کا خزانہ امت کے لیے چھوڑا ہو اس کی نظر آیت پاک کی اس باریکی کی صورت کی طرف کیوں نہیں گئی اور آیت کے مفہوم کو ایک صورت میں خالص کر کے آیت کی حقیقی روح کو بے اثر کر دیا۔ اس پر تعجب ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عبد القادر صاحب کا مختصر تفسیری حاشیہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ قرآن فہمی کی خداداد صلاحیت کیا چیز ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں۔ پہلے خروج فرمایا تھا یعنی جوڑا اس طلاق پر کہ مہر نہ ٹھہرا ہو اور ہاتھ نہ لگایا ہو۔ یہاں سب پر حکم فرمایا، سب طلاق والیوں کو جوڑا دینا بہتر ہے اور اس پہلی کو ضرور ہے۔ شاہ صاحب بتانا چاہتے ہیں کہ طلاق شدہ عورت کو مہر واجب کے ساتھ ساتھ کپڑے کا جوڑا دینا بھی مستحسن ہے تاکہ علیحدگی کے باوجود آپس میں صلح و احسان کے جذبات موجود رہیں۔ اور پہلی صورت میں یہ جوڑا دینا اور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا ضروری ہے۔ امید کی جاسکتی تھی کہ محشی مرہوم اس آیت پر تشریحی نوٹ لکھ کر مسئلہ

کو صاف کرتے لیکن مرحوم محنتی بھی یہاں سے صاف پتہ کھل گئے اور قرآن کریم کی ایک فقہی آیت کا ترجمہ تشنہ رہ گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ خاں صاحب مرحوم کے ترجمہ کا علمائے دیوبند کے تراجم اور تفاسیر سے موازنہ کر کے اپنے رضا خانی بھائیوں کو تکلیف پہنچاؤں لیکن جو حضرات علمی مسائل کو علمی مسائل کی نظر سے دیکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ حضرات شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ اور مولانا اشرف علی خاں صاحب مٹھانوی کی بیان القرآن اور مولانا عبدالحق صاحب خفانی کی تفسیر خفانی کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان حضرات نے ایقرہ کی قانونی آیات طلاق کو قانونی اسلوب و انداز میں کس سلیقہ سے واضح کیا ہے اور کنز الایمان ان تفاسیر کے مقابلہ میں ایک سطحی اور طالب علمانہ تفسیر نظر آتی ہے۔ (معرض کی بحث ختم)

تبصرہ

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت پر یہ اعتراض کرنا کہ آپ فقہ کی باریکیوں سے بے خبر ہیں، خود معرض صاحب نے جو چوتھی صورت مطلق ذکر کی ہے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔ وہ محل نظر ہے کیونکہ لڑکی صغیرہ اور ناقابلِ خلوت ہے اور مہر مقرر تھا تو طلاق کی صورت میں نصف مہر ہے صرف جوڑا کیڑوں کا دینا کافی نہیں۔ ہاں اگر مہر مقرر نہ ہو تو یہ صورت ہے لیکن معرض صاحب نے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔ اسی طرح ہی دو صورتیں اس عورت میں بھی ہیں جو قابلِ خلوت تو ہے لیکن اس کو طلاق قبل از خلوت دیجائے تو مہر مقرر ہونے کی صورت میں نصف مہر اور مہر کے مقرر نہ ہونے کی صورت میں متعہ کیڑوں کا جوڑا، لیکن معرض صاحب کی عبارت سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ صغیرہ لڑکی کو مہر حال میں کیڑوں کا جوڑا دیا جائیگا حالانکہ مہر کے مقرر ہونے کی صورت میں یہ غلط ہے: وان تزوجھا ولم یسم لہا مہرا او تزوجھا علی ان لا مہر لہا فلہا مہر مثلہا ان دخل بہا او مات عنہا ولو طلقھا قبل الدخول بہا فلہا المتعہ البیہا اگر نکاح کیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا یا نکاح ہی اس شرط پر کیا کہ مہر نہیں دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اس عورت کو طلاق دخول

کے بعد دی گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو اس عورت کو مہر مثل دیا جائے گا۔ فوت ہونے کی صورت میں دخول عدم دخول کی قید نہیں۔ اگر اسی صورت میں یعنی مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا یا مہر کی نفی کر دی گئی تھی تو طلاق دخول سے پہلے دیدی گئی تو کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہوگا۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ معترض صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ میں نے اپنے ہی حضرات کے تراجم اور تفاسیر کو دیکھا جو اردو زبان میں ہیں کیونکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے مولانا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرہوم نے پیروی کی ہے۔ یہ اعتراف حقیقت ہے جس کی وضاحت ابھی آتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کا فقہی مسائل سے تعلق ہے جس کا اعتراف معترض صاحب نے بر ملا کیا ہے۔ لہذا فقہی مسائل کی تفسیر احناف کی پیش کردہ ہی فقہ حنفی میں معتبر ہوگی۔

آئیے احناف کی معتبر تفسیر مدارک کو دیکھیں۔ آپ نے اس طرح تفسیر کی :

والمطلقات ستاع ای نفقة العدة کہ متاع سے مراد عدت کا نفقہ ہے اب یہ کہنا کہ یہ ترجمہ جو فقہی صورت کو شامل نہیں کہ وہاں عدت نہیں۔ یہ فقہی باریکی سے بخیر ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے جب کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر مدارک کے عین مطابق ہے۔ تو جب یہ کہا جائے گا کہ کنز الایمان ایک طالب علمانہ تفسیر ہے تو اس سے یہ کہنا خود بخود لازم آئے گا کہ مدارک بھی ایک طالب علمانہ تفسیر ہے لیکن ایک ایسے محقق و مدقق کو طالب علم کی حیثیت دینا جن کی کتاب منار اور کنز الدقائق کو درس نظامی کے کورس میں داخل کیا ہوا ہے یہ سورج کے سلسلے میں منہ چڑھانے کے مترادف ہے۔ اور اپنی جہالت و حماقت کا اعتراف کرتا ہے۔

اور اگر مطلقاً کچھ نفع دینا معنی کیا جائے تو اس میں تکرار ہے کیونکہ وہ عورت جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا اور خلوت بھی نہیں اس کو متعہ رکپڑوں کا جوڑا دینا تو مالسم تسوہن او تغنن منہن من ریضتہ و متعہن میں آچکا ہے۔ یہ پھر تکرار ہے۔ اسی وجہ سے حاشیہ جلالین میں ہے و فی صاحب المدامک المتاع بنفقة

العدة فلا تكراسا یعنی صاحب مدارک نے متاع کا معنی عدت کا نام نفقہ لیا ہے لہذا اس میں کوئی تکرار نہیں۔ تفاسیر کے مطالعہ سے تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہوتی ہے۔ لیکن جس شخص کے علم کا محور شیخ الحدیث کا تفسیری حاشیہ اور بیان القرآن اور تفسیر حقانی ہو وہ نہ سمجھ سکے تو کوئی اعتراض بھی نہیں کیونکہ کم علم کو معذوری سمجھنا چاہیے۔ البتہ جہل مرتب کے حامل کو سمجھنا بھی ممکن نہیں لیکن اگر ضد اور عناد کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کی طرف آنا ہو تو معتبر تفاسیر کی عبارات کو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید پر پیش کر رہا ہوں تاکہ حق راہ نظر آئے اور محققین کو طالب علمانہ حیثیت دینے کی حماقت کرنے سے اجتناب کیا جائے ورنہ ان مفسرین کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اور اپنی حماقت ثابت ہو جائے گی۔

البحر المحیط میں ہے: وقيل المراد بالمتاع ههنا نفقة العدة متاع سے مراد عدت کا نفقہ ہے۔ یہاں سے بھی پتا چلا کہ نام نفقہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کا ہی نہیں بلکہ اس میں اور ارباب تفسیر بھی شریک ہیں۔ الجاحم الاحکام القرآن نے بھی اختلاف بیان کرتے ہوئے معترض صاحب کی چوتھی صورت کو ایک قول میں خارج کیا ہے۔ الجاحم کی عبارت کو ملاحظہ کریں: وقال عطاء ابن سباح وغيره هذه الايتة في المشيات اللواتي قد جو معن اذ تقدم في غير هذه الايتة ذكروا بيت للنتعة اللواتي لم يدخل بهن عطار وابن رباح وغيره نے کہا ہے کہ یہاں ان عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا ہو، ثیبہ ہوں۔ اس لیے کہ جن عورتوں سے دخول نہیں ہوا ان کے متعہ کا پہلی آیت میں ذکر آچکا ہے تفسیر منظر میں ہے: قيل المراد بمتاع في هذه الايتة نفقة ايام العدة كما هو المراد فيما سبق من قول تعالى وصية لهن واجهن متاعا الى الحول بجماع في كذا الصورتين الموت والطلاق محبوسة لحقوق الزوج فيجب الاغفار و ناع سے مراد زمانہ عدت کا نام و نفقہ مراد ہے جیسا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے قول وصية لهن واجهن متاعا الى الحول میں عدت کے نام و

نفقہ کا بیان ہے۔ دونوں صورتوں یعنی موت و طلاق میں وجہ جامع یہ ہے کہ عورت چونکہ دورانِ عدت اپنے آپ کو حقوقِ زوج میں پابند رکھتی ہے اس لیے خاوند کے مال سے اس کا نفقہ لازم ہے۔ اسی طرح روح المعانی میں ہے وقیل المساد بالمتاع نفقۃ العدة متاع سے مراد عدت کا نان و نفقہ ہے۔

ناظرینِ کرام! آپ نے مذکورہ بالا احادیث سے سمجھ لیا ہو گا کہ اس آیتِ کریمہ میں متاع کا ترجمہ نان و نفقہ کرنے میں اعلیٰ حضرت متفرق نہیں بلکہ اکابرینِ مفسرینِ کرام کے اقوال بھی موجود ہیں۔ اب مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے جوشِ عقاد کی وجہ سے جنبشِ قلم کی زد میں اکابرینِ مفسرینِ کرام کو لپیٹنا کہاں کا انصاف ہے۔ میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔ یہ کہنا "کہ ہو سکتا ہے کوئی ترجمہ ایسا ہو" اس سے پہلے تفاسیر کو دیکھ لیا جائے تاکہ بعد میں خود ہی صیاد اپنے دام میں نہ پھنس جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق ہے لیکن اس کی تعریف کر دی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض۔ یہ انصاف سے بعید ہے۔ خیال کریں، مناسب نان و نفقہ یا خرچ دینا ہے موافق کئے دستور کے، ان میں کتنا فرق ہے۔

وَ الْاَهْلَةَ وَ لِاِسْتِغَاةٍ (پ ۲۶)

اور نہ آشنائی اور نہ سفارش (محمود الحسن)
نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ (مولانا مودودی)
اور نہ دوستی اور نہ سفارش (عبدالمجاہد)۔

اور نہ آشنائی سے اور نہ سفارش (شاہ عبدالقادر)۔

اور نہ دوستی اور نہ سفارش ہو سکے۔ (فتح محمد)۔

اور نہیں دوستی اور نہیں سفارش۔ (شاہ رفیع الدین)

نہ (کافروں کے لیے) دوستی اور نہ شفاعت۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں دوستی اور شفاعت کو کافروں کے ساتھ منحصر کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے ترجمہ میں عام طور پر نفی کی گئی ہے جس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ مسلمانوں کی شفاعت ہو سکے گی یا نہیں۔ آئیے تفاسیر کی نظر میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو روز روشن کی طرح عیاں ہو گا کہ جس مسئلہ کو تفاسیر نے اعتراضات و جوابات کی شکل میں پیش کیا ہے اعلیٰ حضرت نے اس کو ایک لفظ کی زیادتی سے بیان فرما دیا ہے۔

ولا خلة صداقة تنفع (جلالین) دوستی نہیں ہوگی جو کسی کو قیامت میں نفع پہنچائے۔ قوله صداقة تنفع لان الخلة لا تنفع يوم القيمة بين الاخلاء

الابوين المتقين لقوله تعالى الاخلاء يومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقين (حاشیہ جلالین) دوستی کسی کے لیے قیامت میں نفع مند نہیں ہوگی سوائے رہبر گاروں کے۔ کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہونگے سوائے متقین کے: ولا شفاعة بغیر اذنہ و هو يوم القيمة (جلالین) اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر قیامت کے دن کسی کو شفاعت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ قوله بغیر اذنہ هو جواب سوال کیف یصم نفی الشفاعة

على سبيل الاستغفار وقد ثبتت شفاعته الانبياء يوم القيمة بالاحادیث كحديث السن سألت النبي صلى الله عليه وسلم ان يشفع لي يوم القيمة فقال انا فاعل حسبه الترمذی وايضا حمان الايته مقيدا لا من اذن له الرحمن و معنى له قول النبي ما ذون له ولا وليمنا ذن فيودن (جمل) منسخر رحمة اللہ علیہ نے بغیر اذنہ کی قید کا کیوں اضافہ

کیا؟ اس لیے کہ یہ ایک سوال متقدر کا جواب ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ مطلقاً شفاعت کی نفی کیسے کی گئی ہے کہ کسی کو کسی کی شفاعت کام نہیں آئے گی حالانکہ حدیث پاک انبیائے کرام کی شفاعت کا ثبوت ہے کہ ان کو قیامت کے دن یہ حق حاصل ہوگا جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال

کیا کہ قیامت کے دن آپ میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ میں شفاعت کروں گا۔ (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے)۔

واضح ہوا کہ آیتِ کبریٰ مقید ہے کہ جس کورب کی طرف سے اجازت ہوگی اور رب نے جس کی بات کو پسند کیا وہ شفاعت کر سکے گا۔ اسی وجہ سے انبیائے کرام کو شفاعت کی اجازت ہوگی۔ اگر انبیائے کرام شفاعت کی اجازت طلب کریں پھر بھی ان کو اجازت دی جائے گی لیس لا حدان یشفع عنده الا باذنہ وهو بیان ملکوتیہ کبریٰ بیان احد الامتک ان یتکلم یوم القیمة الا اذا اذن له فی الکلام وغیرہ۔ (مدارک) کسی ایک کورب کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور اس کی کبریائی کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن کسی کو اس کی اجازت کے بغیر اس سے کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس سے کافروں کا رد کیا جا رہا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے بڑے ہمای سفارش کریں گے۔ یہاں سے بھی واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہیں وہ سفارش نہیں کر سکتے۔ والشفاعة ثابتة للمرسول والاعیاس فی حق اهل البیاتر بالمستغنیض من الاعیاسی خلافا للعبزلة (شرح عقائد رسول اور اخبار کو شفاعت کا حق گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے اخبار مشہورہ سے ثابت ہے اس میں معتزلہ کا خلاف ہے۔ قولہ علیہ السلام قولہ علیہ السلام شفاعتی کل الکبائر من امتی وهو مشہور باب الحدیث فی باب الشفاعة متواتر (شرح عقائد نبی کریم کا ارشاد کہ میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے بھی ہوگی یہ حدیث مشہور ہے بلکہ احادیث شفاعت متواترۃ المعنی ہیں والاعیاس مراد کون لوگ ہیں نیز اس میں ہے: وہ المملکت والصلحاء والشهداء وہ فرشتے اور نیک لوگ اور شہید لوگ نیز اس کے اسی مقام پر حاشیہ میں ہے:

قال الغزالی اعلم انه اذا حق دخول النار على طوائف من المومنين فان
 الله تعالى بفضل يقبل فيهم شفاعته الانبياء والصدیقین بل شفاعته
 العلماء والصالحين وكل من له عند الله تعالى جاه وحسن معاملة
 فان له شفاعتی اهل وقرابتہ وصدقائه ومعاصمہ فكن حريصاً على ان
 تكتب لنفسك عند هدم مرتبة الشفاعته علامہ غزالی فرماتے ہیں جب یہ حقیقت
 ہے کہ مومنوں کا ایک گروہ (گنہ گار) جہنم میں جائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے
 فضل سے ان کے لیے انبیاء اور صدیقین کی شفاعت قبول فرمائے گا بلکہ علماء اور
 نیک لوگ، ہر وہ شخص جو اللہ کا مقرب ہے اور اس کا معاملہ ہے اللہ تعالیٰ سے ان کی طرف
 سے یہ حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے اہل اقربا، احباب اور اپنی شناخت والے لوگوں
 کی شفاعت کر سکیں۔ لہذا اسے عام مخاطب ابھی ان کے ہاں اپنی ذات کے لیے
 مرتبہ شفاعت حاصل کرنے میں حریص ہو جائے۔ شفاعت کا ذکر احادیث میں بہت
 بساطت سے کیا گیا ہے یہاں تو مختصر کے پیش نظر اس پر بحث نہیں کی جا رہی اور
 یہی باب ایک ضخیم کتاب کو مستلزم ہے۔ ایک مختصر حدیث پر اکتفا کیا جاتا ہے: عن
 عثمان بن عفان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يشفع يوم القيمة
 ثلثة الانبياء ثلثة العلماء ثلثة الشهداء (سواہ ابن ماجہ)
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن تین حضرات انبیائے کرام
 علماء، شہداء و شفاعت کریں گے۔ تین کا ذکر اتفاقاً ہے۔ ان تین میں انھما نہیں:
 شافعا و مشفعا تو آپ نماز جنازہ میں بچوں کے لیے دعائیں بھی پڑھتے ہیں جہاں
 ان کی شفاعت کرنا اور مقبول ہونے کی خود دعا کرتے ہیں۔ اب حقیقت حال واضح
 ہو چکی ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں کیا خوبیاں پہاں ہیں۔

فَبِهِتَ النَّيِّ كَفَرَ (پ ۴)

تب حیران رہ گیا وہ کافر (محمود الحسن)

marfat.com

Marfat.com

یہ سن کر وہ متکبر حق ششدر رہ گیا۔ (مولانا مودودی)۔

اس پر وہ جو کافر تھا ذنگ رہ گیا۔ (عبدالماجد)۔

اس پر تختہ زہ گیا وہ کافر۔ (مولانا اشرف علی)۔

تب حیران رہ گیا وہ منکر۔ (شاہ عبدالقادر)۔

یہ (سن کر) کافر حیران رہ گیا۔ (فتح محمد)۔

تو ہوش اڑ گئے کافر کے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرود کو لاجواب کرنے کا ذکر ہے کیونکہ جب فرود کو آپ نے یہ فرمایا کہ میرا اللہ تعالیٰ تو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس نے دو قیدیوں کو بلا کر نرے موت پانے والے کو پری کر دیا اور پری ہونے والے کو قتل کر دیا۔ کہا اگر میں ایسا نہ کرتا تو قتل ہونے والا زندہ رہتا اور زندہ رہنے والا قتل ہو جاتا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس غبی کی حماقت کو دیکھا کہ سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہے تو آپ نے دوسری دلیل پیش فرمادی کہ میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور تو مغرب سے نکال۔ وہ کافر جواب دینے سے عاجز آ گیا۔ اسی بات کو رب قدوس نے فہمت الذی کھن سے ذکر فرمایا۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ ترجمہ کرتا کہ کافر حیران رہ گیا، ششدر رہ گیا، ذنگ رہ گیا۔ یہ اس لیے مقصد کو مکمل طور پر واضح نہیں کر رہا کہ اردو زبان میں لفظ حیران کبھی مقام پر بھی بولا جاتا ہے جیسے کبھی خوب صورت مقام کو دیکھ کر کہا جاتے ہیں اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہاں تو معنی لاجواب ہوتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تو ہوش اڑ گئے کافر کے یہ صرف اسی معنی کو شامل ہے کہ وہ جواب دینے کی ہمت نہ کر سکا تحیر و حشر (دارک، جلالین) تفاسیر نے بھی متحیر و مدہوش کیا۔ یعنی اس کے ہوش اڑ گئے۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (پ ۳۴)

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا۔ (محمود الحسن)۔
 شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگی کا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو فقر کا۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 اس مقام پر مقصد کے قریب اور تفاسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ نظر آتا ہے
 یعنی کہ یہ ان تفتقر ان تصدقتم فتمسکوا (جلالین) وہ تمہیں خوف دلاتا
 ہے اگر تم نے صدقہ دیا تو محتاج ہو جاؤ گے۔ لہذا اپنا مال اپنے پاس ہی محفوظ
 رکھو۔ یعدکم بالانفاق الفقر ویقول لکم ان عاقبة انفاقکم ان تفتقروا
 والوعدیستعمل فی الخیر والشر (مدارک) شیطان تمہیں
 خرچ کرنے سے ڈراتا ہے محتاجی سے اور تمہیں کہتا ہے کہ تمہارے خرچ کرنے کا
 انجام تمہارا محتاج ہونا ہے۔ اس سے آگے ایک ضابطہ کی طرف اشارہ کیا کہ وعدہ کا
 لفظ خیر اور شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی اگر خیر ہی استعمال ہو تو ثواب اور
 اچھائی کی امید دلاتا، اور شر میں استعمال ہو تو مجنی و عید ہوگا یعنی ڈرانا۔ اس سے
 پتا چلا کہ ”شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا۔ یہ معنی بہ نسبت ”وعدہ دیتا ہے“
 کے زیادہ ادراک کے قریب ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ مقام شر ہے اس لیے
 اندیشہ دلاتا، ڈرانا معنی کرتا ہی حقیقت ہے

أَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ (پ ۳۴)

یا قبول کرو گے کوئی منت۔ (محمود الحسن)۔
 یا قبول کرو گے کوئی منت۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 یا منت مانو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

نذر، ممتت کو قبول کرنا۔ عام اردو محاورہ وصول کرنے کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں پورا مفہوم ما قبل کا اور ان الفاظ مبارکہ کا یہ ہے۔ اللہ کی راہ میں جو مال تم خرچ کرو (زکوٰۃ، صدقات) یا نذر مانو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے (تمہیں خبرا دیگا) اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔ ظالموں سے مراد زکوٰۃ نہ دینا، نذر کو پورا نہ کرنا یا مال ناجائز کاموں میں خرچ کرنا یا معاصی کی نذر ماننا۔

اب اس وضاحت کے بعد تفاسیر کو دیکھیں: او نذرتکم من نذر بشرط اور بغیر بشرط فی طاعتہ او معصیتہ فان اذکہ یعلمہ فیجاز بیکم علیہ یعنی تم کوئی نذر مانو بشرط سے متعلق ہو یا نہ ہو، خواہ نذر نیک کام کی ہو یا بد کی اللہ تعالیٰ اس کا اسی کے مطابق بدلہ دیگا اور نذرتکم من نذر فی طاعتہ اذکہ او فی معصیتہ فان اذکہ یعلمہ لایخفی علیہ معصیتہ (مبارک) یعنی کوئی نذر تم مانو نیک کام میں ہو یا معصیت میں، اللہ پر مخفی نہیں وہ تمہیں اس کا ایسا ہی بدلہ دے گا۔

اب بخوبی واضح ہوا کہ ممتت ماننا معنی اس مقام کے مناسب ہے، ممتت قبول کرنا مناسب نہیں۔

وَاصْطَفٰی عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ (پ ۳۰)

اور جہان کی عورتوں کو منتخب کیا ہے۔ (فتح محمد)۔

اور برگزیدہ کیا تم کو اوپر عورت عالموں کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر۔ (محمود الحسن)۔

اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔

(مولانا مودودی)۔

اور آپ کو دنیا جہان کی عورتوں کے مقابلہ میں برگزیدہ کر لیا ہے۔ (عابد الماجد)

اور تمام جہان کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے۔ (مولانا اشرف علی)

اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے (شاہ عبدالقادر)۔
 اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 یہاں حضرت مریم علیہا السلام کو خطاب ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں لفظ ”آج“
 کی زیادتی ہے جو بظاہر وہم و غم واقع ہوتا ہے۔ اس کا تفسیر نے بھی ازالہ کیا اور اس وہم
 کے ازالہ کے لیے تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت نے بھی ایک لفظ کی زیادتی کی۔ وہ یہ وہم
 ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت کیسے حاصل ہے حالانکہ حضرت
 فاطمہ اور حضرت عائشہ پر حضرت مریم کو فضیلت حاصل نہیں۔

اس کا جواب دیا گیا ہے اے اہل نعمانک (جلالین) یعنی تمہیں اپنے زمانے کی
 عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی مقام پر جلالین کے حاشیہ پر وضاحت موجود ہے۔
 واصطفتك على نساء العالمين اى بان وهب لك عيسى من غير اب
 وليرى ذلك لاحد من النساء هذا وان كان من خصائص مريم عليها
 السلام لكنه لا يلزم من هذه الفضيلة افضيلتها مطلقا على فاطمة بنت
 محمد صلى الله عليه وسلم وعائشة زوجة النبي صلى الله عليه
 وسلم ففاطمة وعائشة رضى الله عنهما افضل نساء العالمين
 من الاولين والآخرين۔ كما هو المذهب المحقق عند العلماء يعنى مفسر
 الرہمتی نے اہل زمانک کے الفاظ کو کیوں زیادہ کیا۔ اس لیے کہ حضرت مریم کو بغیر باپ
 کے حضرت عیسیٰ کا عطا ہونا اگرچہ آپ کی خصوصیت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا
 کہ آپ کو مطلقاً حضرت فاطمہ بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ زوجة النبی صلی
 اللہ علیہ وسلم پر بھی فضیلت حاصل ہو۔ اگرچہ یہ خصوصیت تو ان دونوں کو حاصل نہیں لیکن
 ان دونوں کو کثیر فضائل حاصل ہیں جو احادیث مبارکہ میں وارد ہیں جو فضائل حضرت
 مریم میں نہیں پائے جاتے پس فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کو تمام جہان کی عورتوں
 پر فضیلت ہے۔ اس پر علماء کی تحقیق و اتفاق موجود ہے۔ یہ وجہ تھکی جس کا مفصل
 بیان اعلیٰ حضرت کے ایک لفظ سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر مطلقاً عام تراجم کی طرح

ترجمہ کیا جاتا تو اعتراض کا اندفاع ممکن نہیں تھا۔

نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ (پ ۳۳، پ ۳۵)

ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کی۔ (محمود الحسن)۔ ہم اللہ کے مددگار ہیں (مودی)
ہم ہیں اللہ کے مددگار (عبدالماجد)۔ ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے (شاہ عبدالقادر)
کہ ہم ہیں مدد دینے والے اللہ کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر کیا جا رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کون شخص ہے جو اللہ کے دین میں میری مدد کرے گا۔ آپ کے حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے دین کی مدد کریں گے۔ اب اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کرتا کہ ہم ہیں اللہ کی مدد کرنے والے۔ یہ نظام بہت بڑی غلطی کا عام آدمی کے لیے سبب بن جاتا ہے کیونکہ عام لوگ صرف ترجمہ کو دیکھ کر خود بخود مطالبہ حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جو یقیناً اس سے مطلب حاصل کریں گے کہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ بھی مدد کا محتاج ہے لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے ”ہم دین خدا کے مددگار ہیں“ تو اس میں یہ وہم نہیں ہوتا بلکہ مطلب صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دین خدا کے پھیلانے میں مدد کرنے کا ارشاد فرمایا اور اسی کا انھوں نے جواب دیا کہ ہم دین خدا کے مددگار ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی تفسیر بھی واضح کرتی ہے: نحن انصار اللہ اعوان دینہ (مدارک) ہم اس کے دین کے مددگار ہیں۔ بعینہ ان الفاظ سے ہی جلالین میں تفسیر کی گئی ہے۔

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمَاكِرِينَ (پ ۳۳)

اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا مکر سب سے بہتر ہے۔ (محمود الحسن)۔

فریب کیا ان کافروں نے اور فریب کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے

بہتر ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

(یعنی یہود قتل عیسیٰ کے بارے میں) ایک چال چلے اور خدا بھی (عیسیٰ کو بچانے

کے لیے) چال چلا اور خدا خوب چال چلنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔

اور مکر کیا انہوں نے یعنی کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ بہتر مکر

کرنے والا ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ

سب سے بہتر تدبیر والا ہے (المحضرت)

اس آیت کریمہ کا ترجمہ کرتے وقت عام مترجمین نے اس مقام کی تراکت کو نہیں

سمجھا اور براہ راست مکر، فریب، دھوکا، دغا، داؤ جیسے الفاظ کی نسبت ربّ قدس

بے غیب ذات کی طرف کر دی۔ عام انسان جو مفسرین کرام کے نکات سے بے خبر ہے

ضروریہ سمجھے گا کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ مکار، دھوکا باز وغیرہ ہے (معاذ اللہ) اسی وجہ

سے مفسرین کرام نے اس مقام پر نہایت غور و فکر کے بعد بتایا کہ یہاں مکر کی نسبت

اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہے: **وَمَكَرَ اللَّهُ عِبَارَةً عَنِ الْاِحْتِيَالِ فِي الْاِصْطِلَاقِ الشَّرِّ**

وَالْاِحْتِيَالِ عَلَى اِنَّهُ تَعَالَى مَحَالٌ فَصَارَ لِفِعْلِ الْمَكْرِ فِي حَقِّهِ مِنَ الْمَتَشَابِهَاتِ

وَذَكَرَ وَافِي تَاْوِيْلِهِ وَجْهًا اَحَدًا اِنَّهُ تَعَالَى سَمِيَّ جَزَاءِ الْمَكْرِ مَكْرًا كَقَوْلِهِ تَعَالَى وَجْهًا

سَمِيَّةً سَمِيَّةً مِثْلَهَا سَمِيَّ جَزَاءِ الْمَخَادَعَةِ بِالْمَخَادَعَةِ وَجْهًا اَلَا سَمِيَّةً بِالْاِسْتِهْزَاءِ

وَالثَّانِي اَنْ مَعَامَلَتَا اِنَّهُ مَعَهُمْ كَانَتْ شَبِيْهَةً بِالْمَكْرِ فَسَمِيَّ بِذَلِكَ - وَالثَّلَاثُ

اَنْ هَذَا الْفِعْلُ لَيْسَ مِنَ الْمَتَشَابِهَاتِ لِاِنَّهُ عِبَارَةٌ عَنِ التَّدْبِيْرِ الْمَحْكَمِ

الْكَاثِلِ شَمَّا اَخْتَصَّ فِي الْعَرَفِ بِالتَّدْبِيْرِ فِي الْاِصْطِلَاقِ الشَّرِّ اِلَى الْغِيْبِ وَ

ذَلِكَ فِي حَقِّ اِنَّهُ تَعَالَى غِيْبٌ مَمْتَنِعٌ اَوْ اِنَّهُ اَعْلَمُ

اعتراف یہ ہوا کہ مکر کا معنی ہوتا ہے کہ کسی کو شہر پہنچانے میں جیلہ کرنا اور اللہ

تعالیٰ کا ایصالِ بشر میں جیلہ کرنا محال ہے۔

جواب : یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی شان میں استعمال ہونے سے قسماً بہلت سے ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں کی گئیں۔ ایک یہ ہے کہ یہاں جزا و مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح قرآن پاک میں جزاء سیئۃ کو سنیہ کہا گیا ہے۔ اسی ضابطہ کے مطابق جزا و مخادعہ کو مخادعہ سے اور جزا و استہزار کو استہزار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس تاویل کے مطابق مکر اللہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکر کی جزا دیتا ہے۔ دوسری تاویل یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ایسا معاملہ فرماتا ہے کہ جو ان کے مکر کے مشابہ بہ نسبت یعنی مکر کا اصل مطلب یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے میں خفیہ طور پر حیلہ کرنا جس سے وہ بے خبر ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو اس فعل کی جزا دینگا جس جزا (عذاب) سے وہ بے خبر ہیں۔

تو اس طرح مکر کی مشابہت ہونی کیونکہ جہر کسی ایک صورت میں کافی ہوتی ہے وہ فقط خفا ہے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا حیلہ ان سے مخفی رکھا اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سے مخفی ہے۔ اب اس صورت میں مکر اللہ کا معنی ہوا اللہ تعالیٰ ان کے مکر کا معاملہ ان سے ایسا ہی فرمائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ مشابہت سے نہیں بلکہ اس کا معنی تدبیر محکم و کامل۔ پھر عرف میں اس کا معنی مختص ہو گیا کہ کسی کو عذاب پہنچانے، ہلاک کرنے میں خفیہ تدبیر کرنا اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ممنوع نہیں۔ اب تفسیر کبیر کی اس بحث کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں آپ کا ترجمہ اسی تیسری صورت کے عین مطابق ہے کہ اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی۔ لیکن باقی تراجم کو بھی دیکھا جائے کہ ان تینوں صورتوں میں کسی کے مطابق بھی نہیں ہیں۔ جب تراجم کا مقصد علم اردو دان کو سمجھانا مقصود ہے وہی ترجمہ اس کو راہِ راست پر لا سکتا ہے جس میں وہ غلطیوں میں واقع ہو کر اللہ تعالیٰ پر عیب ثابت کرنے شروع نہ کر دے۔ اسی طرح پ ۱۹ ع ۱ میں بھی تراجم میں فرق موجود ہے اسی طرح پ ۹ ع ۱ کے ترجمہ میں بھی مترجمین نے ایسی ہی غلطی کی۔

اِنَّ مَتَوَفِيكَ اَبِيْ

میں لے لوں گا تجھ کو۔ (محمود الحسن) اب میں تجھے واپس لے لوں گا (موردی)
اے عیسیٰ! میں تم کو موت دینے والا ہوں۔ (عبدالماجد)۔

بے شک میں تم کو وفات دینے والا ہوں۔ (اشرف علی)۔
میں تجھ کو پھر لوں گا (شاید القادر) تحقیق میں پھر لینے والا تجھ کو (رفیع الدین)
میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ (علیٰ حضرت)۔

یہ خطاب ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اگر ترجمہ کیا جائے کہ میں لے لوں گا
تجھ کو، موت دینے والا ہوں۔ اس میں کئی احتمال ہیں۔ تجھے لے لوں گا یعنی تیری روح
کو قبض کر لوں گا۔ تجھے اپنی حفاظت میں لے لوں گا۔ یہ الفاظ احمدیوں کے عقائد کا
رہ نہیں کرتے۔ اور موت دینے والا ہوں۔ یہ ترجمہ ان کی امداد کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا
عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام توفیق ہو چکے ہیں ان کے متعلق تورب فرما چکا ہے:

اِنَّ مَتَوَفِيكَ لَمَّا اَحَدِيْثٍ يَّاكُ فِي مَسِيْحٍ مَوْعُوْدٍ كَاذِبٍ هُوَ۔ اس سے مراد ہمارا نبی

(کذاب) مرزا غلام احمد قادیانی (لعنة الله عليه) ہی ہے۔ لیکن ان کے اس نظریے کے

ابطال کے لیے علیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علیٰ حضرت کا ترجمہ

تفسیر کبیر کے مطابق ہے۔ یہ احمدیوں کا فرد کا گروہ توکل کی پیداوار ہے۔ علامہ رازی

نے پہلے ہی ایسی تفسیر کی جو ان کے اس دہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے: معنی

قَوْلِيْ اِنَّ مَتَوَفِيكَ اَيُّ مَتَمِّمِ عَمْرِكَ فَحَمِيْنُ ذَا اَنْوَافِكَ فَلَا تَرْكَبْهُمْ

حَقٌّ يَّقْتُلُوْكَ بَلْ اَنَا اَفْعَلُكَ اِلَى سَمَائِيْ وَمَقَرُّكَ بِمَلَايِكَتِيْ وَاصْوَفُكَ عَنْ

اَنْ يَتَمَكَّنُوْا مِنْ قَتْلِكَ وَهَذَا تَاوِيْلٌ حَسَنٌ

میں تمہیں پوری عمر

تک پہنچاؤں گا پھر تمہیں وفات عطا کروں گا۔ ان کو نہیں چھوڑوں گا کہ وہ تمہیں قتل کر

سکیں بلکہ میں تمہیں آسمانوں کی طرف اٹھاؤں گا۔ اپنے ملائکہ کے ساتھ ٹھہراؤں گا۔

میں آپ کی حفاظت کروں گا۔ وہ تمہیں قتل کرنے کی قدرت نہیں رکھ سکتے۔ یہ تاویل

اچھی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس تاویل کو علامہ رازی نے اچھا کہا ہے، پسند کیا ہے وہ یہی ہے کہ میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ ان کے قتل کرنے کے دعوے باطل ہیں۔ وہ کسی طرح بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت کا بھی ہے اور اسی سے احمدیوں کا ردّ کامل طور پر ایک اردو دان بھی ترجمہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح مدارک نے بھی تفسیر کی: لانی متوفیٰ ای مستوفی اجلاک یعنی تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔

ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ (پتا پیڑ)

پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول۔ (محمود الحسن)۔

کل اگر کوئی دوسرا رسول آئے۔ (مولانا مودودی)۔

پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے۔ (عبدالماجد)۔

پھر تمہارے پاس کوئی اور پیغمبر آئے۔ (اشرف علی)۔

پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول۔ (شاہ عبدالقادر)۔

پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے۔ (فتح محمد)۔

پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول (اعلیٰ حضرت)۔

وجہ فرق آوے، آئے اور تشریف لائے میں ثابت ہے۔ ہر ذی شعور کے

فہم و ادراک سے بعید نہیں کہ "تشریف لائے" جس طرح ادب و احترام پر دال ہے

اس طرح لفظ آوے میں کیسے ادب و احترام؟ دوسرا فرق "کوئی رسول" عام ہے "وہ

رسول" خاص ہے۔ اس فرق کو سمجھنے سے پہلے اس آیت کریمہ کے سیاق و سباق کا کچھ

مطلب ذہن نشین کریں۔

وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام سے وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں

کتاب و حکمت عطا کروں پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائیں جو تمہاری کتاب و

حکمت کی تصدیق کرنے والے ہوں تو ضرور ہر ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا۔

پھر رب تعالیٰ نے ان کو فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس میرے وعدے کو قبول

کر لیا؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اقرار کر لیا۔ اب اس مفہوم کے سمجھنے کے بعد واضح ہو کہ یہاں جن رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق انبیائے کرام سے وعد لیا گیا وہ خاص رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر یہاں یہ وہم پیش کیا جائے کہ آیہ کریمہ میں لفظ رسول نکرہ ہے اس کے مطابق کوئی رسول ہی ترجمہ ٹھیک ہے "وہ رسول" یہ تو خاص ہے۔ یہ ترجمہ کیسے درست ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نکرہ کا تینوں تعظیم سے خاص ہو جاتا نحو کی کتب میں موجود ہے اور تینوں کا تعظیم کے لیے ہونا بھی علم معانی میں مذکور ہے۔ جب معنی رسول مقبول کیا جائے گا تو تخصیص ہوگی جس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے۔ اسی پر تفسیر بھی دال ہیں: تخرجاء کرم رسول مصدق لما حکم من الکتاب والحکمتہ و هو محمد صلی اللہ علیہ وسلم (جلالین) پھر تمھارے پاس وہ رسول تشریف لائے جو تصدیق کر نیوالے ہوں تمھاری کتاب و حکمت کی۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حکم اگرچہ بظاہر انبیائے کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں وامنہم تبع لہم فی ذلک (جلالین) انبیائے کرام کی امتیں تھیں ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اسی حکم میں داخل ہیں۔ اب یہاں پراگر یہ وہم پیش کیا جائے کہ انبیائے کرام سے وعدہ لینے اور اقرار کرنے کی وجہ کیا ہے جب کہ نبی کریم آخر الزماں ہیں۔ انبیائے کرام نے تو آپ کا زمانہ پانا ہی نہ تھا۔ اس کا جواب صاوی میں ہے۔ سوال و جواب اس طرح پیش کیا گیا ہے: قول اقرئنا جواب عن سوال مقدساً تقییرہ ماذا قالوا حیث نذو شہیۃ المعاہدۃ علی محمد مع علمنا اللہ انہ لایاتی فی زمن نبی من الانبیاء الثواب علی العزم بالاتباع والعقاب علی العزم بعدم الایمان فجميع الانبیاء امیثا بولہن علی الایمان بمحمد و من عنہم علی عدم الایمان بہ لو ظہر عوقب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ انبیائے کرام میں سے کوئی بھی نبی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں آئیں گے تو اس وعدہ و اقرار کا کیا فائدہ

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ جو نبی کریم پر ایمان لائے
 کا عزم کرے اس کو ثواب دیا جائے اور جو ایمان نہ لائے کا عزم کرے اس کو عذاب
 دیا جائے۔ گویا جمیع انبیائے کرام کو نبی کریم پر ایمان لانے کا ثواب دینا مقصود تھا۔
 اور اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ کسی نے نبی کریم پر ایمان لانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کو
 عذاب دیا جائے یعنی اس حکم میں انبیائے کرام کے ساتھ چونکہ ان کی امتیں بھی
 داخل ہیں اس لیے امتوں میں سے جس شخص نے عدم ایمان کا عزم بھی کیا ہوگا، وہ
 عذاب میں داخل ہوگا۔

اب اس بیان کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل نہ رہی کہ یہ حکم نبی کریم کے متعلق ہی
 ہے۔ لہذا ایسا معنی کرنا جو عموم پر دال ہو جس سے مقصد واضح نہ ہو، یقیناً اس سے
 بہتر وہی ترجمہ ہوگا جو تخصیص پر دال ہوگا اور مقصد کو واضح کرے گا۔ وَلَمَّا نَسَبْنَا
إِلَى الرَّسُولِ وَهُوَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ (پہلا)

تم کمزور تھے۔ (محمود الحسن)۔ حالانکہ تم اس وقت بہت کمزور تھے (مؤدکی)
 حالانکہ تم پست تھے (عبد الماجد)۔ اور تھے تم ذلیل (شاریح الدین)
 تم بالکل بے سروسامان تھے۔ (اعلیٰ حضرت)۔ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ بِقَلْبَةِ الْعَصَاةِ
وَالسَّلَاحِ (جلالین) تم تعداد اور ہتھیاروں کے لحاظ سے کم تھے یعنی بے سروسامان
تھے۔ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ بِقَلْبَةِ الْعَدُوِّ وَالسَّلَاحِ لَمَّا دَنَا قَلْبُكَ مِنْ هَذِهِ الْآيَةِ
وَلَمَّا نَسَبْنَا إِلَيْكَ الْعِزَّةَ وَالسَّلَاحَ وَالقُوَّةَ وَالغَلْبَةَ بَعْدَ سَرِيسَامَانِ ہونے
 سے یعنی قلتِ عدد اور ہتھیاروں کی قلت سے تفسیر کی گئی ہے تاکہ بظاہر قلت کا مفہوم
 رب قدوس کے اس ارشاد کے منافی نہ ہو کہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے
 لیے عزت ہے اس لیے کہ ذلت کی نقیض عزت، قوت، غلبہ ہے لیکن یہاں تو
 معنی تعداد کی کمی اور ہتھیاروں کی کمی مراد ہے: رَوَى أَنَّ الْمُسْلِمِينَ كَانُوا

ثلاثمائة و ثلاثة عشر بجلاستة و سبعون من المهاجرين و لقبیتهم
من الانصار و ما كان فيهم الا فرس واحد و الكفار قریب من الف مقاتل
و منهم مائة فرس مع الاسلحة الكثيرة۔

مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی چھترہ ہاجرین اور باقی انصار تھے۔ ان
کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا جب کہ کافر ایک ہزار کے قریب تھے اور ان کے پاس
ایک سو گھوڑے اور کثیر مستحیار موجود تھے۔ وانتوا اذلة بقللة الحدد (مارک)
”تم قبیل تعداد میں تھے۔“ اب اس وضاحت کے بعد المنفرد کے ترجمہ پر نظر کی جائے
کہ آپ کا ترجمہ کس طرح شان صحابہ کے مطابق ہے لیکن اس کے برخلاف دوسرے
ترجمہ کو دیکھیں۔ تم ذیل تھے۔ تم بہت پست تھے کتنے شان صحابہ کرام کے خلاف تراجم
ہیں۔ اور تم بہت کمزور تھے۔ یہ ترجمہ بھی مقصد کو واضح کرنے میں ناکام ہے کیونکہ تم بہت
کمزور تھے، اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے، تم جسمانی طور پر کمزور تھے۔ العیاذ باللہ!
تم ایمانی طور پر کمزور تھے۔ اسی لیے المنفرد کا ترجمہ حقیقت کو سمجھانے میں اور صحابہ
کرام کی شان کو ثابت کرنے میں ایک منفرد حسینیت رکھتا ہے۔

وَلْيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا (پ: ۴)

اور اس لیے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے۔ (محمود الحسن)۔
تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے۔ (عبد الماجد)۔
تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیویں۔ (انترف علی)۔
اور اس واسطے کہ معلوم کرے جن کو ایمان ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
اور اس لیے کہ اللہ پہچان کر دے ایمان والوں کی۔ (اعلیٰ حضرت)۔
جنگ اُحد کا ذکر ہو رہا تھا کہ اے مسلمانو! اگر تمہیں احد میں کوئی تکلیف پہنچی
تو کفار کو بدر میں اسی طرح تکلیف پہنچ چکی۔ یہ دن لوگوں کے درمیان ہم بدلتے رہتے
ہیں۔ اس کے بعد ذکر ہے: وَلْيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا۔ اس پر جلالین نے علم

ظہور سے تفسیر کی۔ اس پر حاشیہ یہ ہے :- علم ظہور ای علم وجود
 ای علمنا متعلقاً بالوجود الخارجی ؑ
 یعنی یہاں علم کا تعلق وجود خارجی سے ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی جانتا
 ہے اس کو خارج میں ظاہر فرماتے :- والعلم فیہ بیان عن التمییز من
 باب لطلاق اسم السبب علی المسبب ای لیمیز الثابت علی الایمان من غیرم روح المعانی
 یہاں علم کا مجازی معنی جُدا کرنا، تمیز پیدا کرنا۔ یعنی سبب کا نام سبب پر اطلاق ہے۔
 (مجاز مرسل ہے) یعنی معنی یہ ہوا کہ ایمان پر ثابت رہنے والوں کو ان کے غیروں سے
 ممتاز کر دے۔ اب اس تفسیر روح المعانی کی تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور کریں
 ”اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی“ کہ یہ نفس ترجمہ ہے جس میں کوئی سطحی ذہن والا
 بھی وہم و گمان نہیں کر سکتا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ ان کو آزمائش میں ڈال کر
 جانا، پہلے علم نہیں تھا۔

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ نَاهَدُوا عَنْكُمْ وَيَعْلَمُ الضَّالِّينَ (پ ۱۰۷)

ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور تم صبر
 کرنے والوں کو جانا۔ (عبد الماجد)

حالات کہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی را
 میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنا والے ہیں۔ (مودودی)

حالات کہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم نہیں
 کیا کہ اور یہ بھی مقصود ہے کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے (فتح مکی)

اور ابھی تک معلوم نہیں کیا کہ اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں
 کیا ثابت رہنے والوں کو۔ (محمود الحسن)

اور ابھی معلوم نہیں کیے اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم کرے ثابت
 رہنے والے۔ (شاہ عبدالقادر)

اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر کرنے والوں
کی آزمائش کی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مفسرین کی بحث باسانی سمجھ میں آتی ہے کہ
یہاں اللہ کے علم کی کیسے نفی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کہا جائے ابھی تک اللہ نے
معلوم نہیں کیا: ای ولما تجاهدوا لاون العلم متعلق بالمعلوم فتدل نفی
العلم بمنزلة نفی متعلقه لانما منتف باشتفاءه تقول ما علم الله في
فلان خيرا ای ما فيه خیر حتى يعلمہ (مدارک) یعنی یہاں مقصد نفی جہاد ہے
نفی علم نہیں اس لیے کہ علم کا تعلق معلوم سے ہے۔ نفی معلوم کی جگہ نفی علم کو رکھا گیا
ہے۔ کیونکہ معلوم کے انتفاء سے علم کا انتفاء ہوتا ہے جیسے تم کو ما علم الله في
فلان خیر اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ نے فلاں میں خیر کو جانا نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے
کہ فلاں میں خیر ہے ہی نہیں جو اللہ کے علم میں آئے۔ مقصود بھی یہی ہے کیونکہ ما قبل
آرہا ہے کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ابھی تو اللہ نے تمہیں جہاد
میں آزمایا بھی نہیں اور نہ صبر کرنے والوں کی آزمائش کی۔ فان سبأء الاجر من غیر
عمل من یعلم انه منوط به مستبعد عند المعقول۔ ولما ثقیل ترجوا المفاة
ولم تسلكها مسالكها۔ ان السفینة لا تجری علی الییس۔ وصد عن شہوبین
حوشب طلب الجنة من غیر عمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة
بلا سبب نوع من الغفور وان تجاء الرحمة معن لا یطاق حمق
وجہالتہ (روح المعانی) اجر کی امید بغیر عمل کے جانتے
ہوتے کہ اس کا دار و مدار بھی اسی پر ہے یہ عقل سے بعید ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا
گیا۔ نجات کی امید اس راہ پر چلنے کے بغیر کشتی کو خشکی پر چلانے کے مترادف ہے۔
شہرین حوشب کہتے ہیں۔ بغیر عمل کے طلب جنت گناہ ہے۔ انتظار شفاعت بلا سبب
دھوکا میں مبتلا ہونا۔ رحمت کی امید بغیر اطاعت کے جہالت و بے وقوفی ہے۔
اس تقریر سے واضح ہوا کہ یہاں نفی آزمائش جہاد و صبر ہے نہ کہ نفی علم:

نفی اللانہم لازم نفی الملزوم و کثیرا ما یقال ما علمنا مثله تعالیٰ فی فلان
 خیرا و یراد ما فیہ خیر حتی یعلمہ (روح المعانی) اس عبارت کا مفہوم وہی
 ہے جو پہلے ہارن کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔ ام حسبہ ان تندخلوا الجنة والحال
 انہم یتحقق منکر الجہاد والصبر (روح المعانی) یہاں بھی نفی جہا
 و صبر ہے نہ کہ نفی علم۔

اَفَاِنَّ مَاتَ اَوْ قُتِلَ (پ ۱۶)

پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔ (محمود الحسن)۔
 پھر کیا وہ اگر مرجائیں یا قتل کر دیے جائیں۔ (مودودی)۔
 سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں۔ (عبد الماجد)۔
 پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 مہلا اگر یہ مرجائیں یا مارے جائیں (فتح محمد)۔
 تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ذکر کیا جا رہا ہے۔ جنگ اُحد میں جب شیطان
 نے نبی کریم کے شہید ہو جانے کی افواہ پھیلا دی صحابہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے
 اس وقت رب تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام کا انتقال ہو چکا ہے
 تو کیا اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو تم دین سے روگردانی کر جاؤ گے
 اب توجہ طلب بات یہ ہے کہ کون سا معنی نبی کریم کی شان کے لائق ہے۔ ادب و
 احترام بردال ہے جس میں شہید ہونے کا ذکر ہے یا مارا جانا، قتل ہو جانے کا ذکر ہے
 تو یقیناً یہ ترجمہ بہتر ہے۔ یہ اہل دانش پر مخفی نہیں۔

بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا (پ ۱۶)

ان کے گناہ کی شامت سے۔ (محمود الحسن)۔

ان کے بعض کرتوتوں کے سبب (عبدالماجد)۔
 کچھ ان کے گناہ کی شامت سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

ان کے بعض اعمال کے باعث (علیٰ حضرت)۔

جنگِ احد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درہ میں صحابہ کرام کی جماعت کو کھڑا کیا کہ تم نے یہاں ہی کھڑے رہنا ہے۔ جب صحابہ کرام کو فتح حاصل ہوئی تو وہ جماعت بھی اس جگہ کو چھوڑ کر مالِ غنیمت کے اجتماع میں دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ شریک ہو گئے۔ یہ صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید فتح تک بٹھرنے کا ہمیں حکم دیا گیا۔ نبی کریم کی اجازت کا انتظار نہ کرنے کی وجہ سے آزمائش میں آ گئے۔ اسی درہ سے کفار نے حملہ کر دیا صحابہ کرام کو تکلیف پہنچائی۔ اسی درہ کو چھوڑنے کا ذکر رب نے فرمایا کہ ان کے بعض اعمال کی وجہ سے شیطان نے انہیں پھینکا دیا۔ پھر بیشک اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ اسی مقصد کو علیٰ حضرت نے صحابہ کرام کے ادب کا لحاظ کرتے ہوئے، ان کے بعض اعمال کے باعث، ترجمہ کیا۔ ان کے بعض اعمال کی شامت سے "ایسا ترجمہ نہیں کیا جس میں گناہ کی نسبت صراحتاً صحابہ کرام کی طرف ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ علیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کرنا کہ "محبوب" کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے اس پر گناہ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔"

وَالْيَعْلَمُ الْمُؤْمِنِينَ وَيَعْلَمُ الَّذِينَ نَافَقُوا (پہ ۱۱)

یہ مقصود تھا کہ خدا مومنوں کو اچھی طرح معلوم کرے اور منافقوں کو بھی معلوم کرے۔ (فتح محمد)۔

اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور تاکہ معلوم کرے ان کو جو منافق تھے۔ (محمود الحسن)۔

تاکہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون (موردی)
 تاکہ اللہ مومنین کو جان لے اور ان لوگوں کو بھی جنہوں نے منافقت کی۔
 marfat.com (عبدالماجد)

اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور معلوم کرے جو منافق تھے۔
(شاہ عبدالقادر)

اس لیے کہ پہچان کرادے ایمان والوں کی اور اس لیے کہ پہچان کرادے جو منافق
ہوئے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ کی شان کو مد نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی
مناسب ترین ہے جو اوہام باطلہ کو رد کرتا ہے ورنہ وہم ہو سکتا ہے کہ اللہ کا علم اس
واقع کے بعد حاصل ہوا حالانکہ ایسا وہم کرنا ایمان کو ضائع کرنا ہے کیونکہ رب تعالیٰ کے
اس ارشاد سے پہلے جو آرہا ہے اس کا مفہوم یہ ہے: ”جو بھی تمہیں (اصحاب میں تکلیف
پہنچی وہ اللہ کے ارادہ ہی سے ہے تاکہ مومنوں اور منافقوں کی پہچان کرادے:

وَالرَّادِ لِيُظْهِرَ لِمَنَّا سَمِيئَاتٍ لِّدِيهِمْ اِيْمَانِ الْمُؤْمِنِ (روح المعانی) مراد
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظاہر کرے مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے تفاق کو۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور روح المعانی کی تفسیر میں مطابقت ہے۔ لوگوں پر ظاہر کرے
یا پہچان کرانے ایک مفہوم کو شامل ہے لیکن معلوم یا جانے اس قسم کے الفاظ سے
غلط مفہوم لینا یقینی ہو جاتا ہے

لَا يَغْرُبُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْاِيْلَادِ (پ ۱۶)

تجھ کو دھوکا نہ دے کافروں کا شہرول میں۔ (محمود الحسن)۔
ذہن پر میں ڈالے تجھ کو پھر تان لوگوں کا کہ کافر ہوئے بیچ شہرول کے۔ (شاہ
رفیع الدین)۔

دلے سفیر کافروں کا شہرول میں چلنا پھرنا تمہیں دھوکا نہ دے۔ (فتح محمد)
تو نہ بہک اس پر کہ آتے جلتے ہیں کافر شہرول میں (شاہ عبدالقادر)
اے نبی دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکا
میں نہ ڈالے۔ (موردوی)

یہ کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا کہیں تجھے دھوکے میں نہ ڈال دے عیدالمجاہد
 نے سننے والے کافروں کا شہروں میں اہلے گہلے پھرنا ہرگز تجھے دھوکا نہ دے
 (اعلیٰ حضرت)۔

یہ عام مخاطب کو خطاب ہے کہ کافروں کا شہروں میں گھومنا پھرنا تجارت کرنا
 مال حاصل کرنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ دنیا کا سامان تھوڑا ہے پھر ان کا ٹھکانا
 جہنم ہے۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ بات واضح ہے کہ اس خطاب کے مخاطب
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ آپ کی امت ہے۔ لیکن دیگر تراجم میں اسے سننے
 والے کے الفاظ زائد نہیں۔ لہذا ایسا ہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے
 حالانکہ یہ درست نہیں اور مولانا مودودی صاحب اور مولانا فتح محمد صاحب نے
 تو صراحتاً نبی کریم کی طرف نسبت کر دی جو تفاسیر سے لاعلمی کی علامت ہے: والخطاب
 لكل احد والنبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد به غیر لان قدوة القوم ومقدمهم
 یخاطب بثنیٰ فیقوم خطابہ مقام خطابہم جمیعاً فکانہ قبیل لا یغض مکر
 ولان الرسول علیہ السلام کان غیر مفروضاً بحالہم
 (مدارک) ہر آدمی کو خطاب ہے یعنی اسے سننے والے۔ یا خطاب تو نبی کریم کو ہے لیکن
 مراد آپ خود نہیں بلکہ آپ کے غیر ہیں اس لیے کہ آپ قوم کے پیشوا و مقتدا ہیں لہذا
 مقتدا کو خطاب تمام کو خطاب ہے گویا یہ کہا گیا ہے تمہیں دھوکا نہ دے کیونکہ نبی
 کریم کو کفار کا تجارت کرنا اور مال و دولت دھوکا نہیں دے سکتا الخطاب للنبی
 صلی اللہ علیہ وسلم والمراد منہ امتہ وکثیر ما یخاطب سید القوم بثنیٰ
 ویراد اتباعہ فیقوم اتباعہ مقام خطابہم (روح المعانی) نبی کریم صلی
 اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ اکثر طور پر قوم کے سردار کو
 خطاب کیا جاتا ہے اور مراد اس کے تابعین ہوتے ہیں۔ لہذا یہی مناسب ہوگا جس سے
 یہ سمجھا جاسکے کہ یہ خطاب نبی کریم کی امت کو ہے۔ اگر یہ ترجمہ کیا جائے اسے سننے والے
 تجھ کو دھوکا نہ دے، پھر یہ مقصد واضح ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے تجھ کو دھوکا نہ دے

تو اس سے یہ مقصد تو واضح نہیں ہوتا البتہ لوگوں کو گمراہ کرنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو سمجھنے سے برگشتہ کرنا آسان ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ الْيُسْرَىٰ

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ (محمود الحسن)۔

اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق ہے (مودودی)۔

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ (عبد الماجد)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ (اشرف علی)

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ (شاہ عبدالقادر)۔

وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے فضل سے لازم کر لیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ ایسا ترجمہ جو وہم کا ازالہ بھی کر رہا ہے

وہ وہم یہ ہوتا ہے کہ اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں تو کیسے توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ یہ

ترجمہ صحیح ہوا جب کہ کسی چیز کو ضرور کرنا واجب کے مترادف ہے۔ اللہ پر کوئی چیز واجب

نہیں۔ اسی وہم کا ازالہ جلالین میں کیا گیا۔ اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے: إِنَّمَا

التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ أَيُّ التِّي كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ قَبُولَهَا بِفَضْلِهِ وَهِيَ تَوْبَةُ

جس کو اللہ نے اپنے فضل سے لازم کر لیا و لیس المراد به الوجوب

اذ لا يجب على الله شيء ولكن تأكيد للوعد يعنى انه يمكن الاحمال كالوا

الذی لا یستلک (مدارک) اور اس سے مراد وجوب نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز

لازم نہیں لیکن البتہ وعدہ کی تاکید ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا فرماتا ہے جب

وہ اپنے وعدہ کا تخلف نہیں فرماتا توبہ واجب کی طرح ہوا جس کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔

یعنی ہی مقصد کے مطابق ہے کہ وہ اپنے فضل سے اپنے آپ پر توبہ کو لازم کیسے ہوئے

ہے ورنہ حقیقتہً اس پر کچھ لازم نہیں۔ لہذا توبہ کو ضرور قبول کرنا لازم پر وال ہے اور

لزوم سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

فَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ الْآيَةَ (پہ ۹)

کاش کہ جس وقت اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے تھے آپ کے پاس آجاتے پھر اللہ سے مغفرت چاہتے اور رسول بھی ان کے حق میں مغفرت چاہتے تو یہ ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پلتے۔ (عبدالماجد)۔

اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تھکے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا تو یقیناً اللہ کو سختی والا اور رحم کرنے والا پاتے (مودودی)۔

اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا سیرا کیا تھا آتے تیرے پاس اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان (محمود الحسن) اور اگر جس وقت وہ اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے۔

(اشرف علی)

اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائیں تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔ (علی حضرت)

ان تراجم میں پہلا فرق تو یہ ہے کہ ”آتے تیرے پاس“ اور اسی طرح یہ الفاظ ”رسول بھی ان کو بخشواتا“ ان الفاظ کو اردو محاورہ کے مطابق دیکھیں۔ پھر ان کے مقابل ”اے محبوب تیرے حضور حاضر ہوں“ اسی طرح یہ الفاظ ”رسول ان کی شفاعت فرمائے“ اس ترجمہ کو بھی اردو محاورہ کے مطابق دیکھیں، یہ سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئے گی کہ کون سا ترجمہ ادب و احترام کے مطابق ہے یا کون سا نہیں۔

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ حکم عام ہے۔
 نبی کریم کی ظاہری حیات میں بھی یہ حکم تھا اور اب بعد از وصال بھی حکم یہ ہی ہے۔ لیکن دوسرے
 ترجمہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم آپ کی ظاہری حیات سے متعلق تھا۔ حالانکہ یہ درست
 نہیں زیادہ طور پر وہ اس دلیل پر انحصار کرتے ہیں لا تشد الرجال الا الى ثلاث
 مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی نبی کریم صلی اللہ علیہ
 وسلم نے تین مساجد کے بغیر کہیں اور رختِ سفر باندھنے سے روکا ہے۔ وہ تین مسجدیں مسجد
 حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی ہے۔ اس حدیث پاک سے دلیل یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ یہاں
 سے ثابت ہوا کہ زیارتِ قبور صالحین بھی منع ہے حالانکہ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ
 اس حدیث کے ماتحت مسلم شریف کی شرح میں علامہ نووی نے فرمایا: و الصمیم عند
 اعبابنا وهو الذی اختاره امام الحویین والمسحقون انه لا یحرم ولا یكوه
 ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے جس کو امام الحرمین اور محققین حضرات نے بھی پسند کیا ہے کہ یہ
 نہ حرام ہے اور نہ مکروہ ہے۔ اسی طرح مرقاة شرح مشکوٰۃ میں بھی ہے: فی الشرح
 المسلم للنووی قال ابو محمد یحرم شد الرجال لی غیر الثلثة وهو غلط و فی الصحیح
 ذهب بعض العلماء الى الاستدلال علی المنع من الرجوع لزیارة المشاهدة و قبور
 العلماء و الصالحین و ماتین لی ان الامور لیس كذلك بل التریارة ماسوا
 بہا الخیر الا فزوس و ہا انما و ہذا عن الشدیدین الثلاثة من المسجد
 لقاتلہا و اما المشاہد فلا تساوی بل بركة زیارتہا علی قدر درجاتہم
 عند اللہ هل یمنع خالک القاتل عن شد الرجال بقبورہ الا منسیہ
 کابراہیم و سولی و یحییٰ و المنع من ذلك فی غایت الاحالة
 و الاولیاء فی معناہم فلا یبعد ان یکون ذلك من اغراض الرحلة
 کما ان زیارة العلماء فی الحیوة یعنی علامہ نووی نے ایک قول ابو محمد کا تین
 مساجد کے بغیر سفر کرنا حرام ہے نقل کر کے اس پر خود کہا کہ یہ غلط ہے۔ احیاء العلوم میں بھی
 ہے کہ بعض علماء نے تبرک مقامات اور علماء و صالحین کی قبور کی طرف زیارت کے لیے سفر کرنے

کو منع کیا ہے لیکن یہاں بھی علامہ غزالی نے خود ہی بیان کیا ہے مجھے جو بتا چلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح صحیح نہیں کیونکہ قبور کی زیارت کرنا تو خود حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم نے فرمایا الا فندھا خبر دار قبروں کی زیارت کیا کرو لیکن یہاں نہی کا مطلب یہ ہے کہ تمام مساجد برابر ہیں۔ اگر کسی مسجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے جاتا ہے تو ان تین مساجد کی طرف جائے کسی اور کی طرف نہ جائے۔ اس تحقیق پر لا تشد الرحال الی المسجد الا الی ثلاث الخ معنی ہوگا یعنی تم مساجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے سوائے ان تین کے نہ جاؤ۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ حکم متبرک مقامات کا نہیں بلکہ ان کی زیارت میں بحسب درجات برکت ہے۔ اسی طرح انبیائے کرام صیبرائیم، موسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام کی قبور کی زیارت سے منع کرنا بہت ناممکن ہے۔ اولیائے کرام کا بھی یہی حکم ہے جس طرح علماء کی زندگی میں ان کی طرف جانا کسی نہ کسی مقصد پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح اولیائے کرام کی قبور کی زیارت کرنے میں بھی کوئی غرض ہو سکتی ہے۔

اب اس بیان کے بعد بخوبی واضح ہوگا جب ابراہیم علیہ السلام، انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی قبور کی زیارت باعث برکت ہے تو سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار پر انوار کی زیارت بھی باعث شفاعت ہے۔ نبی کریم کے مزار پر انوار پر شفاعت کی غرض سے حاضر ہو کر التجا کرنا اور نبی کریم کا شفاعت کرنے کے بعد محضرت کی خوشخبری دینا مدارک سے ثابت ہے قیل جاء علی بعد دفنہ علیہ السلام فری بنفسہ علی قبرہ وحنامن

نزل به علی ساسہ و قال یا رسول اللہ قلت فسمعنا وکان فیما نزل علیک
 ولو انہم اذ ظلموا انفسہم الا لایۃ وقد ظلمت لفسی و جنتک استغفر اللہ ذبی
 واستغفر لی من ربی فنودی من قبرہ قد غفر لک (مدارک) نبی کریم صلی اللہ
 علیہ وسلم کے دفن ہونے کے بعد ایک اعرابی آیا اور قبر اظہر سے لپٹ کر قبر انور کی خاک سر پر
 ڈالتے ہوئے نہایت حالت زار سے عرض کر رہا ہے، یا رسول اللہ! میں نے اپنی جان پر
 ظلم کیا۔ آپ نے اللہ کا نازل کردہ ارشاد فرمایا، ہم نے سنا ولو انہم اذ ظلموا
 انفسہم پوری آیت اعرابی نے تلاوت کرنے کے بعد عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اپنی

جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ میں خود تو اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہا ہوں، آپ بھی رب سے میرے لیے استغفار (شفاعت) فرمائیں۔ قبرِ ظہر سے آواز آئی تمہیں بخش دیا گیا۔ صاحبِ مدارک کے اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی قابلِ تعریف ہے جس میں نبی کریم کا شفاعت کرنا آج بھی ایسے ہی ثابت ہے جیسے ظاہری حیات میں ثابت تھا۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (پہ ۴)

اور بیابھی عورتوں میں سے مگر جن کے مالک ہوتے ہیں وہ اپنے ہاتھ تمہارے۔

(شاہ رفیع الدین)

اور شوہر والی عورتیں بھی (تم پر حرام ہیں) مگر وہ جو اسیر ہو کر یونڈیوں کے طور پر تمہارے قبضے میں آجائیں۔ (مولوی فتح محمد)

اور نکاح بندھی عورتیں مگر جن کو مالک ہو جاویں تمہارے ہاتھ۔ (شاہ عبدالقادر) اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر جو کہ تمہاری مملوک ہو جاویں۔ (اشرف علی)۔ اور حرام ہیں شوہر والی عورتیں مگر کافروں کی عورتیں جو تمہاری ملک میں آجائیں۔

(اعلیٰ حضرت)

اس مقام ان عورتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے تعلقات ازدواجی حرام ہیں اسی کے ضمن میں والمحصنات من النساء کو ذکر کیا اور اس سے ماملکت ایمانکم کو مستثنیٰ کیا۔ مدارک میں اسی طرح ذکر کیا گیا ہے الاماملکت ایمانکم۔ بالعب و بوجہافی دای الحرب و المعفی و حرم علیکم نکاح المنکوحات ای اللاتی لہن ازواج الاماملکت وہن بسبیہن واخراجہن بدون ان واجہن لوقوع الفرقة بتبایین الدارین لابالسبی فقل الغنائم بمملکت الیمین بعد الاستبراء یعنی الاماملکت ایمانکم سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو قید کر کے لایا جائے اور ان کے خاوند دارِ حرب میں رہ

جائیں ان میں دارحرب اور داراسلام کے تباہی کی وجہ سے فرقت واقع ہوگی صرف
 قید ہونے سے نہیں کیونکہ وہ وضع حمل کے بعد مال غنیمت کے طور پر ملک بین کی وجہ
 سے حلال ہو جائیں گی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس فقہی ضابطہ کو واضح کر رہا ہے۔ جب کہ
 دوسرے تراجم و صاحت بیان سے قاصر ہیں۔ کیونکہ یہاں شوہر والی عورتوں کی حلت
 اور شوہر والی عورتوں کی حرمت کا بیان ہے۔ یعنی کافروں کی عورتیں جن کے خاندان
 حرب میں رہ گئے ہوں وہ تباہی دارین کی وجہ سے مسلمانوں پر حلال ہو جائیں گی۔ دوسرے
 تراجم میں مطلقاً لوندیوں کا ذکر ہے ان میں خاندان والی ہوں یا نہ ہوں، اس کا پتا
 نہیں چلتا۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ الْآيَةُ (پہ ۱۵)

جو بھینچے تم کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو بھینچے تم کو کوئی برائی
 سو تیرے نفس کی طرف سے۔ (محمود الحسن)۔
 جو تجھ کو بھلائی پہنچے سو اللہ کی طرف سے اور جو تجھ کو برائی پہنچے سو تیرے
 نفس کی طرف سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 جو بھینچتی ہے تجھ کو بھلائی پس خدا کی طرف سے ہے اور جو بھینچتی ہے تجھ کو
 برائی پس جان تیری سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)
 اے سننے والے! تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے
 وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق یہ ثابت ہے کہ یہاں خطاب عام
 انسانوں کو ہے نبی کریم کو نہیں۔ اسی لیے آپ نے ”اے سننے والے“ الفاظ زیادہ کہتے۔
 لیکن دیگر تراجم میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے، حالانکہ یہ درست
 نہیں: مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ إِنَّكَ فَتَلَا مِنْهُ

وما اصابتك من شئ منة بليته فمن نفسك انتك حيث ارتكبت ما
يستوجبها من الذنوب (جلالین) اے انسان جو تجھے بھلائی پہنچے
وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو تجھے مصیبت پہنچے وہ تیرے اپنے گناہوں کے ارتکاب
کی وجہ سے ہے۔ یا انسان خطا باعاما و قال السنجا ج الخطاب النبی
صلی اللہ علیہ وسلم والمراد غیبی (مدارک) اے انسان یعنی یہاں خطاب عام ہے۔ اور زجاج
نے کہا خطاب نبی کریم کو ہے لیکن آپ کے غیر مراد ہیں۔ صوحی عن قتادة عام لكل
من يقف عليه الا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم (روح المعانی) یہ خطاب عام ہے
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں حقیقت بھی یہ ہے کہ معاذ اللہ نبی کریم کی طرف گناہ کی
نسبت اور گناہ کی وجہ سے مصیبت کا آنا یہ ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے تقاسیر میں خطاب
عام ہے یعنی ہر انسان یہ مفہوم اسی وقت ادا ہوگا جب کہ "اے سنتے والے" اے مخاطب
کے یا شد۔ اس قسم کے الفاظ زیادہ کیے جائیں۔

أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ (۱۰۲)

کہ کچھ کم کرو نماز میں سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
اگر نماز میں اختصار کر دو۔ (مودودی)۔
کہ نماز میں کمی کر دیا کرو۔ (عبد الماجد)۔
کہ تم نماز کو کم کر دو۔ (اشرف علی)۔
کہ کچھ کم کرو نماز میں سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
نماز کو کم کر کے پڑھو۔ (فتح محمد)۔
یہ کہ کوتاہ کرو تم نماز سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
کہ بعض نمازیں قصر سے پڑھو۔ (اعلیٰ حضرت)
یہاں مسافر کی نماز قصر کرنے کا ذکر ہے۔ مسافر ہر نماز کو قصر نہیں کر سکتا کیونکہ
نمازیں تین قسم کی ہیں۔ ثنائی۔ ثلاثی۔ رباعی۔ ثنائی دو رکعت والی نماز جیسے فجر کی نماز

ثلاثی تین رکعت والی نماز جیسے مغرب۔ رباعی چار رکعت والی نماز جیسے ظہر، عصر، عشاء۔
 قصر صرف رباعی نماز ہوتی ہے ثلاثی اور ثلاثی نہیں ہوتیں۔ اب اگر یہ ترجمہ ہو کہ ”کچھ کم
 کرو نماز میں سے“ اس میں یہ وہم ہو سکتا ہے کہ شاید ہر نماز کو قصر کیا جاسکتا ہے۔
 لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے کہ ”بعض نمازیں قصر سے پڑھو“ تو یہ وہم نہیں ہو سکتا بلکہ
 ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ بعض نمازیں قصر ہوں گی بعض نہیں۔ یہی تھا سیر کی رائے
 بھی ہے: من باعداد رکعات الصلوة فتصلی الرباعیۃ ساکتیں (مدارک)
 یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کی رکعات کی تعداد کم کرو یعنی تم چار رکعت والی نماز کو دو
 رکعتیں پڑھو بان توح و ہا من اربع الی اثنتین (جلالین) یعنی تم چار رکعت
 والی نماز کو دو کی طرف لوٹاؤ۔ لہذا اس مقصد کو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت زیادہ واضح
 کر رہا ہے جب کہ دوسری جگہ غلط مفہوم لینا عین ممکن ہے مولانا مودودی صاحب
 کے ترجمہ میں گراٹم کی یہ صریح غلطی ہے کہ ان کا معنی اگر کیا حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہاں
 البتہ ان کا معنی اگر ہے۔ شاید ان کے دیکھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (پہلی آخری رکوع)

منافق (ان چالوں سے اپنے نزدیک) خدا کو دھوکا دیتے ہیں (یہ اس کو
 کیا دھوکا دیں گے) وہ ان کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ (محمود الحسن)۔
 یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکے بازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اللہ
 ہی نے انہیں دھوکا میں ڈال رکھا ہے۔ (مودودی)

اور منافق تو ہیں دعا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دعا دے گا۔
 شاہ عبدالقادر

تحقیق منافق فریب دیتے ہیں اللہ کو اور وہ فریب دینے والا ہے ان کو۔
 (شاہ رفیع الدین)

بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دیا چاہتے ہیں اور وہی انکو غافل

کر کے مارے گا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اللہ کو دھوکا، فریب دینا، اس سے دعا بازی کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اللہ کسی کو دعا دے، فریب کرے یا دھوکا دے یہ بھی درست نہیں: اِی یفعلون ما یفعل المخذاع فیظہون الایمان ویضمون نقیضہم (روح المعانی) یعنی وہ اپنے خیال میں فریب کلمی کرتے ہیں جیسا کہ مکار، فریب کار، دعا باز کا کام ہوتا ہے کہ وہ ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کفر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے خیال میں فریب دیتے ہیں کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو مخفی رکھنا ممکن نہیں:

وہو خادعہم اِی فاعل بہم ما یفعل الغالب فی الخداع حیث شرکوا فی الدنیا مفسوینا لہم ما لہم فی الاخرة التکالیف من النار وروح المعانی) اللہ تعالیٰ ان کو غافل کر کے مارے گا یعنی ان سے ایسا معاملہ کریگا جو خدا دعوت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ان کے جان اور مال مسلمانوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہتے ہیں کمان سے کافروں کی طرح جنگ کر کے ان کے مال کو عنایت نہیں بنایا جاتا۔ انہیں قتل نہیں کیا جاتا لیکن قیامت میں ان کو سب سے زیادہ عذاب ہوگا جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں رکھا جائے گا:

بظہارہم خداع ما بطنوہ من الکفر لیدفعوا عنہم احکامہ الدنیویۃ (جلالین) وہ باطن میں کفر رکھتے تھے اور ظاہراً ایمان دار تاکہ دنیا میں کافروں والے احکام ان سے دور رہیں۔ یہ بھی وہ اپنے کمان میں ایسا کرتے تھے ورنہ حقیقتاً ایسا کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو چھپانا ممکن نہیں وهو خادعہم بجازیمہ علی خداعہم (جلالین) وہ ان کو خداع کی جزا دے گا۔ تفاسیر کے بیان سے یہ مخفی نہ رہا کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں یا اللہ دھوکا دیتا ہے۔ یہ تراجم صریح غلطی پر مبنی ہیں اور تفاسیر سے مکمل لاعلمی کی علامت ہے۔

فَلَوْ اِمَّا مَسَّكُنْ عَلَيْكُمْ (پہلے)

(محمد الحسن)

سو کھاؤ اس میں سے جو بکڑ رکھیں تمہارے واسطے

marfat.com

Marfat.com

وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو۔ (مودودی)۔
 سوکھاؤ اس میں سے کہ رکھ پھوڑیں تمہارے واسطے (شاہ عبدالقادر)۔
 سوکھاؤ اس (شکار) کو جسے (شکاری جانور تمہارے لیے پکڑ رکھیں۔ (عبدالماجد)
 تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو کھالیا کرو۔ (فتح محمد)
 پس کھاؤ اس چیز سے کہ پکڑ رکھیں اوپر تمہارے (شاہ رفیع الدین)
 تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو کھاؤ (اشرف علی)
 تو کھاؤ اس میں سے جو مار کر تمہارے لیے رہنے دیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 یہاں شکاری جانوروں جیسے کتا اور درندے وغیرہ شکاری پرندے ان کا ذکر کیا جا
 رہا ہے کہ جو جانور کھائے جائیں وہ سیکھ جائیں ان کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ کر
 چھوڑ دیا۔ اگر ان کے شکار کرنے میں کوئی جانور مر بھی جائے ذبح نہ کیا جائے پھر بھی حلال ہے
 یہ مقصد صرف اس سے کہ پکڑ رکھیں تمہارے واسطے حاصل نہیں جیسا اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے
 واضح ہے: وان قتلتمہا من لہا کل منہ بخلاف غیر المعلومۃ فلا یحل صید
 و علامتہا ان تسترسل اذا اسسلت و تنزجراذ ان جرت و تمسک
 الصید و لا تاكل منہ و اقل ما یعرف بہ ذلک ثلاث مرات فان اكلت
 منہ فلا یس ما مسک علی صاحبہا فلا یحل اکلہ (جلالین) یعنی شکاری جانور دوسرے کو
 قتل کر دے اور خود اس سے نہ کھائے۔ وہ سیکھا ہوا جانور ہے بخلاف اس کے جو سیکھا ہوا
 نہیں ہے اس کا شکار کھانا حلال نہیں۔ وہ علامات جن سے پتا چل جائے کہ یہ جانور سیکھا
 ہوا ہے اور یہ نہیں وہ یہ ہیں کہ جانور کو جب شکار کے لیے چھوڑا جائے وہ شکار کی طرف
 چلا جائے جب روکا جائے وہ رک چلتے اور جو شکار کرے اسی طرح رہنے دے خود اس
 سے نہ کھائے۔ یہ کم از کم تین مرتبہ اس کی آزمائش کی جلتے۔ اگر تین مرتبہ ان شہرا لٹ پر پورا
 اترے تو سمجھا جائے کہ اب یہ سیکھ گیا ہے۔ اگر خود جانور نے اس سے کھالیا اور مالک کے
 لیے اسے نہ رکھا تو سمجھیں کہ ابھی وہ نہیں سیکھا لہذا اس سے نہ کھایا جائے لیکن یہ حکم
 اسی جانور کا ہے جو شکار کے حال میں مر گیا لیکن اگر اسے زندہ پالیا اور ذبح کر لیا اس

کے لیے شکاری جالور کا یہ سیکھا ہوا ہونا یا نہ ہونا کوئی شرط نہیں۔ لہذا اس کا تمھارے لیے کپڑے رکھنا زندہ کو بھی شامل ہے جو یہاں مراد ہی نہیں۔ لیکن بخلاف اس کے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی مقصد کو ظاہر کرتا ہے جو مراد ہے جو مار کر تمھارے لیے رہنے دیں اسے کھاؤ۔ یہی مراد ہے۔ اس فقہی باریکی سے دوسرے حضرات بے خبر رہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ (پ ۱۱)

اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو (مولانا محمود الحسن)۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کے لیے اٹھو۔ (مودودی)

اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھو (عبدالمجید)

اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو (شاہ عبدالقادر)۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب کھڑے ہو تم واسطے نماز کے (شاہ رفیع الدین)

اے ایمان والو جب نماز کو کھڑا ہونا چاہو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس آیت میں وضو کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کہ جب تم نماز میں کھڑے ہونے

کا ارادہ کرو تو وضو کرو کیونکہ نماز میں کھڑے ہو کر تو وضو نہیں کیا جائے گا۔ یہ مقصد

اسی وقت سامنے آئے گا جب ترجمہ کیا جائے گا۔ جب نماز کو کھڑا ہونا چاہو۔ لیکن

اگر یہ ترجمہ کیا جائے جب تم اٹھو نماز کو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ نماز میں کھڑے

ہو کر وضو کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے کچھ مشہور مفسرین کرام نے بھی محذوف الفاظ کو

نکالا ہے إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ (جلالین) یعنی جب تم

نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ کرو۔ اسی آیت میں إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ کقولہ فاذا قرأت

القرآن ای اذا اردت ان تقرء القرآن فعبر عن ارادة الفعل بالفعل لان الفعل

سبب عن الابداءة فاقيم السبب مقام السبب للملازمة بينهما

طلباً للامتنان (مدارک) جب تم نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ

کرو جس طرح دوسرے مقام پر فاذا قرأت القرآن وہاں بھی یہی مراد ہے

کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو تھوڑا پڑھو۔ ارادہ مفعول کو فعل سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ فعل مسبب ہے ارادہ سبب ہے۔ اختصار کے پیش نظر دونوں کے تعلق کی وجہ سے مسبب کو سبب کی جگہ رکھا۔

وَآتَكُمْ مَّا لَمْ تُوْتُوا أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ (پ ۸)

اور دیا تم کو جو کچھ کہ نہ دیا کسی کو عالموں سے (شاہ رفیع الدین)۔
 اور تم کو اتنا عنایت کیا کہ اہل عالم میں سے کسی کو نہیں دیا (فتح محمد)۔
 اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں۔ (محمود الحسن)
 اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا (مورودی)
 اور تمہیں وہ دیا جو دنیا جہان میں کسی (قوم) کو بھی نہیں دیا گیا۔ (عبد الجبار)
 اور تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔
 (اشرف علی)

اور دیا تم کو جو نہیں دیا کسی کو جہان میں۔ (شاہ عبدالقادر)
 اور تمہیں وہ دیا جو آج سائے جہان میں کسی کو نہ دیا۔ (اعلیٰ حضرت)
 حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلا رہے ہیں کہ
 اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اس نے تم میں انبیائے کرام بنائے اور تمہیں وہ دیا
 جو آج سائے جہان میں کسی کو نہ دیا۔

اگر لفظ آج کی زیادتی نہ کی جائے تو سمجھ آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی
 قوم کی فضیلت تمام جہانوں پر بیان فرمائی۔ اس میں تو قوم موسیٰ علیہ السلام کی
 فضیلت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی تمام امتوں پر لازم آئے گی۔ حالانکہ
 ایسا نہیں۔ اسی کو روح المعانی میں اس طرح پیش کیا گیا: العالمین للعهد
والمراد عالی زمانہم او استغراق والتفضیل من وجہ لا یستلزم التفضیل
من جمیع الوجہ فانہ قد یکون للمفضول مالین للفاضل وعلی التقذیر

لا يلزم تفضيلهم على هذه الامة محمدية على نبينا
افضل الصلاة واحسن التبعية وايتاء مالهم يوت احد
وان لم يلزم من التفضيل لکن المتبادر من
استعماله ذلك ولذا اول ما اول

العالمین پر الف لام مہدی ہے جس کا مقصد ہے تمہیں اتنے زمانے میں (آج) جو دیا گیا ہے وہ کسی کو نہیں دیا گیا۔ الف لام استغزاتی بھی ہو سکتا ہے مطلب یہ ہو گا کہ تمہیں تمام جہان والوں پر بعض وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے کیونکہ کبھی مفضول میں بعض لحاظ پر وہ کمال پایا جاتا ہے جو فاضل میں نہیں ہوتا۔ بہر حال دونوں تقدیروں میں امت موسیٰ علیہ السلام کو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت لازم نہیں آتی۔
روح المعانی کی اس تفسیر کے بعد واضح ہوا کہ پہلی صورت میں ترجمہ وہی بہتر ہے جو اعلیٰ حضرت نے کیا ہے البتہ دوسری صورت میں یہ ترجمہ ہو سکتا ہے اور کچھ دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں لیکن لفظ آج کی قید کی زیادتی کے بغیر اور اسی طرح لفظ کچھ یا بعض کی زیادتی کے بغیر ترجمہ مناسب نہیں۔

وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ مَنْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ دَبَّحٌ

اور حق جو تمہارے پاس آچکا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا۔ (فتح محمد)۔

ان کی خوشی پر منت چل چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا (محمود الحسن) اور ان لوگوں کی خواہشوں پر عمل نہ کیجیے اس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے پاس آچکی ہے۔ (عبید الماجد)۔

اور جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجیے۔ (اشرف علی)۔

اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر حق راہ جو تیرے پاس آتی (شاہ عبدالقادر)
اے سننے والے! ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اپنے پاس آیا ہوا حق چھوڑ کر۔
(اعلیٰ حضرت)

یہ خطاب بھی عام مسلمانوں کو ہے کیونکہ نبی کریم تو معصوم ہیں۔ آپ کا حق راہ کو
چھوڑنا منظور نہیں۔ لہذا مطلقاً بغیر ”اے سننے والے“ کی زیادتی کے یا بافرض الحال کے
ترجمہ درست نہیں۔ تفسیر کبیر میں اسی ترجمہ کی تائید ہے کہ خطاب نبی کریم اور مراد آپ
کی امت ہے: وقیل الخطاب له والمراد غیرہ اور یہی حال اس آگے
دوسری آیت میں بھی ہے۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَعْيسَىٰ بَنُ مَرْيَمَ كَافِلٌ لَّيَسْتَطِيعَ رَبُّكَ الْآيَةَ
(پ ۱۵)

کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے ہم پر خوان
بھرا ہوا آسمان سے (مولانا محمود الحسن)۔

جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تیرے رب سے ہو سکے کہ اتارے
ہم پر خوان بھرا آسمان سے (شاہ عبدالقادر)۔

حواریوں نے عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں
کہ ہم پر آسمان سے کچھ نازل فرمائیں (مولانا اشرف علی)۔

حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا
ایک خوان اتار سکتا ہے (مولانا مودودی)۔

(وہ قصہ بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا پروردگار
ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (طعام کا) خوان نازل کرے۔ (فتح محمد)

جس وقت کہا حواریوں نے اے عیسیٰ بیٹے مریم کے آیا کر سکتا ہے پروردگار
تیرا یہ کہ اتارے اوپر ہمارے خوان آسمان سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ کا رب ایسا کریگا کہ ہم پر آسمان سے ایک
تھون اُتارے (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر دیگر مترجمین نے یہ ترجمہ کیا کہ کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت
نے ترجمہ کیا ہے کیا آپ کا رب ایسا کرے گا؟ تراجم میں فرق واضح ہے کہ یہ سوال
کرنا کہ کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے؟ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ سوال کرنے والے
کے دل میں شک ہو کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے یا نہیں۔ پھر وہ شخص کہے گا
کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو تو یہ سوال کرنا ممکن نہیں۔ البتہ
یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگرچہ ہر طرح کی قدرت حاصل ہے جو چاہے
وہ کر سکتا ہے لیکن کیا ہماری التجا پر یہ کام کرے گا یا نہیں۔ یہاں سوال قدرت
کے متعلق نہیں کہ اسے قدرت حاصل ہے یا نہیں بلکہ سوال مشیت کے بلے میں ہے
کہ اس کام میں اس کی مشیت بھی ہے یا نہیں۔ یہ سوال جائز ہے۔

اب یہ خیال کیا جائے کہ یہ سوال کرنے والے حواریین ہیں۔ وہ حواریین
کون ہیں؟ ہمدان من امن بعیسیٰ علیہ السلام (صاوی) وہ عیسیٰ
علیہ السلام پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے ایمان پر خود قرآن پاک
شاہد ہے: **قَالَ لَلْحَوَارِيِّينَ هُوَ الْبَرُّ الْمُنْتَهَىٰ وَمَنْ يَشْهَدُ بِنَا مَسْلُومًا**
حواریوں نے کہا ہم اللہ کے دین کے مدگار، ہم اللہ پر ایمان لائے اور اے عیسیٰ
علیہ السلام ہمارے ایمان لانے پر آپ گواہ رہیں۔

جب حواریین اپنے ایمان کا پیرلا اقرار کر رہے ہیں اور اپنے ایمان پر عیسیٰ
علیہ السلام کو گواہ بنا رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کی استطاعت میں شک
کریں۔ اسی شک اور اس کا ازالہ اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی صحت اور دوسرے
حضرات کی بظاہر الفاظ سے غلطی کی وجہ، تفاسیر سے دیکھیں۔ جلالین میں ہے:
هَلْ يَسْتَطِيعُ اِيٌّ يَفْعَلُ ذٰلِكَ کیا تمہارا رب کرے گا۔ یہ معنی نہیں کہ تمہارا رب کر
سکے گا؟ جلالین کے اسی مقام پر تفسیر صاوی میں ہے: **اِيٌّ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فَاطْلُقْ**

اللازم وهو الاستطاعت واد الملزوم وهو الفعل و ذفع بذلك ما يقال
ان الحواریین مومنون فكيف يشكون في قدرة الله تعالى
یعنی هل يستطيع کی تفسیر یفعل سے کیوں کی گئی۔ اس لیے کہ یہاں مجاز مرسل
سے کہ اطلاق استطاعت کا ہے جو لازم ہے اور مراد ملزوم سے اور وہ فعل ہے
کیونکہ جہاں فعل ہوگا وہاں استطاعت لازم ہوگی۔ یہ مجاز کا استعمال کرنا ذکر لازم اور
ملزوم مراد لینا اس وجہ سے ہے کہ یہاں ایک سوال کو مندرج کرنا ہے کیونکہ سوال یہ
ہوتا ہے کہ حواریین تو ایمان والے تھے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کیسے
شک کرتے ہوئے یہ سوال کیا۔ تو اس کا جواب واضح طور پر سمجھ آچکا ہے کہ یہاں استطاعت
اپنے لغوی معنی میں استعمال ہی نہیں بلکہ مجازی طور پر فعل کے معنی میں استعمال ہے
جس کا معنی یہی ہوگا کیا تمہارا رب کرے گا۔ عام مترجمین هل يستطيع کے لفظ
سے غلطی میں مبتلا ہو گئے کیونکہ هل يستطيع کا لغوی معنی بلاشبہ یہ ہے
کہ وہ کر سکے گا وہ کر سکتا ہے لیکن قرآن پاک کے رموز سے یہ بے خبری کی علامت
ہے کیونکہ قرآن پاک میں تشابہات بھی ہیں اور مجازات و کنایات بھی۔ اس کے برعکس
اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس شک کو مندرج کر رہا ہے اور جو بیان کرنا مقصود تھا اُسے ہی
ظاہر کر رہا ہے۔ یہ کمال اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ مترجم کی نظر تفسیر پر
ہو، پھر ترجمہ کرے۔ روح المعانی میں بھی اسی طرح ہے: ان معنی هل يستطيع
هل يفعل كما تقول للقباض على القيام هل يستطيع ان تقوم یعنی
هل يستطيع کا معنی کیا کرنے گا۔ جس طرح قیام پر قدرت رکھنے والے کو کہا
جائے کیا تو کھڑا ہوگا؟

وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اور مردوں کو زندہ کرے گا۔ (محمود الحسن)۔

ہے مڑے تو انھیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا (مودودی)

marfat.com

Marfat.com

اور مردوں کو اللہ جل کر کھڑا کرے گا۔ (عبدالماجد)
 اور مردوں کو اللہ جلے زندہ کر کے اٹھادیں گے۔ (مولانا اشرف علی)
 اور مردوں کو اٹھادے گا اللہ (شاہ عبدالقادر)۔
 اور مردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا (فتح محمد)۔
 اور مردوں سے جلادے گا اللہ۔ (شاہ رفیع الدین)
 ان مردوں کو اللہ اٹھائے گا۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر ذکر کیا جا رہا ہے کہ اے محبوب آپ کی دعوت کو وہ قبول کرتے ہیں جو سوچ و سمجھ کے مالک ہیں۔ آپ کی بات کو غور و فکر سے سنتے ہیں (اور کفار آپ کی بات کو تسلیم نہیں کریں گے) ان مردوں کو اللہ اٹھائے گا۔ اسی کی طرف انھوں نے ٹوٹنا ہے۔ یہاں الموتی سے مراد کفار ہیں نہ کہ مطلقاً مردے کیونکہ مردہ کا اطلاق قوت شدہ پر ہوتا ہے وہ عام ہے مومن و کافر سب کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے اگر ترجمہ کیا جائے ”مردوں کو اللہ زندہ کرے گا“ قرآن پاک کا حقیقی مفہوم سمجھ نہیں آتا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ یہاں صرف قیامت اور تمام قوت شدہ کو زندہ کرنے کا ذکر ہے حالانکہ مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود کفار کو اٹھانا مراد ہے جب یہ ترجمہ کیا جائے کہ ”ان مردوں کو اللہ اٹھائے گا“ اب مقصود واضح ہو گا کہ مردہ دل تو کفار ہی ہیں وہی مراد ہونگے جب کہ قرآن پاک نے اس مقام پر کفار کے اٹھانے کا ہی ذکر کیا ہے تو وہی ترجمہ مقبول ہو گا جو مقصود کے مطابق ہو: والموتی ای الکفار شبہہ صریحاً عدم السماع (جلالین) یعنی موتی سے مراد کفار ہیں۔ ان کو مردہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ دعوت حق کو قبول نہیں کرتے: والموتی مبتدای الکفار (مبارک) موتی ترکیبی لفظ سے مبتدا واقع ہو رہا ہے اور اس سے مراد کفار ہیں والموتی ای الکفار (روح المعانی) موتی سے مراد کفار ہیں و فی اطلاق الموتی علی الکفار استعارۃ تبخیرۃ معنیۃ علی تشبیہ کفرہم و جہلہم بالموت (روح المعانی) لفظ موتی کا کفار پر اطلاق استعارہ تبعیہ ہے کیونکہ ان کے کفر و جہالت کو موت سے

تشبیہ دی گئی ہے۔

وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (پ: ۱۱۰)

اور نہ میں جانوں غیب کی بات (محمود الحسن)۔

نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ (مورودی)۔

اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔ (عبدالماجد)

اور نہ میں جانوں غیب کی بات (شاہ عبدالقادر)۔

اور نہ (یہ کہا میں غیب جانتا ہوں (فتح محمد)

اور نہ میں جانتا ہوں غیب کو (شاہ رفیع الدین)۔

اور نہ یہ کہوں کہ میں آپ غیب جان لیتا ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نفی قول ہے یعنی کہنے

کی نفی ہے کہ میں نہیں کہتا اور ذاتی طور پر علم غیب کی نفی ہے نہ کہ عطا فی کی لیکن

اس کے برعکس دوسرے تراجم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مطلقاً غیب کی نفی ہو رہی ہے،

حالانکہ یہ درست نہیں۔ یہاں قول کی نفی ہے۔ اس پر مدارک میں تفسیر ہے: وَلَا

اعلم الغیب النصب عطف علی محل عندی خزائن اللہ لانه

من جملة المقول كانه قال لا اقول لك هذا القول ولا هذا القول

ولا اقول لك ما في ملكي اي لا ادعي ما يستبعد

في القول ان يكون بشئ من ملك خزائن الله و

علم الغيوب ودعوى الملكية وانما ادعى ما كان

لكثير من البشر وهو النبوة

نصب میں ہے کیونکہ اس کا عطف عندی خزائن اللہ کے محل پر ہے اور وہ بھی محل نصب

ہے کیونکہ وہ جملة قول کا مقولہ ہے۔ لہذا مقصد یہ ہوا کہ تمام معطوف اور معطوف علیہ

مقولہ میں کہیں نہ یہ کہتا ہوں اور نہ یہ۔ وَلَا اقول لك ما في ملكي کی تفسیر میں بھی

یہ بیان کرتے ہیں کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا جو انسانی عقل سے بعید ہو کہ ایک بشر کے پاس اللہ کے خزانے ہوں اور علم غیب رکھتا ہو اور فرشتہ ہونے کا دعویٰ دار ہو بلکہ میں وہ دعویٰ کرتا ہوں جو پہلے بھی کثیر نشتر حضرات نے دعویٰ ثبوت کیا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ یہاں قول اور دعویٰ کی نفی ہے نہ کہ علم غیب کی۔

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ذاتی غیب کی نفی ہے نہ کہ عطائی کی۔ اس پر تفسیر حمل کو لو کہتے اعلیٰ الغیب کی تفسیر میں دیکھیں۔ خود واضح ہو گا کہ مطلقاً غیب کی نفی نہیں ہو سکتی لقائل ان يقول قد اخبس صلی اللہ علیہ وسلم عن المخبیات وقد جاءت احادیث فی الصحیح بذللک وهو اعظم من معجزاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فکیف الجمع بینہ وبين قوله ولو کنتم اعلموا الغیب لاستکثرت من الخیر واجیب انه یجتل ان یكون قاله علی سبیل التواضع والادب المعنی لا اعلم الغیب الا ان یطعن فی اللہ علیہ ویقدروا کما اگر کوئی اعتراض کرے کہ نبی کریم نے تو بہت غیبی خبریں دی ہیں اور صحیح احادیث میں اس کا ذکر ہے حالانکہ علم غیب نبی کریم کا عظیم معجزہ ہے تو ان احادیث اور قرآن پاک کی اس آیت کریمہ ولو کنتم اعلموا الغیب لاستکثرت من الخیر میں مطابقت کیسے ہوگی۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نبی کریم نے ہجر و انکساری کے طور پر یہ کہا ہے اور ازرئے ادب کے کہ میں خود غیب نہیں جانتا جب تک مجھے اللہ اس پر مطلع نہ فرمائے اور قدرت نہ دے۔ روح المعانی میں بھی نفی قول ہی ہے: ولا اعلم الغیب عطف علی محل عندی خزائن اللہ فمنہم من قول۔ ولا اعلم الغیب کا عطف عندی خزائن اللہ کے محل پر ہے اور یہ اقوال کا مقول ہے۔

اب تفسیر کے واضح بیانات سے یہ مقصد بخوبی حال ہوتا ہے کہ مطلقاً علم غیب کی نفی نہیں بلکہ از خود غیب کے جاننے کی نفی ہے اور ترجمہ بھی اسی وقت صحیح ہو گا جس سے یہ پتا چلے کہ یہاں ذاتی طور پر غیب کے جاننے کی نفی ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی

مقصدِ عظیم پر دل ہے جس سے دیگر تراجم خالی ہیں۔

فَكُونَنَّ مِنَ الظَّالِمِينَ (پہلے)

پس ہو جائے گا تو بے انصافوں میں۔ (مولانا محمود الحسن)۔

آپ کا شمار بے انصافوں میں ہو جائے گا۔ (عبدالماجد)

تو آپ نامناسب کام کرنے والوں میں ہو جائیں گے۔ (اشرف علی)۔

پھر ہوئے بے انصافوں میں (شاہ عبدالقادر)

تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد)

پس ہو جائے تو ظالموں میں سے (شاہ رفیع الدین)۔

تو یہ کام انصاف سے بعید ہے (اعلیٰ حضرت)۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ

و سلم سے یہ مطالبہ کیا کہ جو غریب صحابہ ہیں جن کا لباس صاف نہیں ان کو اپنی مجلس

سے اٹھا دیں پھر تم آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے بات کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

کہ اے محبوب آپ ان لوگوں کو جو صبح و شام رب کو پکارتے ہیں ان کو اپنی مجلس سے نہ

اٹھائیں وہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ تم پر ان کا کوئی حساب نہیں اور ان پر تمہارے

حساب سے کچھ نہیں۔ پھر اگر آپ ان کو دور کریں تو یہ کام انصاف سے بعید ہے۔

اب اس مقام پر نبی کریم کی طرف نسبت بے انصافی کی کرنا اسی وقت صحیح ہوگا جب آپ

سے اس کا وقوع ممکن ہو جب کہ صحابہ کریم کو مجلس سے اٹھانے کا کفار کا مطالبہ تسلیم

ہی نہ ہو تو بے انصافی کا ترتیب بھی نہ ہو کیونکہ انبیائے کریم کی عصمت کے ہی منافی

ہے۔ جب یہ ترجمہ کیا جائے "پس ہو جائے گا تو بے انصافوں میں"۔ یہ ادب و احترام

اور مقام سید الانبیاء کے منافی ہے۔ لیکن "یہ کام انصاف سے بعید ہے" یہ ادب و

احترام پر مبنی ہے۔ لیکن اٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے کا اورہ کے مطابق معتزضین کا تبصرہ

اعلیٰ حضرت کے خلاف "یہ کام انصاف سے بعید" کا ترجمہ

عربی لغت سے بالکل نابلد ہونے کی روشن دلیل ہے۔ اس ترجمہ کی حقیقت و توضیح ہو چکی ہے کہ یہاں نبی کریم کی شان کے مطابق ہے البتہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لغوی ترجمہ نہیں یا محاورہ ترجمہ ہے تو کیا لغوی ترجمہ کرنا لازم ہے؟ تو یا محاورہ تراجم عربی لغت سے نابلد ہونے کی دلیل ہوں گے۔ اس قاعدہ کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ تو بالکل عربی سے ناواقف پر مبنی ہو گا بلکہ جناب کے ممدوح شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب بھی اس زد میں آئیں گے۔ آئیے اپنا قاعدہ ذرا شیخ الہند صاحب پر جاری کریں کہ وہ بھی یا محاورہ ترجمہ کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک مثال بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں ورنہ کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں :-

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ

اس کا ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب نے کیا ہے؟ ابھی گزر چکا ہے تمہارے

سامنے ایک نمونہ۔ کون سا یہ ترجمہ لغوی ہے؟ جب یہ ترجمہ یا محاورہ جاتا ہے تو نبی کریم کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے یا محاورہ ترجمہ کیا ہے تو اس پر اعتراض یقیناً دلیل ہے کہ شانِ مصطفیٰ کا عیاں ہونا پسند نہیں میرے ایک دوست ایک ہی کسوٹی پر سب کو پرکھیں۔ ایک ہی ضابطہ پر کہیں اعتراض کہیں مدح یہ عقلمندوں کی شان نہیں۔ اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید تفسیر کبیر کر رہی ہے: ان الظلم جبارق
عن وضع الشيء في غير موضعه والمعنى ان اولئك الضعفاء الفقراء
كانوا يستقون التعظيم من الرسول عليه السلام فاذا طرح هو عن ذلك
المجلس كان ذللت ظلما۔ ظلم کا معنی کسی چیز کو اس کے محل کے غیر
میں رکھنا مقصد یہ ہے کہ ضعیف و فقرا نبی کریم کی طرف سے مستحق تعظیم ہیں اگر ان
کو مجلس ظلمے اٹھایا گیا تو یہ اٹھانا انصاف سے دور ہو گا مجلس سے اٹھانا کام
ہی تو ہے۔ اب اس ترجمہ میں کون سا استحالہ باقی رہ گیا ہے کہ یہ کام انصاف سے
بعید ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ

حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۗ (الآية: ۲۳)

اے نبی جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینی کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلائے میں ڈال دے تو تمہیں جس وقت غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ظالموں کے پاس نہ بیٹھو۔ (مودودی)

اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کر یہاں تک کہ مشغول ہو جاویں کسی اور بات میں اور اگر بھلائے تجھ کو شیطان تو مت بیٹھ یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ (مجہود الحسن)

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری نشانیوں کو مشغلہ بناتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آجانے کے بعد (ایسے) ظالم کے پاس مت بیٹھ۔ (عبدالماحد دریا آبادی)

اور اے سننے والے! جب تو انہیں دیکھے جو ہماری آیتوں میں پڑتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے جب تک اور بات میں پڑیں اور جو کہیں تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس مت بیٹھ۔ (اعلیٰ حضرت)

اس آیت کریمہ میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں نسبت عام سننے والے کی طرف سے نبی کریم کی طرف نہیں لیکن دوسرے تراجم میں نسبت نبی کریم کی طرف سے۔ آیت کریمہ کے معنوم کو دیکھنے کے بعد خود ہی صاحب ایمان آدمی سمجھنا ہے کہ یہ حکم نبی کریم کو نہیں بلکہ یہ عام آدمی کو خطاب ہے کیونکہ نبی کریم پر شیطان کا تسلط ممکن نہیں۔ و ذهب بعض المحققین ان الخطاب هنا وفيما قبل لسيد المخاطبين

عليه الصلوة والسلام والمراد غيره وقيل لغينه ابتداء اي اذا سمع آيت
 ايها السامع وان انشأت ايها السامع - (روح المعاني) محققين اس
 طرف گئے ہیں کہ واما ينسئ الشيطان اور واذا رآيت الذين میں خطاب نبی
 کریم کو ہے لیکن مراد آپ کے غیر ہیں۔ اور کچھ حضرات نے کہا ہے کہ یہ خطاب ابتدائی
 طور پر ہی غیروں کو ہے نبی کریم کو نہیں معنی ہی یہ ہے کہ اے سنتے والے جب تو انہیں
 دیکھے، اے سنتے والے جب تجھے شیطان جھلائے : واذا رآيت قبل انه خطاب
 للنبي صلى الله عليه وسلم والمراد غيره وقيل الخطاب لغينه اي اذا
 سمع آيت ايها السامع الذين يخوضون في آيتنا - (کبیر) یہ خطاب نبی
 کریم کو ہے اور مراد آپ کے غیر ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ خطاب ہی غیروں کو ہے۔
 اے سنتے والے جب تو دیکھے ان کو ہماری آیات میں پڑے ہوئے (استہزاء کرتے
 ہوئے)۔

قُلْ اَنْتُمْ عِوَانٌ دُوِّنَ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا ۗ

کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکیں اور نہ بُرا۔
 (فتح محمد)

تو کہہ کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا جو نہ بھلا کرے ہمارا نہ بُرا (شاہ عبدالقادر)
 تو کہہ کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا ان کو جو نہ نفع پہنچا سکیں ہم کو اور نہ نقصان۔
 (مولانا محمود الحسن)۔

اے نبی ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے
 سکتے ہیں نہ نقصان۔ (مودودی)۔

آپ کہہ دیجئے کیا ہم (مسلمان) اللہ کے سوا ایسے کو پکاریں جو نہ ہم کو نفع پہنچا
 سکے اور نہ ہم کو نقصان۔ (عبدالماجد)۔

تو فرماؤ کیا ہم اللہ کے سوا اس کو پوچھیں جو ہمارا نہ بھلا کرے نہ بُرا (علیٰ حضرت)

عام طور پر اس قسم کی آیات اقبیائے کرام اور اولیائے کرام کے حق میں پیش کی جاتی ہیں کہ ان سے استمداد ناجائز ہے یہ توفیق و نقصان کے مالک ہی نہیں حالانکہ بتوں کے حق میں نازل شدہ آیات کو اولیائے کرام کے حق میں پیش کرنا دانشمندی نہیں۔ اندعو کو بمعنی پکارنا لینا کیسے صحیح ہے۔ یہاں تو معنی عبادت کا ہے نہ کہ پکارنے کا۔ قل لا الہ الا اللہ یحییٰ من یشاء ویمیت من یشاء وکان ید عوایاہ الی عبادۃ الودان اندعو انعبد من دون اللہ الضار النافع مالا ینفعا مالا ینفعا علی نفعنا ان دعوناہ ولا یضرنا ان ترکنا۔ (مبارک)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد الرحمن جب ایمان نہیں لائے تھے اپنے والدِ مکرم کو بھی بت پرستی کی دعوت دیتے تھے تو اس وقت یہ حکم ہوا کہ تم کہو کہ کیا ہم اس اللہ جو نفع و نقصان کا مالک ہے، کے غیر کی عبادت کریں جن کی عبادت کرنا نفع نہیں اور ان کی عبادت کو چھوڑنا نقصان نہیں۔ تو ہم ان کی عبادت کیوں کریں۔ اندعو انعبد من دون اللہ مالا ینفعا بعبادتہ ولا یضرنا

بتوں کا کھاؤ اور الاضنامہ (جلالین) کیا ہم اللہ کے غیر کی عبادت کریں جن کی عبادت نفع نہیں دیتی اور جن کی عبادت کو چھوڑنا نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ اللہ کے غیر کیا ہیں؟ وہ بت ہیں۔ اعلم ان المقصود من هذه الآية الرد علی عبدة الاضنام وھی مؤکدة لقوله تعالیٰ قبل ذلك (قل انی نہیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ فقال اندعو من دون اللہ ای انعبد من دون اللہ النافع الضار مالا ینفعا علی نفعنا

ولا علی ضروانا کبیر) اس آیت سے بتوں کی عبادت کرنے والوں کا رد مقصود ہے اور یہ آیت پہلی آیت قل انی نہیت الخ کی تاکید ہے کیونکہ وہاں بھی تدعون بمعنی تعبدون سے اور اعبد صراحتاً بمعنی عبادت کے موجود ہے پس اسی وجہ سے کہا کہ ہم اللہ جو نفع و نقصان کا مالک ہے اس کے غیر کی عبادت کریں جو نفع و ضرر پر قادر نہیں۔

ای نعبد متجاوزین عبادۃ اللہ الجامع لجميع صفات الوہیتہ التي من
 جعلتها القدسۃ علی النفع والضرب مالا یقدس علی نفعنا ان
 عبدناہ ولا علی ضربنا اذا ترکناہ (روح المعانی) کیا ہم اس اللہ کی عبادت
 سے تجاوز کریں جو تمام صفات الوہیت کا مالک ہے اور اس کی قدرت میں نفع
 و نقصان کا مالک ہونا بھی ہے۔ اس کی عبادت کریں جن کی عبادت میں نفع نہیں
 اور ان کی عبادت کو چھوڑنے میں نقصان نہیں یعنی یہ نہیں ہو سکتا۔

ان تمام تفاسیر کی عبارات سے واضح ہوا کہ اندعو کا معنی عبادت ہے نہ کہ
 مطلقاً پکارنا یا دُعا کرنا جیسا کہ اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے ناکام کوشش
 کی گئی ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّي

فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي ه

فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِعَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُهُ

(پ ۷۱)

تویوں ہوا کہ جب رات ابراہیم پر چھا گئی، انھوں نے ایک تارا کو دیکھا جو
 یہی میرا پروردگار ہے۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتے ہوئے تو بولے یہی میرا پروردگار
 ہے۔ پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو بولے یہی میرا پروردگار ہے اور اللہ
 پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے، دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا یہ ہے
 میرا رب۔ پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے میرا رب۔ پھر جب دیکھا سورج
 چمکتا ہوا، بولا یہ ہے میرا رب سب سے بڑا۔ (مولانا محمود الحسن)

پھر جب اندھیری آئی اس پر رات دیکھا ایک تارا بولا یہ ہے رب میرا۔
 پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا۔ پھر جب دیکھا سورج چمکتا

بولایا ہے رب میرا یہ رب سب سے بڑا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارا دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ (اشرف علی)۔

چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک ستارا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب، پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ (مودودی)۔

یعنی جب رات نے ان کو (پردہ تاریکی سے) ڈھانپ لیا تو (آسمان میں) ایک ستارا نظر پڑا۔ کہنے لگے، یہ میرا پروردگار ہے۔ پھر جب سورج کو کہ جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ (فتح محمد جالندھری)۔

پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک ستارا دیکھا بولے اسے میرا رب ٹھہراتے ہو۔ پھر جب چاند چمکتا دیکھا بولے اسے میرا رب بتاتے ہو۔ پھر جب سورج جگمگاتا دیکھا بولے اسے میرا رب کہتے ہو یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور قوم پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل قائم کرنے کا ذکر ہے کیونکہ ان آیات سے پہلے بت پرستوں کو تبلیغ کرنے کا ذکر ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آب آزر کو فرمایا، کیا تم بتوں کو خدا مانتے ہو؟ اسی بت پرستی کی وجہ سے میں تمہیں اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ ان بتوں کے خدائے بن سکنے پر قوم کو اس طرح سمجھایا کہ تم نے ایسے خدا بنا رکھے ہیں جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی نفع و نقصان کے مالک ہیں۔

اس مقام پر ستارہ پرستوں، چاند پرستوں، سورج پرستوں کے رد کرنے کا ذکر ہے اور ان پر خود دلائل قائم ہوئے وہ مذکور ہیں۔ جب رات چھا گئی تو ابراہیم علیہ السلام نے ستارا کو دیکھ کر ستارہ پرستوں کو کہا کہ کیا یہ میرا رب ٹھہراتے ہو جب ستارا چھپ گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں چھپنے والوں کو پسند نہیں کرتا مطلب یہ تھا کہ میں ایسے کو

خدا ماننا پسند نہیں کرتا اس لیے کہ یہ تو خود حادث ہے اس کا کوئی محدث ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب چاند کو جھکتے ہوئے دیکھا تو چاند پرستوں کو فرمایا کہ کیا ان کو میرا خدا بتاتے ہو۔ جب وہ بھی چھپ گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل شامل حال نہ ہوتا اور اس نے مجھے ہدایت نہ عطا کی ہوتی تو میں بھی انہی گمراہوں میں ہوتا۔

اس مقام پر لندن لم یهدنی سابی لا کونین من القوم الضالین کے ترجمہ میں بھی مترجمین کی کشتی بچکونے کھاتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہ کلام تعریض پر مبنی ہے کہ چاند کی پوجا کرنے والے تم گمراہ ہو مجھے تو اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اور بالفرض محل کے بغیر یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اگر اللہ نے مجھے ہدایت پر ثابت نہ رکھا تو میں گمراہ ہو جاؤنگا۔ وہ نبی کیسے نبی ہو سکتا ہے جس پر رب کی ہدایت ثابت نہ رہے۔ اسی وجہ سے اس مقام کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ شان خلیل اللہ کے مطابق ہے ”کہا اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی انہی گمراہوں میں ہوتا“ لیکن برخلاف اس کے اگر ایسا ترجمہ کیا جائے ”بولو اگر نہ راہ دے مجھ کو رب میرا توبے شک میں رہوں بہکتے لوگوں میں“ تو یقیناً وہم ہو گا کہ نبی حالت نبوت میں بھی بہک سکتا ہے۔ اور اس سے رب کی ہدایت دور ہو سکتی ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔

اسی طرح جب آپ نے سورج کو روشن دیکھا تو سورج پرستوں کو کہا اے میرا رب کہتے ہو، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ جب سورج بھی چھپ گیا تو آپ نے فرمایا اے قوم! میں تمہارے مشرکانہ فعل سے بری ہوں۔

اب اس تمہید کے بعد توجہ فرمائیے ترجمہ کرنے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ناواقف کو سمجھ آ جائے یہ مقصد تو نہیں ہوتا کہ عام آدمی قرآن پاک کے ترجمہ کو پڑھ کر قرآن دانی کا دعویٰ داریہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سارہ کو بھی کہا یہ ہے رب میرا، چاند کو بھی کہا یہ ہے رب میرا، سورج کو بھی کہا یہ ہے رب میرا سب سے بڑا۔ حالانکہ اس طرح کا اقرار تو شرک ہے۔ جمیع انبیائے کرام تمکک سے پاک ہیں۔ اسی لیے جلالین، مدارک، روح المعانی، کبیر نے بھی زعمکم کے الفاظ کو مقدر مانا ہے کہ تم اپنے خیال میں ان کو

میرا رب کہتے ہو۔ تفسیر کبیر میں یقولون کو بھی مقدر مانا بیہ۔ معنی یہ ہوگا
 - وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہے میرا رب۔ اس سے واضح ہوا کہ ترجمہ حضرت
 کا تفسیر کے مطابق ہے۔ باقی تراجم میں تو نسبت ہی براہ راست ابراہیم علیہ السلام
 کی طرف کر دی حالانکہ یہ سراسر باطل ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام تو انہی قوم سے یہ
 کلام کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک جانتے تھے۔ آپ کا اللہ تعالیٰ
 کو پہلے ہی جانتا۔ اس پر علامہ رازی نے کئی دلائل قائم کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک
 اختصار کے پیش نظر پیش کر رہے ہوں :- ان ابراہیم علیہ السلام کان قد عرف
 ربہ قبل هذه الواقعة بالدلیل والدلیل علی صفة ما ذکرنا • اخبر عنہ
 قال قبل هذه الواقعة لا یب آذر (اتخذ اصناما الہتانی اسماء وقوم
 فی ضلال مبین) ابراہیم علیہ السلام انہی قوم سے یہ کلام جو فرما رہے ہیں
 اس واقعہ سے پہلے اپنے رب کو جانتے تھے کیونکہ آپ نے اپنے آپ اور قوم
 کو پہلی ہی بت پرستی سے روکا اور فرمایا کہ تم بت پرستی کر رہے ہو میں تمہیں اونکھائی
 قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ یہی وہی وقت ممکن ہے جب خود رب کو پہچانتے
 ہوں۔ ان هذه الواقعة انما وقعت بعد ان اسماہ اللہ ملکوت
 السموات والارض حتی رآی من فوق العرش والكرسى وما تحتها
 الی تحت الثرى ومن كان منصوباً فی الدین كذلك وعلیہ بالثب
 كذلك کیف یلیق بہ ان یعتقد الہیتا لکواکب یہ واقعہ بعد میں درمیش
 آیا اور جو پہلی آیت کریمہ میں ہے۔ وكذلك نرى ابراہیم ملکوت
 السموات والارض وہ پہلے کا ہے۔ آپ کو جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی بادشاہی
 کا دیدار کرایا اور علم دیا یہاں تک کہ آپ نے عرش و کرسی سے اوپر اور نیچے تحت الثری
 تک دیکھا جس کا دین میں منصب ہوا اور اللہ کا اس کو اس طرح علم حاصل ہو، اس کی
 شان کے لائق یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بتوں کے خدا ہونے کا عقاد کرے۔

انہ تعالیٰ قال فی صفة ابراہیم علیہ السلام (اذ جاء ساجداً بقلوب ساجد)

مراتب القلب السليم ان يكون سليما عن الكفر وايضا مدحة وقال ولقد
اتينا ابراهيم من قبل من اول نومان الفكرة وقوله وكنائب
عالمين اي بطهارته وكمالہ ونظيره قوله تعالى امتك اعلم حيث
يجعل من سالتہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں یہ فرمایا ہے :
اذ جاء ربه بقلب سليم جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سلامتی دل کے ساتھ
رب کے پاس پیش ہوئے یعنی قبول کو دل میں جگہ نہ دی بلکہ خالص دل کو رب کی طرف
متوجہ کیا قلب سليم کا کم سے کم یہ رتبہ ہے کہ وہ کفر سے سلامتی میں ہو اور اسی طرح آپ
کو اللہ تعالیٰ نے ابتدائی سوچ میں ہی رشد و ہدایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے طہات
و کمال کو جانتا ہے اور اللہ اسے ہی رسول بناتا ہے جو اس منصب کا اہل ہوتا ہے
ان آیات سے پتا چلا کہ آپ رب کو پہلے ہی جانتے تھے۔ یہ کلام ان لوگوں سے
ان کو ہدایت پر لانے کے لیے تھی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت اب روز روشن کی طرح
عیاں ہوئی کہ آپ نے سارہ یا چاند یا سوچ کے رب ہونے کا اقرار نہیں کیا جیسا دوسرے
تراجم سے ظاہر ہے بلکہ آپ نے انھیں کہا تم اپنے زعم ہال میں انکو میرا رب کہتے ہو، یہ
رب کیسے؟ یہ تو خود کسی کے تالیح ہیں۔

وَكَلَّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ (پ ۱۶)

ان سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ (فتح محمد)۔
اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر۔ (مولانا محمود الحسن)۔
اور ہر ایک کو تمام جہان والوں پر ہم نے فضیلت دی۔ (مولانا اشرف علی)۔
ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت دی۔ (مودودی)۔
اور (ان میں سے) ہر ایک کو ہم نے جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔ (عبدلنا)
اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر (شاہ عبدالقادر)
اور ہم نے ہر ایک کو اس کے وقت میں سب پر فضیلت دی (علیٰ حضرت)

یہاں چند انبیائے کرام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، ایسا، اسمعیل، الیاس، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان کے متعلق ہی وکلاء فضلنا علی العالمین کا ذکر ہے۔ اب اگر یہ ترجمہ کیا جائے، ان میں سے ہر ایک کو یا سب کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ اس طرح تو نبی کریم پر بھی فضیلت لازم آئے گی اور خود ان انبیائے کرام میں سے ہر ایک کو دوسرے پر فضیلت لازم آئے گی۔ حالانکہ یہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے زمانے میں فضیلت کے مالک تھے۔

حضرت کا ترجمہ روح المعانی سے مطابقت رکھتا ہے۔ روح المعانی میں ہے:

وکلای کل واحد من هؤلاء المذكورین لا بعضهم دون بعضهم فضلنا
بالنسبة علی العالمین ای عالی عصرهم ان میں سے ہر ایک کو
اپنے زمانے میں فضیلت دی گئی ہے۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے اپنے زمانے میں فضیلت دی گئی۔

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (پہلے)

تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد)۔
سو تو مت ہوشک کر تو والوں میں ہے۔ (محمود الحسن)۔
تحقیق سو تو مت ہوشک لانے والا۔ (شاہ عبد القادر)۔
سو آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں۔ (اشرف علی)۔
لہذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہوں۔ (مودودی)۔
سو آپ شک کرنے والوں میں نہ ہو جائیں۔ (عبد الماجد)۔
پس مت ہوشک لانے والوں سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
تو اے سننے والے! تو ہرگز شک والوں میں نہ ہو۔ (حضرت)
یہاں بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی یعنی عبدالقادر بن سلام

اور ان کے اصحاب جانتے ہیں کہ بیشک یہ آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو اے سننے والے! تو ہرگز شک والوں میں نہ ہو۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں "اے سننے والے" الفاظ کا اضافہ ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو نہیں بلکہ عام مخاطب کو ہے لیکن باقی مترجمین کے تراجم سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ فلا تکون من المتعجبين الشاكين فيهما السامع (مدارک) اے سننے والے اس میں ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہو فلا تکون خطاباً لكل واحد واحد والمعنى ان لما ظهرت الدلائل فلا ينبغي ان يمتري في احد قيل هذا الخطاب وان كان في الظاهر للرسول الا ان المراد منه امتد كقوله خطاباً لبراهمة كقوله خطاباً لبراهمة

یہ ہے کہ جب دلائل ظاہر ہو چکے ہیں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہیے۔ اور ایک قول یہ کہا گیا ہے۔ اگرچہ ظاہر خطاب نبی کریم کو ہے لیکن مراد آپ کی امت : ويعقل ان يكون الخطاب في الحقيقة للامة على طولي وقصبي

التمريض وان كان له عليه الصلوة والسلام صورة (روح المعاني) اگرچہ ظاہر خطاب نبی کریم کو ہے لیکن حقیقتہً بطریق تعرض خطاب امت کو ہے۔ ان تفاسیر کی رائے سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مطابقت رکھتا ہے۔ شان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاسدار ہے۔ باقی ارباب تراجم بصیرت سے خالی۔

وَإِنْ تَطِعْ أَكْثَرَهُمْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ الْآيَةُ (پہ ۳)

اور اگر تو کہنا مانے گا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھ کو بھلا دیں گے۔ (محمود الحسن)۔

اور اگر تو کہنا مانے اکثر لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تجھ کو بھلا دیں اللہ کی رائے (شاہ عبدالقادر)۔

اکثر لوگوں کو بھلا دیں اگر تم ان کا کہنا مان لو گے تو وہ تمھیں

خدا کا راستہ بھلا دیں گے۔ (فتح محمد
 • اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ
 کی راہ سے بے راہ کر دیں گے۔ (مولانا اشرف علی)۔
 • اور اے نبی! اگر تم ان لوگوں کے اکثریت کے کہنے پر چلو زمین میں بستے ہیں تو
 وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ (موردی)۔
 • اور جو (لوگ) زمین پر آباد ہیں ان میں سے اکثر کا کہنا اگر آپ ماننے لگیں تو وہ
 آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا کر رہیں۔ (عبد الماجد)۔
 • اور اے سننے والے! زمین میں اکثر وہ ہیں کہ تو ان کے کہنے پر چلے تو تجھے اللہ
 کی راہ سے بھکا دیں۔ (علیٰ حضرت)۔

یہاں اکثر سے مراد کفار ہیں: وان تطعم اکثر من فی الاسماء ای الکفار
لانہم الاکثرون مراد کفار ہیں کیونکہ وہ اکثر تھے۔ یہاں خطاب اگر نبی کریم کو ہے
 جیسے عام تراجم اس پر صراحتاً دال ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ لے نبی کریم! اگر تم کافروں کی
 اطاعت کرو گے تو راہِ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ (العیاذ باللہ)۔
 یہاں خطاب نبی کریم کو نہیں بلکہ عام مخاطب کو ہے کیونکہ نبی کریم کا کافروں کی
 تابعداری کرنا اور دین سے بھٹک جانا ممکن نہیں بلکہ خطاب عام مخاطب کو ہے
 جیسا کہ علیٰ حضرت کے ترجمہ سے ظاہر ہے کیونکہ آپ نے ترجمہ میں "اے سننے والے"
 ذکر کیا ہے۔ اور اس خطاب کو عام رکھنے میں علیٰ حضرت منفرد نہیں بلکہ علامہ رازی تفسیر
 کبیر میں اسی کو ذکر کرتے ہیں: اعلم انہ تعالیٰ مما اجاب عن شہوات الکفار
ثم یبین بالتلسیص محۃ نبوۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بین ان بعد ذوال
الشبہۃ وظہور الحجۃ لا ینبغی ان یتلفظ العاقل الی کلمات
الجهال ولا ینبغی ان یتشوش بسبب کلماتہم الفاسدۃ فقال وان تطعم
اکثر من الاسماء ینزلونک عن سبیل اللہ
 جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے شہوات کو زائل کیا اور نبی کریم کی نبوت کی حقانیت

کو بیان فرمایا تو ان کے شبہات کے زوال اور دلائل کے ظہور کے بعد بیان کیا کہ کسی عقل کے مناسب نہیں کہ وہ جاہلوں کی باتوں کی طرف توجہ کرے اور نہ ہی کسی کو ان کے کلماتِ فاسدہ سے پریشان ہونا مناسب ہے۔ تو فرمایا: وان تطع اکثر من فی الارض یصلو لک عن سبیل اللہ یعنی اسے سننے والے عقل کے ہوتے ہوئے اگر تو نے کفار کی بات کو مان لیا تو راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔ اس تفسیر کو جو علامہ رازی نے کبیر میں پیش فرمائی یا اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے اس کو ہر صاحبِ ایمان تسلیم کریگا لیکن مطلقاً ایسا ترجمہ جس میں خطاب عام بھی نہ ہو اور بالفرض چرچی منی نہ ہوئے عقل کیسے قبول کرے۔ اور مولانا مودودی صاحب نے تو اسے ہی ترجمہ کر کے نسبتِ نبی کریم کی طرف کر کے ظلمِ عظیم کیا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ أَهْوَىٰ أَمْوَالِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ

اور نہ چل ان کی خوشی پر جنھوں نے جھٹلایا ہمکے حکموں کو (مولانا محمود الحسن) اور نہ چل ان کی خوشی پر جنھوں نے جھٹلائے ہمکے حکم (شاہ عبدالقادر) اور ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذ کرتے ہیں۔ (مولانا شرف علی)۔

اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے۔ (مودودی) اور نہ ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کیجئے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (عبدالمنان) اور نہ ان لوگوں کی خواہش پر پیروی کرنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (فتح) تو تو اسے سننے والے ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔ (اعلیٰ حضرت) یہاں بھی حسبِ سابق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں "تو اسے سننے والے" ان الفاظ کا ذکر

ہے لیکن باقی تراجم اس سے خالی ہیں۔ باقی تراجم میں نسبتِ نبی کریم کی طرف ہے۔ نبی کریم کا کافروں کی تابعداری کرنا کیسے متصوِّب ہے جبکہ انبیائے کرام معصوم ہیں حقیقت یہی ہے

کہ اس سے مراد نبی کریم نہیں بلکہ آپ کی امت ہے۔ والخطاب قبیل لکل من یصلح لہ
وقیل لسیدالمخاطبین والمراد امتہ (روح المعانی) یا تو خطاب ہر اس شخص
کو ہے جو خطاب کا اہل ہے یا خطاب تو سید الانبیار کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہی ہے
بہر حال دونوں صورتوں میں ترجمہ اے سنتے والے الفاظ کا لانا ضروری ہوا تاکہ یہ اشتباہ ہی
نہ رہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے اور آپ کی شان کے لائق نہیں جب کہ آپ کسی قسم کے
گناہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے تو کیسے ممکن ہے آپ کو کفار کی خواہشات کی تابعداری کرنا۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ
اذْنَحْنَا اللَّهُ مِنْهَا (پ ۹)

بے شک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے
کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ۔ (محمود الحسن)
ہم تو اللہ پر جھوٹ تہمت لگانے والے ہوئے اگر ہم تمہارے مذہب میں آجائیں
(عبدالماجد)

اگر ہم اس کے بعد کہ خدا ہمیں اس سے نجات بخش چکا ہے تمہارے مذہب
میں لوٹ جائیں تو بے شک ہم نے خدا پر جھوٹا فترا باندھا۔ (فتح محمد)۔
ہم نے جھوٹ باندھا اللہ پر اگر پھر آویں تمہارے دین میں جب اللہ ہم کو خدا
کر چکا اس سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر تمہارے دین میں آجائیں بعد اس کے
کہ اللہ نے ہمیں اس سے بچایا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے جب ان سے کہا ہم تمہیں
اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا اپنی تبلیغ جھوٹ
کرہماری دین کی طرف آجاؤ۔ ان کے قول کا جواب حضرت شعیب علیہ السلام نے اس طرح

دیکھو جب اللہ نے ہمیں تمہارے دین باطل سے بچایا ہے۔ اس کے بعد پھر بھی اگر ہم تمہارے دین کی طرف لوٹے تو اللہ پر جھوٹ باندھیں گے۔

اگر یہاں یہ ترجمہ کیا جائے کہ ”ہم نے بہتان باندھا یا جھوٹ باندھا“ اس کا معنی کا تعلق زمانہ ماضی سے ہے۔ حالانکہ یہ حکم ان عدنانی ملتکم پر معلق ہے جس کا تعلق زمانہ استقبال سے ہے ان القوم لما قالوا ذلك اجاب شعيب عليه السلام عن كلامهم بوجهين الاول قوله (اولو كونا كارهيين) الهمزة للاستفهام والواو والواو الحال تقديره اتعيدونني في ملتكم في حال كواهتنا ومع كوننا كارهيين الثاني قوله قد افترينا على الله كذبا ان عدنا في ملتكم بعداذنبنا الله منها والجواب الاول مجرى مجرى الرمز في انه لا يعود الى ملتكم وهذا الجواب الثاني تصريح بان لا يفعل ذلك فقال انان فعلنا ذلك وقد افترينا على الله كبريا جب قوم نے شعیب علیہ السلام کو اپنے دین کی طرف آنے کے لیے کہا آپ نے ان کو دو طرح سے جواب دیا۔ ایک جواب اولو کونا کارہین سے جس میں ہمزہ استفہام اور واو حالیہ ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ کیا ہم تمہارے دین کی طرف توڑیں ایسے حال میں جب کہ ہم اسے ناپسند کرتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہم تو تمہارے دین کو ناپسند کرتے ہیں۔ دوسرا جواب دیا قد افترینا سے گویا پہلا جواب کنایتہ تھا کہ ہم تمہارے دین کی طرف نہیں آ سکتے۔ دوسرا جواب صراحتہ ہے کہ ہم تمہارے دین کی طرف نہیں آ سکتے کیونکہ اگر تمہارے دین کو پسند کریں اور اختیار کریں تو یہ اللہ پر جھوٹ ہوگا۔ ہم اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتے۔ لہذا تمہارے دین کو بھی نہیں اختیار کرتے۔

تفسیر کبیر کی اس تفسیر کے بعد سمجھنا آسان ہوا کہ یہاں معنی شرط و جزا کا ہے۔ زمانہ استقبال کے لحاظ سے ہی ترجمہ صحیح ہے۔ ایسا ترجمہ جو ماضی سے متعلق اس سے وہم ہوتا ہے کہ شاید ایسا واقع ہوا حالانکہ نبی سے کافروں کے دین کو اختیار کرنا محال ہے۔

سَحَرُوا عَيْنَ النَّاسِ (پہلے)

باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو۔ (محمود الحسن)۔

باندھ دیں لوگوں کی آنکھیں۔ (شاہ عبدالقادر)۔

لوگوں کی نظر بندی کر دی۔ (اشرف علی)۔

لوگوں کی نگاہوں پر جادو کر دیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

فرعون نے جو جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے بلائے تھے انہوں نے جب اپنی رسیاں اور لٹھیاں زمین پر ڈال دیں، لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا جس سے وہ سمجھنے لگے کہ یہ سانب ہیں حالانکہ جادو میں کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلتی، صرف دوسرے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا جاتا ہے جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ چیز حقیقتاً بدل گئی حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

عام طور پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ پر ترجمہ لغوی اعتبار سے درست نہیں معترضین کی یہاں کیوں آنکھیں بند ہو گئی ہیں جبکہ سحر کا معنی آنکھ باندھنا نظر بند کرنا لغوی معنی نہیں بلکہ لغوی جادو ہے وہی مراد بھی ہے سحر و اعین الناس صرفوہا عن حقیقۃ ادراکہا (جلالین) ان جادوگروں نے لوگوں کی نظروں کو حقیقت ادراک سے پھیرا کہ وہ کسی چیز کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے: واجتم بہ القائلون بان السحر محض التمیہ قال القاضی لو کان السحر حقاً لکانوا قد سحروا

قلوبہم لآ اعینہم فنبت ان المراد انہم تخیلوا احوالاً عجیبۃ مع ان الامس

فی حقیقۃ ما کانوا علی وفق ما تخیلوہ قال الواحدی بن المراد سحروا

اعین الناس ای قلبوہا عن معنی ادراکہا بسبب تلك التمیہات (کبیر)

سحر صرف بناوٹ، ملمع سازی ہے اسی وجہ سے قاضی نے کہا ہے اگر سحر حقیقت پر مبنی

ہوتا تو جادوگر ان لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے نہ کہ آنکھوں پر۔ بظاہر احوال عجیبہ کا تاثر

دیا نہ کہ حقیقتاً۔ واحدی نے کہا ہے وہ اپنی ملمع سازی کی وجہ سے کسی چیز کی حقیقت

کے ادراک سے پھر دیتے تھے۔ واضح ہوا کہ لوگ دیکھ رہے تھے نہ انکی آنکھیں بند ہوئی
نہ نظریں البتہ ان کی آنکھوں پر جادو کیا گیا وہ حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے اور یہی
معنی جو حقیقت میں مقصود ہے اور تفاسیر کے مطابق ہے وہ اعلیٰ حضرت کا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (پ: ۶۱)

اور مت چلنا مستوں کی راہ۔ (محمود الحسن)۔

اور فساد یوں کی راہ کو دخل نہ دینا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر تواریت لینے کے لیے گئے اور اپنے بھائی حضرت
ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم میں پھوڑ کر گئے اور ان کو جو نصیحت کی اسی کا یہ بھی ایک حصہ
ہے: وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ وَمِنْ دَعَاكَ مِنْهُمْ إِلَى الْإِضْلَالِ فَلَا
تَتَّبِعْ وَلَا تَقْطَعْ (ادراک) جو تمہیں فساد پھیلانے کی طرف بلائے اس کی تابعداری و
اطاعت نہ کرنا یعنی فساد یوں کی راہ کو دخل نہ دینا۔ یہ معنی تو تفسیر کے مطابق اور لغت
کے مطابق ہے لیکن مفسدین کا معنی مستوں کو کسی لغت کے مطابق ہے۔

إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ (پ: ۶۲)

بے شک میرا دواؤ پکا ہے۔ (مولا محمود الحسن)۔ شاہ عبدالقادر)۔

میری چال کا کوئی تور نہیں۔ (مودودی)۔

تحقیق مکر میرا مضبوط ہے۔ (شارح الدین)۔

بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پکی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

ذکر یہ کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں ہم لوگوں کو آہستہ آہستہ
اس مقام میں داخل کریں گے جو ان کے لیے مقامِ ہلاکت ہوگا اس لحاظ سے کہ وہ جانتے
نہیں ہوں گے ان کو یہ مہلت دینا یہ میری بہت خفیہ تدبیر ہے ان کا شدید مواخذہ ہوگا:
أَخَذِي شَدِيدًا مَعَهَا كَيْدًا لَأَنْهَ شَجَبِيهَ بِالْكَيدِ مِنْ حَيْثُ أَسْفَى الظَّالِمِ

احسان فی الحقیقۃ خذلان
 سخت ہوگی چونکہ ظاہر اہمیت دینے میں احسان اور حقیقت میں رسوائی، اسی وجہ سے
 اس کو کید سے ثابت و مشاکلت ہے لہذا اس گرفت کو کید سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 معلوم ہوا کہ یہاں حقیقتاً کید معنی داؤ نہیں بلکہ معنی پکڑ اور خفیہ تدبیر کے ہے اور
 یہی معنی شانِ ربوبیت کے مناسب ہے۔ افسوس کہ توحید کے علمبردار و صدقہ لا شریک
 لذات کی شان سے بھی بے خبر ہے جب کہ وہ ذات جملہ عیوب سے پاک ہے اس کی طرف
 داؤ کی نسبت کا کیا معنی۔ اسی طرح والید کی بات میں بھی مترجمین نے
 ٹھوکریں کھائی ہیں۔

وَيَتَذَكَّرُونَ وَيُنْكِرُونَ اللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ (پ ۱۸)

اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر
 ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور وہ بھی فریب کرتے تھے اور اللہ بھی فریب کرتا تھا اور اللہ کا فریب سب سے
 بہتر ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چالیں چل رہا تھا۔ (مودودی)۔
 ادھر تو وہ چال چل رہے تھے، اور ادھر خدا چال چل رہا تھا اور خدا سب سے
 بہتر چال چلنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔
 اور مکر کرتے تھے وہ اور مکر کرتا تھا اللہ اور اللہ نیک مکر کرنے والا ہے۔ (شاہ
 رفیع الدین)۔

اور وہ اپنا سا مکر کرتے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرماتا تھا اور اللہ کی خفیہ تدبیر
 سب سے بہتر ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اگرچہ اس قسم کی بحث پارہ تین میں گزر گئی تاہم زیادتی وضاحت کے لیے اعادہ کیا
 جا رہا ہے۔ اللہ کی طرف داؤ کی نسبت کرنا یا فریب کی اور یہ ترجمہ کرنا کہ اللہ بھی داؤ کرتا تھا

دیا یہ کہنا کہ اللہ بھی فریب کرتا تھا یہ معانی یقیناً تفسیر کے خلاف ہیں جلالین میں اسی طرح ہے : **وَيُمْكِرُ بِاللَّهِ بِهَمِّ مُتَدَبِّرِينَ** امریک بان اوحی الیک ماد برفہ وامرک بالغوج اسی طرح صاوی کی عبارت اس طرح ہے : **جواب عما یقال ان حقیقتہ المکر محالہ علی اللہ تعالیٰ لانه الاحتیال علی الشئی من اجل حصول المعجز عنہ واجیب ایضاً ان المراد بکمر اللہ معاملتہ لہم معاملتہ الماکر حیث خیب سعیم و ضعیف املہم او المراد جازاہم علی مکرہم فسی الجنا مکر اللہ فی مقابلتہ اللہ تعالیٰ کے مکر سے مراد تدبیر ہے۔ یہ اصل میں ایک سوال کا جواب ہے۔ وہ یہ کہ مکر نسبت حقیقتاً رب کی طرف محال ہے کیونکہ کسی چیز پر حیلہ و مکر اس سے عاجزی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا محال ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مکر سے مراد ان سے مکر والوں کی طرح معاملہ کرنا کہ ان کی کوشش کو رسوا کیا ان کی امیدوں کو ضائع کیا۔ یا مکر سے مراد ہے انکو جزا دینا۔ جزائے مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔**

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۝۱۳۴

آپ کہ دیجیے کہ میں اپنی ہی ذات کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا۔ (عبدالماجد)۔

اے نبی ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ (مودودی)۔

تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے اور نہ بُرے کا (مولانا محمود الحسن) کہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔ (فتح محمد)۔ آپ کہہ دیجیے کہ میں خود اپنی ذاتِ خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا (اشرف علی)۔

تم فرماؤ میں اپنی جان کے بھلے اور بُرے کا خود مختار نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہاں آپ خود مختار اور سوریوں میں اس قسم کی آیت میں "ذاتی" کی زیادتی ہے یہ غلطی ہے، حالانکہ قرآن پاک میں **إِنَّمَا شَاءَ اللَّهُ** الفاظ مبارکہ خود ہی اس معنی پر دال ہیں کہ ذاتی طور پر آپ مالک نہیں ہیں۔ **عَلَيْهِ** اللہ کے آپ کو ملکیت حاصل ہے۔ اعلیٰ حضرت کے معنی کے قریب مولانا اشرف علی صاحب کا موزعہ نظر آتا ہے کیونکہ آپ نے "میں خود" الفاظ زیادہ کئے ہیں۔ اب یہ کہا جائے کہ میں خود مختار یا میں ذاتی طور پر اختیار نہیں رکھتا یا میں خود اختیار نہیں رکھتا، تمام کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کرنا اور مولانا اشرف علی صاحب کے ترجمہ پر اعتراض نہ کرنا انصاف سے بعید ہے۔ مراد بھی یہی معنی ہے۔ تفسیر روح المعانی میں ہے: **إِنَّمَا شَاءَ اللَّهُ** ای الوقت مشیئة سبحانه بان یمكنی من ذلك فانی حیثئذ ملک بعشیتة یعنی میں اپنی جان کے نفع و نقصان کا مالک نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے جب وہ مجھے اس کی قدرت عطا کرے تو اس وقت میں اس کی مشیت سے مالک ہوتا ہوں۔ اب یہاں سے واضح ہوا کہ نفی ذاتی ملکیت کی ہے نہ کہ عطائی کی بلکہ عطائی کا ثبوت خود قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ اس پر اعتراض کیا اور پریشان ہونے کی کیا وجہ! اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے: **المراد لا املك لنفسی من الصن والنفع الا قدس** ماشاء الله ان یقدسنى علی و یمكنی منه والمقصود من هذا الكلام بیان انه لا یقدس علی شی الا اذا قدس الله علیه مراد یہ ہے کہ میں خود بغیر مشیت ایزدی اور اس کی قدرت کے عطا کے نفع و ضرر کا مالک نہیں مقصود اس کلام سے یہ ہے کہ بغیر اللہ تعالیٰ کے قدرت عطا کرنے کے میں کسی چیز پر قادر نہیں۔ اس سے بھی یہ مقصد واضح ہوا کہ نبی کریم خود مختار نہیں ذاتی طور پر نفع و نقصان کے مالک نہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ آپ کو قادر کرنے تو آپ کو قدرت و ملکیت حاصل ہوتی ہے

بِرَاءةٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ هَدَىٰ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (پناہ)
 جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول سے ان مشرکوں کو جن سے تم کو ہدایت
 (شہ عابد قادری)

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے بیزاری ہے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا۔ (اشرف علی)۔

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔ (محمود الحسن)۔

(اے اہل اسلام اب) خدا اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا بیزاری (اور جنگ کی تیاری) ہے (فتح محمد)۔

اعلانِ برأت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ (مودودی)

دست برداری ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکین کے عہد سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا (عبد الماجد)۔

بیزاری کا حکم سنا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمہارا معاہدہ ہوا تھا۔ اور وہ قائم نہ ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے کیونکہ بیزاری کا حکم ان مشرکوں سے دیا گیا جنہوں نے وعدے کو توڑا تو اپنے وعدہ پر قائم نہ رہے کیونکہ بعض وعدے پر قائم بھی رہے تھے۔ اس پر خود آنے والی آیت میں الا الذین عاہدتم من المشرکین ثم لحد ینقضوا کھ شیئا مستثناہ وائل ہے کہ تمام نقض عہد کے ترکیب نہیں

ہوئے تفسیر کبیر میں ہے: قال الزجاج انما عائد الی قوله (بیوۃ) واللتقدیس بیوۃ من ائمتہ ورسولہ الی المشرکین المعاہدین الامن الذین لحد

ینقضوا العہد زجاج نے کہا ہے کہ اس اشارہ کا تعلق برآة سے ہے۔ چاہل کلام یہ ہے کہ بیزاری کا حکم ان مشرکین سے ہے جنہوں نے وعدہ کیا اور پھر توڑا، سوائے ان کے جنہوں نے وعدہ نہیں توڑا۔

اب اس بیان کے بعد واضح ہوا کہ بیزاری کا حکم عام نہیں بلکہ ان سے ہے جنہوں نے وعدہ کو توڑا۔ انکو چار ماہ کی مہلت دی گئی اور فرمایا کہ اس کے بعد اگر تم وعدہ پر قائم نہ رہے

تو ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصل ہوگی۔ تفسیر مدارک کی عبارت اور زیادہ وضاحت کرتی ہے، وہ یہ ہے: **سَوَىٰ اِنَّهُمْ عَاهَدُوا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ اَهْلِ مَكَّةَ وَغَيْرِهِمْ مِنَ الْعَرَابِ فَنَكَثُوا الْاِنْسَانَ سَامِعًا مِنْهُمْ وَهُمْ بَنُو خَمْرَةَ وَبَنُو كِنَانَةَ** بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا مشرکین تکہ وغیرہ سے معاہدہ ہوا تھا لیکن مشرکین نے وعدہ کو توڑ دیا سوائے چند کے۔ وہ وعدہ کونہ توڑنے والے بنو خمرہ اور بنو کنانہ تھے۔ اب واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ صحیح مقصد کو واضح کر رہا ہے کیونکہ مقصود ہی یہ بیان کرنا ہے کہ ان مشرکین سے بیزاری کا حکم ہے جنہوں نے وعدہ کو توڑا۔

خیال ہے کہ یہاں نقض عہد کی وجہ سے بیزاری ہے جو مقید ہے مطلقاً مشرکین سے بوجہ شرک بیزاری کا ذکر دوسری جگہ ہے تفسیر کبیر میں ہے: **لِقَاتِلِ اَنْ يَقُولَ لَا فَرْقَ بَيْنَ قَوْلِهِ بِرَاةٍ مِنْ اُمَّتِهِ وَسَوْءٍ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَبَيْنَ قَوْلِهِ اِنَّ اُمَّتَهُ بِرِيٌّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَسَوْءٍ فَا الْفَائِدَةُ فِي هَذَا التَّكْرِيدِ يِهَاهَا سَوَالٌ يَهْوَنَا هِيَ كَهَا اَنَّ دَوْنُوْنَ اَيُّتُوْنَ فِي بِنَاظِرِ فَرْقِ نَظَرٍ نِهَيْ اَتَا كِيُونَكِهْ دَوْنُوْنَ جُكُهْ فِي اللّٰهْ اَوْرَا سِ كِهْ رُوْلُ صَلِي اللّٰهْ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِي طَرْفِ كِهْ بِيْزَارِي كَا حُكْمِ هِيَ۔** تو پھر تکرار کا کیا فائدہ؟

اس سوال کے جواب میں کئی وجوہ سے ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے: **وَالْوَجْهُ الثَّلَاثُ فِي الْفَرْقِ اِنَّ تَعَالَىٰ فِي الْكَلَامِ الْاَوَّلِ اَظْهَرَ الْبِرَاةَ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ عَاهَدُوا وَنَقَضُوا الْعَهْدَ فِي هَذِهِ الْاَيَّةِ اَظْهَرَ الْبِرَاةَ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ غَيْرَانِ وَصِفَمُ بِوَصْفِ مَعِيْنٍ تَنْبِيْهًا عَلٰى اَنَّ الْمَوْجِبَ لِهَذِهِ الْبِرَاةِ كُفْرُهُمْ وَشُرْكُهُمْ دَوْنُوْنَ اَيُّتُوْنَ فِي فَرْقِ** یہ ہے کہ پہلی آیت میں ان مشرکین سے اظہار بیزاری ہے جنہوں نے وعدہ کیا اور پھر ثانیہ اور دوسری آیت میں مطلقاً مشرکین سے بوجہ کفر و شرک بیزاری کا اظہار ہے جو کسی خاص وصف سے متصف نہیں۔

اِذَا خَرَجَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (پانچویں)

جس وقت نکالا تھا اس کو کافروں نے (مولانا محمود الحسن)۔

جس وقت اسکو نکالا کافروں نے (شاہ عبدالقادر)۔

جب آپ کو کافروں نے جلا وطن کر دیا تھا۔ (مولانا اشرف علی)۔

جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا۔ (میر دودی)۔

جب ان کو کافروں نے گھروں سے نکال دیا۔ (فتح محمد)۔

جبکہ ان کو کافروں نے وطن سے نکال دیا تھا۔ (عبدالماجد)۔

جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر لشریف لے جانا ہوا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر نبی کریم کے واقعہ ہجرت کا ذکر ہے۔ ایک ہی بات کو ذکر کرنے کے انداز

میں نمایاں فرق ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ادب احترام کی کرنیں روشن ہیں۔ کیسا خوب

ترجمہ ہے کہ ”جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر جانا ہوا“ لیکن اس کے برعکس یہ

ترجمہ اس کو کافروں نے نکالا، کس طرح ادب احترام کے کوسوں دور ہے؟ اور اردو محاورہ

سے بے خبری۔ کیونکہ اردو میں ادب اور غیر ادب کا لحاظ الفاظ ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔

جب تک دل میں محبت مصطفیٰ نہ پائی جائے اس وقت تک یہ لحاظ کرنا کہ ایسے الفاظ

استعمال کیے جائیں جن میں تعظیم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پائی جائے، ممکن نہیں۔

فَتَبَّطَّهْمُ (پتا پتا)

سورہ کو دیا ان کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اس لیے ان کو توفیق نہیں دی۔ (اشرف علی)۔

تو ان کو پہلے جھلنے ہی نہ دیا۔ (فتح محمد)۔

تو ان میں کاہلی بھردی (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے۔ یہاں پر غزوة تبوک کا ذکر ہے

کہ (منافقین) جن کا اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں اور ان کے دل دین میں شک کرتے ہیں اور وہ اپنے شک میں متردد ہیں وہی غزوة تبوک سے چھپے رہنے کی اجازت طلب کرتے ہیں

اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کی تیاری بھی کرتے یعنی آلات جنگ اور زادِ راہ تیار کرتے۔
لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا ناپسند ہوا تو ان میں سُستی کو بھر دیا۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”توان میں کاہلی بھردی“ تفاسیر کے مطابق ہے: فَتَبْتَهُمْ كَسَلَهُمْ
(جلالین) ان کو سست کیا۔ فَتَبْتَهُمْ فَكَسَلَهُمْ وَغَيْتَهُمْ (مدارک) پس ان میں کاہلی کو بھر
دیا اور اتنی رغبت کو ضعیف کیا۔ اگرچہ کاہلی کو روکنا مستلزم ہے لیکن حقیقت مقصود یہی
ہے کہ ان میں کاہلی کو بھر دیا اور وہ بوجہ کاہلی کے غزوة تبوک میں حاضری سے رُکے

فَيَسْخَرُونَ مِنْكُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْكُمْ رِبًّا

سو ان سے یہ تمسخر کرتے ہیں، اللہ ان سے تمسخر کرتا ہے۔ (عبدالماجد)۔
اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہِ خدا میں) دینے کے لیے اس کے
سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں
کا مذاق اڑاتا ہے۔ (مودودی)۔

پھر ان پر ٹھٹھے کرتے ہیں اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے (محمود الحسن)
توان سے ہنستے ہیں توان سے ہنسی کی مراد ہے گا۔ (اعلیٰ حضرت)
اس جگہ بر منافقین کا ذکر ہو رہا ہے جب کہ مسلمانوں نے آیتِ حمدِ قد کے نزول کے بعد
اپنی اپنی طاقت کے مطابق مال پیش کیا تو جن مسلمانوں نے زیادہ مال پیش کیا انکا منافقین نے
استہزاء کیا کہ یہ ریاکار ہیں، اور جن غریبوں نے تھوڑا مال پیش کیا ان کا استہزاء کیا کہ یہ تھوڑا
سامان لے آئے منافقوں نے تو حقیقتاً مسلمانوں سے ہنسی کی یعنی ان کا ٹھٹھا کیا۔ لیکن

۱۔ مولانا اشرف علی صاحب اور مولانا فتح محمد صاحب کے ترجمہ میں نفی کا معنی کس حرفِ نفی
کا ہے۔ کیا کوئی حرفِ نفی پوشیدہ ہے۔ جب یہ نہیں تو نفی کا ترجمہ تمہارے اپنے اصول کے مطابق باطل ہے
کیونکہ کسی عربی لفظ کا معنی نہیں۔ ان تراجم کی غلطی پر قلم کو جنبش نہ آئی صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ
میں کہ جصلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب کہنے میں اتنی ریشمائی کیوں آئی ہے؟

بِسْمِ اللّٰهِ اِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ جَزَاءِ كَيْفَ عَسَىٰ اَنْ يَّكُوْنَلَ لَكَ اَللّٰهُ تَعَالٰى كَا تَعْلَمُوْنَ اِس كِي شَان كِي خَلَا فِ هِي هِيَ اَعْلٰى
 جہنمت کے ترجمہ پر ہی تفاسیر دال ہیں جازا ہم علی معزیتہم (مدارک) ان کو اللہ
 تعالیٰ ان کے تمسخر کی جزا دیجھا۔ جلالین میں بھی اسی طرح عبارت ہے البتہ اس عبارت پر
 حاشیہ یہ ہے: قول جازا ہم فس معزیتہ تعالیٰ بذلت لتزلیہم عنہا
 اللہ تعالیٰ کی معزیت کی تفسیر جزا سے کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ٹھٹھا کرتے سے پاک ہے۔
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہی فوجیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت کا لحاظ کیا گیا ہے۔
 افسوس کہ توحید کے علمبردار رب تعالیٰ کی شان کو مد نظر رکھ کر ترجمہ نہ کر سکے اور نہ سمجھ سکے
 کہ اس طرح کا ترجمہ عام اردو خون کو کتنی ہی دشواریوں میں ڈالے گا۔ ترجمہ کرنے کا مقصد تو
 یہ ہے کہ آسانی پیدا کی جائے نہ کہ مشکل میں پھنسانا۔

سَوَّ اللّٰهَ فَتَسِيْرُهُمْ (پ ۱۴)

یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں بھلا دیا۔ (موردوی)۔

انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ان کو بھلا دیا (فتح محمد)۔

بھول گئے خدا کو پس بھول گیا ان کو اللہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔

بھول گئے اللہ کو سو وہ بھول گیا ان کو۔ (ممود الحسن)۔

وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ دیا۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ

دیا۔ جب کہ دیگر مترجمین نے یہ تراجم کیے کہ وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ ان کو بھول گیا۔

حالانکہ یہ ترجمہ غلط ہے۔ یہ معتبر ہی نہیں کیونکہ یہاں مجاز مرسل ہے ذکر مژوم کا ہے۔

لازم ہے۔ دونوں جگہ پر معنی بھولنے والا غلط ہے کیونکہ انسان کو بھولنے پر مواخذ نہیں

اور اللہ تعالیٰ کا بھول جانا بھی محال ہے وہ خدا ہی کیا جو بھول جائے تفسیر کبیر میں اس

طرح پیش کیا گیا ہے: سَوَّ اللّٰهَ فَتَسِيْرُهُمْ واعلم ان هذا الكلام لا يمكن

اجلہ علی ظاہرہ لاننا لو حملناہ علی الضمیان علی الحقیقۃ فلا یستحق

عليه ذمالات النسيان ليس في وصف البشر وايضا في حق الله تعالى
 محال فلا يد من التاويل وهو من وجهين الاول معناه انه محذور
 امره حتى صار بمنزلة المنسوي فجاز لهم بان يصيروهم بمنزلة المنسوي
 من ثوابه ورحمته وجزاء هذا على اوجه الكلام كقولهم وجزاء سميته
 سميته مثلها الثاني بالنسيان عند الذكر فلما تركوا ذكر الله بالصلاة
 والشكر على الله ترك الله ذكرهم بالرحمة والاحسان وانما حسن جعل
 النسيان كناية عن ترك الذكر لان من نسي شيئا لم يذكره فجعل اسم الملزوم
 كناية عن اللازم . جانتے بے شک اس کو کلام کو ظاہر پر جاری کرنا ممکن نہیں اس
 لیے کہ اگر ہم حقیقتاً نسیان کا معنی لیں تو وہ لوگ ذمّت کے مستحق نہیں ہو سکتے کیونکہ نسیان انسان
 کی طاقت میں نہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی نسیان کا اطلاق محال ہے کیونکہ
 وہ تو بھولنے سے پاک ہے۔ اس لیے یہاں تاویل ضروری ہے وہ تاویل دو طرح ہے۔
 پہلی تاویل یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کو چھوڑا یہاں تک کہ یہ منیر ل بھولنے
 کے ہے۔ رب تعالیٰ کا ان کو جزا دینا یہ رحمت سے بھلانے کے مترادف ہے۔ یہ کلام اسی
 طرح ہے جیسے دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے جزا دینے کو سیتہ سے تعبیر فرمایا۔ دوسری
 تاویل یہ ہے کہ نسیان ضد ہے ذکر کی جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی
 شکر کو چھوڑا تو رب تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت و احسان سے یاد کرنا چھوڑا۔ یہاں نسیان
 کا معنی ترک ذکر ہی اچھا ہے۔ ملزوم کو لازم سے کناہ بنا یا گیا ہے۔

علامہ رازی کے اس بیان کے بعد کوئی شخص بھی جو صاحب علم و دانش ہے اور
 ضد و عناد سے دور ہے اور انصاف کی نظر سے دیکھتا ہو وہ یقیناً علیٰ حضرت کے تبرہ
 کو ہی فوقیت دیکھا اور دیگر ترجمہ میں مترجمین کی معمول اور تعاسیر کے اقوال سے عدم توجہ
 کو سمجھ جاتے گا۔ افسوس! کہ توحید کے دعوے دار خدا کی شان کو بھی سمجھنے سے قاصر
 رہے۔

السَّائِحُونَ (پہلے)

بے تعلق رہنے والے۔ (مولانا محمود الحسن، شاہ عبدالقادر)۔

اس کی قاطر زمین میں گردش کرنے والے (موردوی)۔

راہ میں پھرنے والے (شاہ رفیع الدین) روزے والے (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہی معنی راجح ہے۔

جلالین میں ہے: السَّائِحُونَ الصَّائِمُونَ جلالین کے حاشیہ پر بحوالہ خطیب اس

طرح ہے السَّائِحُونَ واختلف في المراد منهم فقال ابن مسعود وابن عباس

هم الصائمون قال ابن عباس رضي الله عنهما كل ما ذكر في القرآن من

السياحة فهو الصوم وقال صلى الله عليه وسلم سياح امتي الصوم وقال عثمان

بن مظعون الجهاد في سبيل الله سياحة وقال

عطاء السائحون هم طلاب العلم يعني السائحون سے مراد

روزہ دار ہیں۔ اگرچہ اس کی مراد میں اختلاف کیا گیا ہے لیکن حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے کہ السائحون سے مراد روزہ دار ہیں بلکہ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس جگہ بھی سیاحت کو استعمال کیا گیا ہے وہ

بمعنی روزہ کے ہی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میری امت کا

سیاح روزہ ہے۔ البتہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے سیاحت سے مراد جہاد فی

سبیل اللہ لیا ہے اور حضرت عطاء نے السائحون سے مراد علم کے طلباء لیے ہیں تاہم زیادہ

راجح قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہی ہے۔

تفسیر کبیر میں السائحون کا معنی روزہ دار کرنا اچھا کہا گیا ہے اور اسی معنی کے حسن پر

دلائل قائم کئے گئے ہیں تفسیر کبیر میں اس طرح آتا ہے: السائحون في اقول

القول الاول قال عامة المفسرين هم الصائمون وقال ابن عباس

كل ما ذكر في القرآن من السياحة فهو الصيام وقال النبي عليه الصلوة

والسلام سیاحت امتی الصیام وعن الحسن ان هذا صوم الفرض
وقيل هم الذين يديمون الصيام وفي المعنى الذي لاجله حسن
تفسير السائم بالصائم وجهان الاول قال الاصحى قیل للصائم سائم
لان الذي يسيم في الارض متعبد الا زاد معه كان ممسكاً عن الاكل
والصائم يمسك عن الاكل فللهذه المشابهة يسمى الصائم سائماً
الثاني ان اصل السياحة الاستمرار على الذهاب في الارض
كالماء الذي يسيم والصائم يستمر على فعل الطاعة وترك المشتري
وهو الاكل والشرب ^{والوقاع} والجماع وعندى فيه وجه آخر وهو ان
الانسان اذا امتنع من الاكل والشرب والوقاع
وسد على نفسه ابواب الشهوات انفتحت عليه ابواب الحكمة
وتجلت له انوار عالم الجلال ولذلك قال عليه الصلوة والسلام من
اخلى الله اربعين صباحاً ظهرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه
فيصير من السائحين في عالم الجلال امثله المتقلبين من مقام الى
مقام ومن درجة الى درجة فيحصل له سياحة في عالم الروحانيات
السائحون میں کئی اقوال ہیں۔ عام مفسرین کے نزدیک روزے والے ہیں۔ حضرت ابن
عباس نے فرمایا، قرآن پاک میں جس جگہ بھی سیاحت ذکر ہے اس سے مراد روزہ ہی ہے۔
حضرت حسن فرماتے ہیں اس سے مراد فرضی روزہ ہے اور بعضوں نے کہا اس سے مراد
ہمیشہ روزہ میں ہوتا ہے۔ سائح کی تفسیر روزہ سے کرنے میں دو طریقے سے حسن پایا جاتا ہے
ایک یہ کہ ازہری فرماتے ہیں روزہ دار کو سائح کہا گیا ہے اس لیے کہ جو شخص زمین میں عاجزانہ
طور پر متوکل ہو کر چلے، اس کے پاس زادِ راہ نہ ہو، کھانے پینے سے رکا ہے اس کو سائح
کہتے ہیں۔ روزہ دار بھی چونکہ کھانے پینے سے اپنے آپ کو روک کر رکھتا ہے اسی مشابہت
کے پیش نظر اس کو سائح کہتے ہیں۔

دوسری وجہ حسن یہ ہے کہ اصل سیاحت کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر ہمیشہ چلنا جس

طرح پانی ہمیشہ چلتا ہے چونکہ روزہ دار بھی فعل طاعت پر ہمیشگی کرتا ہے کیونکہ وہ خواہشات یعنی کھانے پینے، جماع سے دور رہتا ہے اس لیے روزہ دار کو ساخ کہا گیا ہے۔ علامہ رازی فرماتے ہیں، میرے نزدیک ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان جب کھانے پیتے اور جماع سے رک جاتا ہے تو گویا وہ اپنے نفس پر خواہشات کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ جب وہ خواہشات کے دروازے بند کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر حکمت کے دروازے کھول دیتا ہے اور اس پر عالم جلال کی تجلیات منور ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے نبی کریمؐ نے فرمایا، جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی خاطر اپنے آپ کو چالیس صبح وقف کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر ہوتے ہیں پس وہ شخص صاحبین سے ہو جاتا ہے۔ صاحبین وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم جلال میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسرے درجہ پر منتقل ہوتے ہیں پس اس شخص کو عالم ارواح میں سیاحت کا مقام حاصل ہوتا ہے اسی وجہ سے روزہ دار کو ساخ کہا گیا ہے کہ وہ بھی اسی طرح ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا ہے جس طرح ساخ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا ہے۔

اب اندازہ کیا جائے کہ ساخوں کا معنی روزے والے کتنا اچھا تفسیر کے مطابق ہے اور اس کے حسین ہونے پر کس طرح دلائل قائم کئے گئے ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (پ ۶)

- پھر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا۔ (مودودی)۔
- پھر قائم ہوا اور عرش کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- پھر قائم ہوا عرش پر۔ (مولانا محمود الحسن)۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- پھر عرش پر قائم ہوا (مولانا اشرف علی)۔
- پھر تخت (شاہی) پر قائم ہوا۔ (فتح محمد)۔
- پھر عرش پر استوار فرمایا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ آیت کریمہ اصل میں متشابہات کی اس قسم سے ہے جن کا بظاہر معنی معلوم ہوتا ہے لیکن مقصد حقیقی معلوم نہیں ہوتا اس لیے جو معنی بظاہر معلوم ہوتا ہے اس کو پیش کرنا عام آدمی کو الجھن میں ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے کہ جب علمی نکات سے بے خبر انسان فقط اردو ترجمہ کا سہارا لیتے ہوئے علمیت کا دعوے دار پڑھے گا وہ یقیناً یہی سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قیام فرمایا حالانکہ یہ درست نہیں۔ آئیے اللہ تعالیٰ کے ترجمہ کو تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیں جلالین میں ہے: استواء یلیق بہ استواء فرمایا جو اس کی شان کے لائق ہے۔ اس پر حاشیہ اس طرح ہے: استواء یلیق بہ ہذہ طریقۃ

السلف المفروضین وطریقۃ الخلف التوولین ان المراد بالاستواء الاستیلاء والتصرف وفي الکرخی فی استواء یلیق بہ یشیر بہ الی ان الاستواء علی العرش صفة له سبحانه بلا کیف ومعناه انه سبحانه استوی علی العرش علی الوجه الذی عناه فنزها عن التمكن والاستقرار والیضا ظاہر الایۃ یدل علی انه تعالیٰ انما استوی علی العرش بعد خلق السموات والارض لان کلمۃ تبع للترخی وذلک یدل علی انه تعالیٰ کان قبل العرش غنیاً عن العرش فلما خلق العرش امتنع ان یتقلب حقیقۃ وذاکہ عن الاستغناء الی الحاجة فوجب ان یرقی بعد خلق العرش غنیاً عن العرش ومن کان كذلك امتنع ان یرقی مستقراً علی العرش فثبت بما ذکر انه لا یرقی حمل هذه الایۃ علی ظاہرہا بل انما هذا البیان جلالة ملكه وجلالة سلطانه بعد بیان عظمت شانہ وسعۃ

قدساتہ بما مرض خلقہا تیک الاجرام العظام ۱۲ ج

استواء جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یہ قول سلف صاحبین کا ہے جو اس قسم کی آیات کا علم اللہ ہی کی طرف تفویض کرتے ہیں اور متاخرین جو آیات کی تاویل کرتے ہیں ان کے نزدیک استواء سے مراد غلبہ اور تصرف ہے۔ اور کرخی میں ہے کہ استواء جو اس کے

لائی ہے اس سے مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ کا استوار عرش پر بلا کیف ہے بمقصد اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر استوار اس طرح ہے کہ وہ اس پر چمکن ہونے اور قرار پکڑنے سے پاک ہے۔ اور ظاہر آیت اس پر بھی دال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استوار عرش بر زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا اس لیے کہ کلمہ تم تراخی کے لیے آتا ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق عرش سے قبل عرش سے بے پرواہ تھا جب عرش کی تخلیق ہوئی تو اس کے بعد بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بے پروا ہی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حاجت سے بے پرواہ ہونے کی حقیقت کا انقلاب منح ہے پس ضروری ہے کہ تخلیق عرش کے بعد بھی اللہ تعالیٰ عرش سے بے پروا ہی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ آیت کریمہ کو ظاہر پر رکھنا ممکن نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ملک و سلطنت کا بیان ہے جب کہ پہلے اس کی عظمت شان اور وسعت قدرت کا بیان ہے۔ اب اس سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ قیام معنی کرنا درست نہیں بلکہ استوار جو اس کی شان کے لائق ہے یہی مناسب ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے: ان هذا ايوهم كونه تعالى مستقرا على العرش
 یہاں وہم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قیام فرمایا، اس کے جواب میں اگرچہ بسیط
 کلام کی گئی لیکن لب لباب یہ ہے: هذا الآية لا يمكن حملها على الظاهر
 یہ آیت ظاہر پر محمول نہیں ہو سکتی کہ یہ معنی لیا جائے کہ عرش پر قیام پکڑا یا قیام کیا۔

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا (پ ۱۸)

کہ دے اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے جیلے (مولانا محمود الحسن)۔
 تو کہ اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے جیلے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 کہ دو خدا بہت جلد جیلے کرنے والا ہے۔ فتح محمد۔
 اللہ بہت کرنے والا ہے مکر۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 ان سے کہو اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے۔ (مودودی)۔

فرما دوا اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے جلد ہو جاتی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق مکر و حیلے نہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین نے اس کو مجاز پر محمول کیا ہے۔ جلالین نے مکر کی تفسیر مجازات سے کی ہے یعنی جزلے مکر کو مکر سے تعبیر کیا ہے۔ روح البیان میں ہے اسرع مکر ای اجعل عقوبتہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا جلدی دی جاتی ہے۔ اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے قل ان اللہ اسرع مکرًا فالعسی ان هؤلاء الکفار لما قابلوا نعمتہ اللہ بالمکر۔ فان اللہ سبحانہ و تعالیٰ قابل مکرہم بمکر اشد من ذلك وهو من وجہین الاول ما عدلہم یوم القیمتہ من العذاب الشدید و فی الدنیا من الغضیبتہ والخزی والنکال۔ والثانی ان رسول اللہ یکتبون مکرہم ویحفظونہ و تعرض علیہم ما فی بواطنہم الخبیثۃ یوم القیمتہ و یكون ذلك سبباً للغضیبتہ التامۃ والخزی والنکال نحوذ

بانتہ تعالیٰ منہ یعنی کفار نے جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مکر سے مقابلہ کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کا شدید طور پر مقابلہ کیا۔ اللہ کی طرف مکر کی نسبت دو وجہ سے ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قیامت میں شدید عذاب تیار کیا ہے اور دنیا میں رسوائی اور ذلت، عذاب ان کے لیے تیار کیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کے ملائکہ ان کے مکر کو صحف میں لکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں اور قیامت کے دن ان کی خباثت باطنی کو ان پر پیش کر دیا جائے گا اور یہ ان کے لیے کامل ذلت و رسوائی ہوگی۔ اللہ کی پناہ اس سے!

اب اس تقریر کے بعد واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ مکر نہیں فرماتا بلکہ اس کی خفیہ تدبیر ہے کہ ان کو عذاب دیگا، قیامت کے دن ان کو رسوا کرے گا۔ اب دیکھا جائے گا کہ یہ ترجمہ بہتر ہے کہ اللہ جلدی حیلے کرتا ہے یا یہ معنی درست ہے کہ اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے جلدی ہو جاتی ہے؛ یقیناً وہی معنی درست ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ جب مکر و فریب سے پاک ہو تو اس کو مکار کہنا، جلد باز، چال چلنے والا کہنا

کسی طرح بھی درست نہیں۔

وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (پ ۹)

اور اپنے مکانوں کو قبلہ ٹھہراؤ۔ (مودودی)۔

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ کی طرف۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور کرو گھروں اپنوں کو رو بہ قبلہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور اپنے گھروں کو نماز کی جگہ کرو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو حکم ہے، قوم کو کہو کہ مصر میں تم مکانات بناؤ اور گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے، گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ اور دوسرے تراجم میں گھروں کو قبلہ کی طرف بناؤ۔ لیکن اسی مقام پر بھی تفاسیر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر دال ہیں۔ جلالین میں ہے: واجعلوا بیوتکم قبلتہ

مصلیٰ تملون فیہ لتامنوا من الخوف وکان فرعون بمنعہم من الصلوۃ

اپنے گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ اور ان میں نماز ادا کرو تاکہ تم خوف سے امن میں رہو کیونکہ

فرعون ان کو نماز سے روکتا تھا۔ تفسیر کبیر میں اگرچہ تین قول بیان کئے گئے ہیں لیکن اس

کے بعد ان کی اپنی بحث اسی قول کو راجح کر رہی ہے: من الناس من قال الم یأمن

البیوت المساجد بعض نے کہا ہے کہ بیوت سے مراد مساجد ہیں۔ پھر آگے اسی قول

کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا والواد من قوله واجعلوا بیوتکم قبلتہ ای اجعلوا

بیوتکم مساجد تستقبلونہا لاجل الصلوۃ تم اپنے گھروں کو مسجدیں (نماز کی جگہ) بناؤ۔

نماز کے لیے ان کی طرف متوجہ ہو۔

اس کے بعد اس واقعہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ذکر الغمرون

فی کیفیتہ ہذا الواقعة وجوہا ثلاثہ الاول ان موسیٰ علیہ

السلام ومن معہ کانوا فی اول امرہم مامورین بان

marfat.com

Marfat.com

یصلوا فی بیوتہم خفیۃ من الکفرۃ لئلا یظہروا علیہم فیؤذوہم
 ویفتنوںہم عن دینہم کما کانوا المؤمنون علی ہذہ الحالۃ فی
 اول الاسلام فی مکتہ والثانی قبیل انہ تعالیٰ لما ارسل
 موسیٰ الیہما امر فرعون بتخریب مساجد بنی اسرائیل
 ومنعہم من الصلوۃ فامرہم امثہ تعالیٰ ان یتخذوا
 مساجد بنی بیوتہم ویصلوا فیہا خوفا من فرعون -
 الثالث انہ تعالیٰ لما ارسل موسیٰ الیہم واظہر فرعون
 تلک العداۃ الشدیدۃ امر امثہ موسیٰ و ہرون
 وقومہما باتخاذ المساجد علی ما عمدا لاعداء
 وتکفل تعالیٰ ان یتصور تہم
 عن شر الاعداء - مفسرین نے اس واقعہ کی کیفیت میں
 تین وجوہ بیان کی ہیں :-

پہلی ان میں سے یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین کو اول وقت میں
 یہ حکم تھا کہ وہ اپنے گھروں میں کافروں سے مخفی نماز ادا کیا کریں تاکہ وہ غالب آکر ایذا
 نہ پہنچائیں اور دین کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا نہ کریں۔ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو ایسے
 ہی تھا جس طرح مسلمانوں کو اول اسلام میں مکہ مکرمہ میں حکم تھا۔
 دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے قوم کی طرف
 مبعوث فرمایا تو فرعون نے مساجد کو برباد کرنے کا حکم دیا اور ان کو نماز سے منع کیا تو اللہ
 تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مساجد گھروں میں بنانے کا حکم دیا کہ وہ فرعون کے خوف کی
 وجہ سے ان میں نماز ادا کریں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرف مبعوث
 فرمایا تو فرعون نے عداوت شدید کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارن
 علیہ السلام اور انکی قوم کو حکم دیا کہ وہ مساجد بنا لیں تاکہ دشمن ذلیل ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کی

حفاظت فرمائے گا اور دشمن کے شر سے بچائے گا۔

اب یہ تینوں وجوہ سمجھنے کے بعد یہ بات سمجھنی مشکل نہیں رہی کہ گھروں کو نماز کی جگہ بنانے کا حکم دیا۔ صرف گھروں کو قبلہ رو بنانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا کہ ان میں نماز بھی ادا کی جائے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہی کمال ہے کہ آپ نے کسی مقام پر بھی تفسیر کے راجح قول کو نہیں چھوڑا بلکہ راجح قول کے مطابق ہی ترجمہ کیا۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا عَلَىٰ لَدُنْهِ رِزْقٌ مُّذَرٌّ

- اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے۔ (فتح محمد)
- زمین پر چلنے والا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو (مودودی)
- اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اسکی رزق (مولانا محمود الحسن)۔
- اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اسکی رزق (شاہ عبدالقادر)۔
- اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اس کا رزق نہ ہو (عبدالماجد)۔
- اور کوئی جاندار جسے زمین پر چلنے والا نہیں کہ اسکی رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ (اشرف علی)۔

• اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔

دا اعلیٰ حضرت

یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ذمہ کرم کے الفاظ ہیں۔ باقی تراجم میں اللہ پر یا اللہ کے ذمہ۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں لفظ کرم کی زیادتی ہے۔ وہ کیوں؟ اسکی وجہ کیا ہے؟ اس لیے کہ یہاں ایک سوال ہوتا ہے تو اس کا جواب دیا گیا ہے۔ تفسیر نے سوال و جواب سے جس مسئلہ کو حل کیا ہے اسی کو اعلیٰ حضرت نے لفظ کرم زیادہ کر کے حل فرما دیا۔ تفسیر کبیر میں ہے: تعلق بعضهم بانہ یجب علیٰ امثله تعالیٰ بعض الاشیاء بسمئذہ الایۃ وقال ان کلمۃ علی للوجوب وهذا یدل علی ان ایصال الرزق الی الدابة واجب علی امثله وجوابہ انہ واجب بحسب الوعد

والفضل والاحسان یعنی بعض حضرات نے اسی آیت سے استدلال پیش کیا ہے کہ بعض چیزیں اللہ پر واجب ہیں کیونکہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ لفظ علی وجوب کے لیے آتا ہے اور یہ دلالت کرتا ہے کہ ہر جان دار کو رزق پہنچانا اللہ پر واجب ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے وعدہ کے مطابق فضل و احسان سے اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ اس پر کوئی چیز ضرر آوا واجب ہے۔ اسی وجہ سے مدارک نے بھی تفسیراً وجوب سے تفسیر کی ہے کہ اللہ نے اپنے فضل کی وجہ سے اپنے ذمہ ہر جان دار کی روزی کو لیا ہے نہ کہ بوجہ واجب ہونے کے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں۔ تفسیر فرح المعانی میں بھی تقریباً اسی طرح بیان کیا گیا جس طرح کبیر میں ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔

اب تفسیر نے جس مسئلہ کو سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں بلکہ اس نے اپنے فضل کی وجہ سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اسی مسئلہ کو اعلیٰ حضرت نے لفظ کرم زیادہ کر کے حل فرمادیا کہ یہاں علی وجوب کے لیے نہیں بلکہ اللہ نے اپنے کرم کی وجہ سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اسی طرح ۲۱ ع میں وکان حقا علینا نصر المؤمنین کے ترجمہ میں بھی مترجمین نے غلطی کی۔

فَاتَانَسَخَرُكُمْ (پ ۱۴)

- تو ہم سننے میں تم سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- تو ہم تم پر سننے میں۔ (اشرف علی)
- تو ہم بھی تم پر نہیں رہے ہیں۔ (مودودی)۔
- ہم بھی تم پر نہیں رہے ہیں (عبدالماجد)۔
- ایک وقت ہم تم پر نہیں گئے۔ (اعلیٰ حضرت)
- یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں سے "ہم تم پر نہیں گئے" اور باقی تراجم میں ہے ہم سننے میں یا نہیں رہے ہیں، اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں استقبال کا ذکر ہے۔ باقیوں میں

حال حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے کا ذکر ہو رہا ہے کہ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے اور آپ کی قوم آپ کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ایک وقت ہم تم پر ہنسیں گے۔ خود قرآن پاک کے سیاق و سباق سے بھی یہی سمجھ آتا ہے اور تفاسیر کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ جلالین میں اذ نجونا وغرقتم جب ہم نجات پائیں گے اور تم غرق ہو گے۔ ان کا ہنسا کشتی بنانے کے وقت تھا اور آپ کا ان کے غرق سے متعلق تھا: فانا نسخر منکم عند سؤیت الہلک کما تسخرون منا عند سؤیت الفلک ہم تم پر ہنسیں گے تمہاری ہلاکت کو دیکھ کر جیسے تم ہم پر ہنسیں رہے ہو کشتی کو دیکھ کر۔

روح المعانی میں ہے: ان تسخروا منا فی الدنیا فانا نسخر منکم فی الاخرة وقیل فی الدنیا عند الخرق و فی الاخرة عند الحرق یعنی اگر تم ہم پر دنیا میں ہنسیں رہے ہو تو ہم تم پر آخرت میں ہنسیں گے۔ یا ہم تم پر دنیا میں ہنسیں گے جب تم غرق ہو گے اور آخرت میں ہنسیں گے جب تم آگ میں جلو گے۔ تفسیر کبیر میں اگرچہ تین قول ہیں لیکن زیادہ تر پہلا قول ہی باقی تفاسیر کے مطابق ہے اور قرآن پاک کے سیاق و سباق کے مطابق ہے۔ و غیبہ و جبرہ الاول التقدیر ان تسخروا منا فی هذه الساعة فانا نسخر منکم سخریۃ مثل سخریتکم اذا وقع علیکم الخرق فی الدنیا و الخزی فی الاخرة اس میں کئی وجہیں ہیں (تین وجہیں ہیں)۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر تم اس وقت ہم سے ہنستے ہو تو ہم تم سے ہنسیں گے تمہاری ہنسی کی طرح جب تم دن میں غرق ہو گے اور آخرت میں رسوا ہو گے۔ زیادہ طور اسی ترجمہ کو مناسب سمجھا گیا ہے اور یہ قول ہی راجح ہے۔

قَالَ يَقَوْمٌ هَوْلًا بِبَنَاتِنَا إِنَّ هُنَّ أَظْهَرُ لَكُمْ (پہلا پتہ)

ان سے کہو بھائیو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں (موردی)

کہا اے قوم میری یہ ہیں بیٹیاں میری وہ بہت پاکیزہ واسطے تمہارے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

یولاء، اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو ان سے (محمود الحسن) (شاہ عبدالقادر)۔

لوط فرمانے لگے کہ اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں وہ تمہارے لئے خاصی ہیں۔ (اشرف علی)۔

یولے اے میری قوم یہ میری بیٹیاں (بھی تو موجود ہیں) یہ تمہارے حق میں پاکیزہ ہیں۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔

کہا اے قوم یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے سھقری ہیں (حضرت) اس مقام پر لوط علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے جب کہ آپ کے پاس فرشتے آئے جو ان کی قوم کو عذاب دینے کے لیے آئے تھے لیکن وہ خوبصورت حسین شکلوں میں آئے تھے اور آپ کی قوم کو لو اطمینان کی عادت تھی۔ جب ان کی قوم کو پتا چلا کہ لوط علیہ السلام کے پاس حسین ترین لڑکے آئے ہوتے ہیں، وہ دوڑتے ہوئے اپنے بڑے ارادے لے کر آئے تو لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم یہ میرے مہمان ہیں تم مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو بلکہ یہ میری قوم کی بیٹیاں دکھائی عورتیں تمہارے لیے سھقری ہیں یعنی ان سے مجامعت کرنا تمہارے لیے حلال ہے۔

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ میری اپنی اصلی بیٹیاں (معاذ اللہ) تمام کے لیے پاک ہیں۔ اس مقام پر حضرت کا ترجمہ تقاسیر کے مطابق ہے اور اللہ کے نبی کی شان کے لائق ہے جب کہ دیگر تراجم سے یہ پتا چلتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے متعلق کہا۔ اگرچہ ایک یہ قول ملتا ہے کہ آپ نے اپنی بیٹیوں کے متعلق کہا کہ تم ان سے نکاح کرنا لیکن یہ قول مختلف بحثوں کی وجہ سے مرجوح ہو گیا۔ آپ کی بیٹیاں دو تھیں بنات جمع ہے دو بیٹیاں پوری قوم کے لیے کیے کیا صرف اس قوم کے دوسرے ارادے تھے یا کہ پوری قوم کیا کافروں سے نکاح جائز تھا؟ تفسیر روح المعانی میں ہے: اخرج ابوالشیح

عن ابن عباس وابن ابی حاتم عن ابن جبر و مجاہد وابن ابی الدنبا وابن
عسکر عن السدی ان المراد ببيناته عليه السلام نسائه امته
والاشارة بهؤلاء لتزويلهن منزلة الماحضر عنده واضاقن
اليه لان كل نبي اب لامت وفي قرأة امين مسعود رضي الله
عنه النبي اولي بالمؤمنين من انفسهم وهو اب لهم والمزواج
امهاتهم. وقول ابی رضي الله عنه مثل ذلك لكنه قدم وازواجه امهاتهم على
ابهم ابواشيخ نے ابن عباس سے بیان کیا ابن ابی حاتم سے ابن جبر سے اور مجاہد نے
اور ابن ابی الدنبا نے اور ابن عسکر نے سدی سے روایت کیا ہے کہ یہاں نوط علیہ السلام
نے جو بنات کا ذکر کیا ہے اس سے مراد آپ نے اپنی قوم کی عورتیں لی ہیں جو اداء سے
اشارہ ان کو بتلے حاضر کے سمجھ کر کیا اور ان کی اضافت اپنی طرف کی اور بتاتی کہا۔ اس
سے مراد یہ ہے کہ ہر نبی اپنی امت کے باپ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود
کی قرأت میں ہے: النبي اولي بالمؤمنين من انفسهم وهو اب لهم
وانما واجه امهاتهم نبي مومنون کے ان کی جان سے زیادہ مالک ہیں کیونکہ وہ ان کے
باپ ہیں اور ان کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں حضرت ابی کی قرأت میں بھی اسی طرح ہے
لیکن اس میں وازواجہ امہاتہم پہلے ہے اور ہواب لہم بعد میں ہے۔
اعلیٰ حضرت نے جو ترجمہ کیا ہے علامہ رازی نے اس کو ہی پسند کیا ہے اور اپنے
مختار پر دلائل قائم کیے ہیں تفسیر کبیر کی حیات ملاحظہ ہو:

قال يقوم هؤلاء بناتهن اطهرنكم فنيه قولان قال
قتاحه المراد بنات لصلبه وقال مجاهد وسعيد بن جبیر المراد
نساء امته لانهم في انفسهم بنات ولهن اضافة اليه بالتابعة
وقبول الدعوة قال اهل الضويكفي في حسن الاضافة ادنى
سبب لانه كان نبيا لهم فكان ابا لهم قال تعالى وانما واجه
امهاتهم وهو اب لهم وهذا القول عندی هو المختار ويبدل عليه

وجوه الاول ان اقدام الانسان على عرض بناته على الاوباش
والفجاس امر متعبد لا يليق باهل المروة فكيف باكابرا لانبيا
الثاني وهو انه قال هو لادويناتي هن اطهر لكم فبنات اللواتي من صلبه
لا تلتقي للجمع العظيم اما نساء امته فخير من كفايته لكل - الثالث - انه
صحت الرواية انه كان له بنتان وهما زنتا وخر عوسرا واطلاق لفظ
البنات على البناتين لادويناتي لما ثبت ان اقل الجمع ثلاثة

یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی اس کلام هو لادويناتي هن اطهر لكم
میں دو قول ہیں۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد آپ کی اپنی حقیقی بیٹیاں مراد ہیں لیکن مجاہد
اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس سے مراد آپ کی امت کی عورتیں مراد ہیں اس لیے کہ
وہ آپ کی بیٹیاں ہی تھیں۔ ان کو اپنی طرف قبول دعوت اور متابعت کی وجہ سے منسوب
کیا۔ اس لیے کہ نخیوں کا ضابطہ یہ ہے کہ حسن اضافت میں ادنیٰ مناسبت کافی ہے۔ اس
لیے کہ آپ ان کے نبی تھے اور نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے کیونکہ قرآن پاک میں آتا ہے:

وانما واجد امھاتم نبی کی بی بیایں ان کی مائیں ہیں لہذا نبی ان کے باپ ہوئے۔
علامہ رازی فرماتے ہیں، یہی قول میرے نزدیک مختار ہے۔ اس قول کے مختار ہونے
پر کسی وجہ دال ہیں:-

پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان کا اپنی بیٹیوں کو اوباشوں اور فاسقوں قاجروں پر
پیش کرنا یہ بہت بعید ہے۔ اہل مروت کے لائق نہیں۔ اکابر انبیاء یہ کام کیسے کر سکتے
ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا هو لادويناتي
هن اطهر لكم اپنی حقیقی بیٹیاں تہی عظیم جماعت کو کافی نہیں ہو سکتی تھیں۔
البتہ امت کی عورتیں ان تمام کو کافی ہو سکتی تھیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صحیح روایت ہے کہ آپ کی دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام زنتا
دوسری کا نام زعورا ہے۔ لفظ بنات کا اطلاق (یا حقیقت) دو بیٹیوں پر صحیح نہیں کیونکہ
جمع کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔

اب علامہ رازی کی اس تفسیر کے بعد اور اپنے مختار قول پر دلائل قائم کرنے کے بعد
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت بہت روشن ہو گئی اور پتا چلا کہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کرتے وقت
 تفسیر کے اقوال اور ان میں راجح اور مرجوح اقوال کو ذہن میں رکھا اور راجح قول کو پیش
 کیا۔ اسی وجہ سے آپ کی بصیرت اور وقت نظر قابلِ صد ستائش ہے۔
 اسی طرح مترجمین نے حق لاء بناتی ان کنتم فاعلین پ ۱۲ ع
 میں بھی غلطی کی۔

إِنَّ آبَانَا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (پ ۱۲ ع ۲)

- بے شک ہمارے باپ تو بالکل بہک گئے ہیں۔ (عبدالماجد)۔
- کچھ شک نہیں کہ آبا صریح غلطی پر ہیں۔ (فتح محمد)۔
- تحقیق باپ ہمارا البتہ صریح غلطی ظاہر کے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- البتہ ہمارا باپ خطا میں ہے صریح (شاہ عبدالقادر)۔
- واقعی ہمارے باپ کھلی غلطی میں ہیں (انشراف علی)۔
- سچی بات یہ ہے کہ ہمارے آبا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ (مودودی)۔
- بے شک ہمارے باپ صراحتاً ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب یہ کہا کہ ہمارے باپ یوسف علیہ
 السلام اور ان کے بھائی سے زیادہ محبت کرتے ہیں حالانکہ ہم طاقت والے ہیں حضرت
 یعقوب علیہ السلام کے زیادہ محبت کرنے کو انھوں نے ان ابنا لانی ضلال مبین
 سے تعبیر کیا۔

اعلیٰ حضرت نے ادنیٰ احترام پر یہی ترجمہ کیا کہ ہمارے باپ انکی محبت میں ڈوبے
 ہوئے ہیں ہمارا طرف توجہ کم کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے مترجمین نے ترجمہ میں خطا
 اور غلطی کی نسبت کی ہے کہ ہمارے باپ خطا پر ہیں غلطی پر ہیں، بہک گئے ہیں۔ بظاہر یہ

یہ نسبت درست نہیں۔ اسی وجہ سے تفسیر کبیر میں اس کو اعتراض و جواب کی نہیں درج کیا گیا ہے۔ (السوال الثالث)۔ انہم نسبوا اباہم الی الضلال المبین و ذلك مبالغتہ فی الذم والطعن ومن بالغ فی الطعن فی الرسول کفر لا سیما اذا کانت الطاعن ولدا فان حق الابوة یوجب مزید التعظیم والاحترام والجواب المراد من الضلال عن رعایتہ المصالح فی الدنیا لا المبعد عن طریق الرشید والصواب۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے اپنے باپ کو ضلل مبین کی طرف کیسے منسوب کیا۔ یہ تو مذمت اور طعنہ میں مبالغہ ہے اور جو شخص اللہ کے رسول میں طعنہ میں مبالغہ کرے وہ کافر ہے (حالات کو وہ مومن سمجھے) پھر باپ ہونے کا حق اولاد زیادہ تعظیم کا سبب ہوتا ہے اولاد کس طرح طعنہ زن ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ راہ راست اور حق سے دوی کو ضلل سے تعبیر نہیں کیا۔ اب مطلب واضح ہوا کہ ان کا مقصد یہی تھا کہ ہمارے باپ ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ہماری طرف توجہ کم کرتے ہیں۔ ایک ہی مقصد کو دو مختلف طریقوں سے پیش کیا گیا کیونکہ ایک ترجمہ ادب احترام بردال ہے اور دوسرے تراجم میں اس مقصد عظیم کا خیال نہیں کیا گیا اور ایسے تراجم کئے گئے ہیں جو صراحتاً بے ادبی پر دل ہیں۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ تَاٰی بُرْهَانَ رَبِّهٖ (پ ۱۱۱)

اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کا۔ اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھتے قدرت رب اپنے کی۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور انہوں نے اس کا قصد کیا اگر وہ اپنے پروردگار کی نشانی نہ دیکھتے (فتح محمد)۔

اور تحقیق قصد کیا اس عورت نے ساتھ یوسف کے اور قصد کیا یوسف نے ساتھ اس کے اگر نہ دیکھ لیتا دلیل اپنے رب کی۔ (شاہ رفیع الدین)

اور البتہ عورت نے فکر کی اس کی اور اس نے فکر کی عورت کی اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھی قدرت اپنے رب کی۔ (شاہ عبدالقادر)۔

• اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ خیال ہو چلا تھا۔ (مولانا اشرف علی)۔

• اور اس عورت کے دل میں ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور انھیں بھی اس عورت کا خیال ہو چلا تھا اور اگر اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ دیکھ لیا ہوتا (عبدالملک)۔
• بے شک عورت نے اس کا ارادہ کیا اور وہ بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے جب کہ ان کو عزیز مصر کی عورت نے کمرے میں بند کر کے دروازے بند کر دیے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ارادہ کیا لیکن یوسف علیہ السلام نے معاذ اللہ کہہ کر اس سے پراہ کا اظہار کیا اور دل میں کسی قسم کا بڑی خواہشات کا ارادہ نہ کیا۔ یہی مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے کہ آپ اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو اس عورت کا ارادہ کرتے لیکن آپ نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی لہذا کوئی ارادہ نہ کیا۔ لیکن بخلاف اس کے باقی تراجم میں یہ بات موجود نہیں جو اللہ کے نبی کی شان پر دال ہو بلکہ باقی تراجم سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح عورت کی فکر تھی اسی طرح آپ نے بھی فکر کی۔ عورت کی فکر تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفاذ نہ کرنا جائز طریقہ سے پورا کرنا چاہتی تھی۔ اگر معاذ اللہ آپ نے بھی اس عورت کا فکر تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ نے بھی ناجائز طور پر خواہشات کو پورا کرنے کی فکر کی۔ یہ شان نبی کے لائق نہیں۔ اسی طرح یہ بھی نبی کی شان سے دور ہے کہ نبی نے کچھ کچھ بُرائی کا خیال کیا ہو یا ارادہ کیا ہو جب کہ عورت نے مکمل طور پر اپنا خیال جمائے رکھا ہو۔ کچھ کچھ بُرائی کا خیال بھی عصمتِ انبیائے کرام کے منافی ہے۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں اقوالِ مفسرینِ کرام دیکھیں تفسیر حبل میں

ہے: وفي السمين لولا ما ویت بسره ان سبه ذہب سہا لکن امتنم

ہم بہا لوجہ ساریتہ برہان ربہ فلہ یحتصل منہ ہمہ الشیۃ کقولک
 لولا خرید لاکرمتک فالعقوان الاکرام استنم لوجہ ذویہ و بہذا ینتخلص
 ان الاشکال الذی یوادی ہنا و ہو کیف یلیق بقبی ان یم بالمرآة
 اور سمین میں آتا ہے: اگر آپ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو اس عورت کا خیال
 کرتے لیکن آپ نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی تھی تو اس کے پائے جانے کی وجہ سے
 آپ سے اس عورت کا ارادہ دور ہی رہا۔ آپ نے خیال تک نہ کیا جیسا کوئی کہے لولا
 خرید لاکرمتک اسی مثال میں معنی یہ ہو گا کہ اگر کم نہیں پایا گیا بوجہ زید کے پائے
 جانے کے یعنی زید کے موجود ہونے کی وجہ سے مسئلہ نے مخاطب کی تعظیم و تکریم نہیں کی۔
 پس کہتے ہیں کہ اسی اشکال سے وہ اشکال مندرج ہو گیا جو وارد ہوتا تھا کہ نبی کی شان
 کے کس طرح لاتی ہے کہ وہ ایک عورت سے برائی کا ارادہ کرے۔

اب اس تقریر سے واضح ہے کہ نبی نے ارادہ کیا ہی نہیں کیونکہ پہلے رب کی دلیل
 دیکھ لی تفسیر کبیر میں ہے: ان یوسف علیہ السلام کان بریثا عن العمل
 الباطل والہم المحرم وهذا قول المحققین عن المفسرین والمتکلمین
 وبہ نقول وعنه نذب۔ واعلم ان الدلائل الدالة علی وجوب
 عصمة الانبیاء علیہم السلام کثیرة بے شک حضرت یوسف
 علیہ السلام برے اعمال اور ناپاک ارادوں سے پاک ہیں۔ یہی قول محققین مفسرین کرام اور
 متکلمین کا ہے۔ اور علامہ رازی کہتے ہیں کہ ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اس کی حمایت
 کرتے ہیں اور اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو مندرج کرتے ہیں اس لیے کہ
 انبیائے کرام کی پاک دامنی پر کثیر دلائل موجود ہیں تفسیر کبیر میں یہ بھی آتا ہے: ومثل
 هذا المعصية لو نسبت الی افسق خلق الله تعالیٰ وابعدهم عن
 کل خیر لاسیتکف منہ فکیف یجوزنا سنادہا الی الرسول علیہ الصلوٰة
 والسلام الموبد بالمعجزات القاهرة الباهرة۔

ایسی معصیت کو یعنی زنا کا ارادہ کرنا اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی بہت

بڑے فاسق کی طرف منسوب کیا جائے اور اسی طرح ایسے شخص کی طرف اس قسم کی برائی کو منسوب کیا جائے تو وہ بھی ثرم محسوس کرے تو ایک جلیل اقدار رسول جن کو عظیم الشان معجزات عطا کیے گئے ہوں، ان کی طرف اس قسم کے گناہ کو کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس سے آگے اور تفصیل بیان فرماتے ہوئے یہ تحریر کرتے ہیں واعلم ان الذین لهم تعلق بهذه الواقعة يوسف عليه السلام، وتلك المرأة ونزوحها، والنسوة والشهود ورجال العالمين مشهد ببرائته عن الذنب وابلين اقرب برائته ايضا عن المحصية۔ واذ كان الامر كذلك فحينئذ لم يبق للمسلم توقف في هذا الباب۔ بے شک جن کا اس واقعے سے تعلق ہے یوسف علیہ السلام اور وہ عورت اور اس کا خاوند اور عورتیں اور گواہ اور اللہ رب العالمین (ان تمام) نے آپ کے متعلق شہادت دی ہے کہ آپ گناہوں سے بری ہیں یہاں تک کہ شیطان نے بھی آپ کی برائت کی شہادت دی ہے۔ یہ سب اس طرح آپ کی برائت پر اتنی گواہیاں موجود ہیں تو مسلمان کو اس میں توقف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں: اما بیان ان يوسف عليه السلام ادعى البرائة عن الذنب فهو قوله عليه السلام هي ساودتي عن نفسي وقوله عليه السلام رب السجن احب الي منعايد عوني البية حضرت يوسف علیہ السلام نے خود اپنے آپ کو گناہوں سے بری ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ (اس عورت) نے خواہش کی کہ میں اپنی حفاظت دکروں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ اے میرے رب مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے اس کام سے (برائی سے) جس کی طرف مجھے یہ مبتلائی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے یہ لہجہ شہادت آپ کی پاکدامنی پر دال ہیں واما بيان ان المرأة اعترفت بذلك فلانها قالت للنسوة ولقد ساودتني عن نفسي فاستعصم وايضا قالت الان حصص الحق اناسا وادته عن نفسي وان له لعمد الصادقين اس عورت نے خود حضرت یوسف علیہ السلام کے بری ہونے کا اعتراف کیا جبکہ اس نے عورتوں کے سامنے اعتراف کیا کہ میں نے اسے اپنی طرف مائل کرنا

چاہا لیکن اس نے اپنے آپ کو سچا لیا۔ اسی طرح اس نے یہ بھی کہا اب بات کھل گئی کہ میں نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن بیشک وہ سچے ہیں۔

عورت کی اس گواہی کے بعد واضح ہوا کہ اس نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو بری الذمہ قرار دیا: **واما بیان ان نخرج المرأة اقر بذلك فهو قوله انه من ليدكن ان كيدكن عظيم يوسف اعرض عن هذا واستغفرها** لذنبتك اس عورت کے زبج نے یہ کہا یہ تم عورتوں کا مکر ہے بے شک عورتوں کا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔ اے یوسف تم اس کا خیال نہ کرو اور اے عورت تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ یہ یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر اس عورت کے خاوند کی گواہی ہے۔ **واما الشهود فقوله تعالى وشهد شاهد من اهله ان كان**

قميصه قد من قبل فصدقت وهو من الكاذبين الخ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے باطل عمل اور حرام کام کے ارادہ سے بری ہونے پر گواہ کی گواہی ثابت ہے کیونکہ شیر خوار بچہ کی یہ شہادت ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچی ہے اور وہ غلطی پر ہیں اور اگر آپ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو آپ سچے ہیں اور عورت جھوٹی ہے۔ آپ کی قمیص تو پیچھے سے ہی پھٹی ہوئی تھی لہذا آپ کی برأت پر گواہی ثابت ہو گئی۔ گواہ بھی وہ جو اسی عورت کے خاندان سے ہے اور ابھی شیر خوار بھی ہے اسی وجہ سے اس عورت کے خاوند نے عورت کو مکار کہا جس کا پہلے ذکر ہو چکا۔ **واما شهادة الله تعالى بذلك فقوله كذلك**

لنصرف عنه السر والفحشاء انه من عبادة المخلصين۔ فقد شهد الله تعالى في هذه الآية على طهارته اربع موآت اولها قوله لنصرف عن السر والفحشاء والدم للتاكيد والمبالغة والثاني قوله والفحشاء اي لذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء۔ والثالث قوله انه من عبادة فامع انه تعالى وعباد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا واذ خاطبهم الجاهلون قالوا سلما والرابع قوله المخلصين وفيقران تاسمة باسم المفاعل واخرى

باسم المفعول فوسم الفاعل بیدل علی کونہ اثیبا بالطاعان
والغزبات مع صفة الاخلاص و وسامو دہ باسم المفعول بیدل علی ان
الله تعالیٰ استخلصه لنفسه واصطفاه لحضرتہ۔ و علی کلا الوجهین
فانه من اجل الالفاظ علی کونہ منزها عما اضاحوا
الیہ اللہ تعالیٰ نے حضرت

یوسف علیہ السلام کے بری ہونے کی شہادت دی۔ ہم اس طرح ان سے برائی او بے حیائی
کو دور رکھیں۔ بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف
علیہ السلام کے پاک ہونے کی جو شہادت اس آیت میں دی ہے وہ چار مرتبہ ہے۔ پہلی
ان میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لنصرف عنہ السموات یہاں لام تاکید
اور مبالغہ کے لیے آتا ہے۔ آپ سے برائی کا دور رہنا یقین ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والغصن اشار ذکر کیا یعنی کذلک لنصرف
عنہ السموات والغصن اشار جب اللہ تعالیٰ نے بے حیائی کو دور رکھنا اپنے ذمہ کر کم لگا لیا ہے
تو اب برائی کا ارتکاب یا اس کا خیال کرنا ناممکن ہو گیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا انہ من عبادنا کہ وہ
میرے خاص بندوں سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی تعریف اس طرح فرما
اللہ کے وہ بندے جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں جب ان سے جاہل کوئی بات کرتے ہیں
تو وہ کہتے ہیں پس سلام۔ اس سے پتا چلا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا بندہ کہا وہ محراب
قبائح نہیں ہو سکتا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "المخلصین"۔ اس میں دو قرأتیں ہیں یا
ایم فاعل ہے اور یا ایم مفعول۔ اگر اسم فاعل ہو تو معنی یہ ہوگا کہ آپ طاعات و قربات پر
خلوص سے عمل کرنے والے ہیں اور اگر ایم مفعول ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے
اپنی ذات کے لیے فاعل بنایا اور اپنے حضور پسندیدہ کیا۔ دونوں وجہ پر آپ کی برأت
پر کامل طور پر دل ہیں واما بیان ان ابلیس افتر بطنها وقتہ فلذاتہ قلب

فبِعِزَّتِكَ لَا غَوْبِيْنَهُمْ اِجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ اِلْمَخْلَصِيْنَ فَاقْتِ بَانَه
 لَا يُمْكِنُنَا غَوَاؤُ الْمَخْلَصِيْنَ وَيُوَسِّفُ مِنَ الْمَخْلَصِيْنَ لِقَوْلِهِ تَعَالَى اِنَّ
 مِنْ عِبَادِنَا الْمَخْلَصِيْنَ فَاِنْ هَذَا اِقْتِرَارٌ مِنْ اِبْلِيسَ بَانَه مَا اشْتَرَا
 وَمَا اضْلَهَ عَنْ طَرِيْقَةِ الْمَهْدَى

ابلیس نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی کا اقرار کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ
 سے جب اس نے ٹہلت مانگی اس کو قیامت تک مہلت دے دی گئی۔ اس نے کہا، اے
 اللہ مجھے تیری عزت کی قسم اب میں سوائے تیرے مخلص بندوں کے تمام کو گمراہ کرتا رہوں گا تو
 اس کا یہ اقرار اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کو راہِ راستہ سے
 بھٹکانا شیطان کے لیے ممکن نہیں۔ اور یوسف علیہ السلام کا مخلصین سے ہونا بھی یقین
 ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخلصین میں سے ہونے کی شہادت دی اور فرمایا

لِيُشْكِكَ وَهُوَ (يُوسُفُ عَلِيْهِ السَّلَامُ) امِيْرُ مَخْلَصِيْنَ مِنْهُمْ
 تُوْكَوِيْكَ اِبْلِيسَ كَا اِقْتِرَارٍ ثَابِتٍ هُوَ كَمَا كَا اِسْنِيْهِ يُوْسُفُ عَلِيْهِ السَّلَامُ كَوْنَهُ بَهْتِكَايَا اُوْرِنَهٗ سِيْ بَدْرَا
 كَمَا وَعِنْدَهٗ هَذَا اَقْوَالٌ هُوَ لِاَوْلَادِ الْجَهَالِ الَّذِيْنَ نَسَبُوا اِلَى يُوْسُفُ عَلِيْهِ
 السَّلَامِ هَذِهِ الْفَضِيْحَةُ اِنْ كَانُوا مِنْ اَتْبَاعِ دِيْنِ اَمَلِهٖ تَعَالَى مَا يَقْبَلُوْنَ
 هَادَاةً اَمَلِهٖ تَعَالَى عَلَيَّ طَهَا - هَاتِمٌ وَاِنْ كَانُوا مِنْ اَتْبَاعِ اِبْلِيسَ
 وَجَنَدِهٖ فَلْيَقْبَلُوْا شَهَادَةَ اِبْلِيسَ عَلَيَّ طَهَا - هَاتِمٌ

اس مفصل تقریر کے بعد علامہ رازی فرماتے ہیں، جو جہلار یوسف علیہ السلام کی
 برائی (یا ارادہ برائی) کی طرف نسبت کرتے ہیں اگر وہ اللہ کے دین کے قسح ہیں وہ اللہ کی
 شہادت کو قبول کر لیں جو اللہ نے آپ کی پاک دامنی پر دی ہے۔ اور اگر وہ شیطان اور اس
 کے لشکر کے قسح ہیں تو وہ شیطان نے آپ کی پاک دامنی پر جو شہادت دی ہے اسے قبول
 کر لیں۔

اس تقریر کی ابتداء پر نظر ڈالیں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ علامہ رازی نے آپ کو
 برائی اور برائی کے خیال اور ارادے سے پاک تسلیم کیا ہے اور اسی پر یہ مفصل دلائل

ہیں۔ اور پھر آگے زیادہ واضح طور پر فرماتے ہیں لا نسلم ان یوسف علیہ السلام علم بہا والدلیل علیہ انہ تعالیٰ وہم بہا لولا ان سما آئی برہان
 سبہ وجواب لولا ہمنا مقدم و ہو کما یقال قد کنت من العالکین
 لولا ان فلا ننا خلصک ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یوسف علیہ السلام نے
 بُرائی کا ارادہ کیا ہو، کچھ کچھ خیال کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں وہم بہا
 لولا ان سما آئی برہان ربہ۔ لولا کا جواب مقدم ہے جسے کہہ جانا ہے :
 قد کنت من العالکین لولا ان فلا ننا خلصک اگر فلاں شخص تجھے نہ
 چھڑاتا تو ہلاک ہو جاتا۔ مطلب یہ کہ تو ہلاک نہیں ہو کہ فلاں نے تجھے چھڑا لیا۔ اسی طرح
 یہاں بھی یہ ہے کہ دلیل رب کی طرف سے پائی گئی۔ لہذا آپ نے ارادہ فرمایا ہی
 نہیں۔ علامہ رازی نے بہت مفصل بحث کی ہے۔ کئی اعتراضات کے جواب بھی دئے۔
 لیکن اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ بحث بھی اگر وہ طویل ہو گئی لیکن واضح یہ کرنا تھا کہ علحضرت
 نے کس طرح تفاسیر کے راجح قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور کیسے ہی شان نبوت کا لٹھا
 کیا۔ یہ اللہ کی عطا ہے جسے چاہے نوازے۔

وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ (پ: ۱۶)

- اور خوب طرح اتارتا ہوں۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 - اور خوب طرح اتارتا ہوں مہمانوں کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔
 - اور میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- یہاں ذکر ہے یوسف علیہ السلام کا جب آپ کے بھائی غلہ لے کر واپس آنے
 لگے تو آپ نے فرمایا کہ آئندہ تم اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ساتھ لانا جس کو تم ساتھ
 نہیں لائے۔ تو ان کے ساتھ آپ نے جو تبلیغ کی وہ ترغیب و ترہیب پر مبنی تھی۔ ترغیب
 والے حصہ میں یہ فرمایا کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں تمہیں پورا پورا غلہ عطا کرتا ہوں اور
 سب سے بہتر مہمان نواز ہوں یعنی تمہاری بہتر طریقہ سے مہمان نوازی کرتا ہوں۔ علحضرت

کا ترجمہ یہی ہے عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خوب طرح آتارنے کو بہتر مہمان نوازی مستلزم نہیں البتہ خوب طرح مہمان نوازی کو خوب طرح اتارنا مستلزم ہے۔ تفسیر کبیر نے اسی معنی کو پسند کیا ہے، فرماتے ہیں: **وَأَنَا خَيْرُ الْمَنْزِلِينَ أَيْ خَيْرِ الْمَضِيْفِينَ لَا تَحِينَ أَنْزَلَهُمْ أَحْسَنَ ضِيَاغَتِهِمْ** یعنی میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں اس لیے کہ جب بھی ان کو اتار تو ان کی اچھی مہمان نوازی کی۔

وَأَنَا الْفَاعِلُونَ (پ ۱۶)

• اور ہم کو یہ کام کرنا ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

• اور ہمیں یہ ضرور کرنا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے پاس اپنے بھائی کو لانے کا وعدہ کیا تو کہا کہ ہم نے یہ کام ضرور کرنا ہے یعنی ضرور لانا ہے مولانا محمود الحسن صاحب نے ترجمہ میں تاکید کو استعمال نہیں کیا حالانکہ کلام متوکد ہے۔ لفظ **أَنَا**، لام تاکید جملہ اسمیہ تمام تاکید پر دال ہیں لیکن علیٰ حضرت نے ترجمہ میں اس کا خیال رکھا۔ تفسیر مدارک میں ہے: **وَأَنَا الْفَاعِلُونَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ لَا تَضْرِبُ حَقِيبَةً وَلَا تَتَوَانَى**۔ ہم نے یہ کام ضرور کرنا ہے: نہ ہم اس میں کوئی کوتاہی کریں گے اور نہ سستی روح المعانی میں بھی اسی طرح ہے۔

كَذَلِكَ كَذَّبْنَا يُوسُفَ (پ ۱۷)

یوں داؤ بتا دیا ہم نے یوسف کو۔ (شاہ عبدالقادر)، (مولانا محمود الحسن)۔

ہم نے یوسف کو یہی تدبیر بتائی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں علیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے اور شان الوصیٰ کا لفظ لیا گیا

ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ داؤ یا مکر نہ کرتا ہے نہ دکھاتا ہے تفسیر روح المعانی میں ہے:

كَذَّبْنَا يُوسُفَ أَيْ صَنَعْنَا دَبْرًا لِجِبْرِيلَ تَعْنِي صِيْلَ غَوْضِهِ مِنْ

المقدمات التي ستمها من دس المسقاية وما يتلوه فالكيد مجاز لغوي في ذلك ولا مخفية وهي ان توهم غيبت خلاف ما تخفي وتريد على ما قالوا حال عليه
 یعنی ہم نے یوسف علیہ السلام کو نذیر سکھائی کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کو اپنے پاس
 رکھ سکتے ہیں۔ پیا۔ ان کے سامان میں رکھنا پھر کچھ دوسرے مل کے سامان کی تلاشی ہلے
 لینا۔ یہ ساری نذیریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائیں۔ کید کا مجازی معنی مراد ہے حقیقی
 معنی تو لینا ممکن نہیں کیونکہ حقیقی معنی یہ ہے کہ بطن میں کچھ اور ظاہر کچھ اور اور یہ
 اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے کہ خود اس پر عمل کرے یا سکھائے

إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (پا ۱۰)

- تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے۔ (مولینا محمود الحسن)۔
- تو ہے اپنی اسی غلطی میں قدیم کی۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- (لوگوں نے) کہا بخدا آپ تو اپنے اسی قدیم وہم میں (مبتلا) ہیں (عبدالماجد)
- اس قدیم غلطی میں مبتلا ہیں۔ (فتح محمد)
- تو البتہ بیخ وہم اپنے قدیم کے ہے (شاہ رفیع الدین)۔
- آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں (اشرف علی)۔
- آپ اپنی اسی پرانی خود رفتگی میں ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو بھائیوں پر ظاہر فرما دیا اور قصص
 دی کہ اباجان حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر رکھنا ان کو منیائی حاصل ہو جائے
 گی۔ اس خوشخبری کے ملنے سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا "مجھے یوسف
 علیہ السلام کی بجا رہی ہے"۔ اس وقت آپ کے پوتوں اور موجود اہل و عیال نے یہ کلام کی
 اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ تم حضرت یوسف
 علیہ السلام کی محبت میں وارفتہ ہو۔ اللہ کے نبی کی طرف غلطی اور خطا کی نسبت درست
 نہیں جب کہ وہ آپ کی اولاد بھی تھی اور مومن بھی تھے۔ پہلے بھی اس کی تفصیل گزرتی

چکی ہے جس کا تعلق آپ کے بیٹوں سے تھا۔ توجہ فرمائیں تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفسیر کے مطابق پائیں گے۔

مدارک میں ہے: لفي خهابك عن الصواب قديما في افراط محبتك ليوسف

اوفي خطائك القديم من حب يوسف وكان عندهم انه قدامات

یعنی آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی قدیم کثرت محبت میں وارفتہ ہیں۔ لہذا یہ بات آپ کی درست نہیں کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں حالانکہ وہ تو مرچکے ہیں۔ تفسیر کبریٰ میں ہے:

لفي ضلك القديم اي لفي حبك القديم لا تقسمناه ولا تدهل عنه

یعنی آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی قدیم محبت میں ہیں نہ انکو بھڑکتے ہیں اور نہ ہی وہ آپ کے ذہن سے نکلنے ہیں۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی واضح ہو گئی کہ آپ کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے اور نبی کی طرف غلطی کی نسبت کرنا مومن کی شان کے لائق نہیں۔ اس لیے آپ کی اولاد کے حق میں وہ ترجمہ درست نہیں جس میں ان کے ایمان پر حرف آسکے۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَأْيَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنْهُمْ قَدْ كَذَّبُوْا جَاءَهُمْ
نَصْرًا (پہا ۱۳)

• یہاں تک کہ جب پیغمبرنا امید ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انھوں نے کہی تھی اس میں وہ سچے نہ نکلے تو ان کے پاس ہماری مدد پہنچی۔ (فتح محمد)

• یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا تھا پہنچی ان کو مدد ہماری۔ (شاہ عبدالقادر)

• یہاں تک کہ پیغمبر ماکوس ہو گئے اور ان کو گمان غالب ہو گیا کہ ہماری فہم نے غلطی کی، ان کو ہماری مدد پہنچی۔ (مولانا اشرف علی)

• یہاں تک کہ جب تا امید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو ہماری مدد (محمود الحسن)۔
 • یہاں تک کہ پیغمبر مایوس ہو گئے اور گمان کرنے لگے کہ ان سے غلطی ہوئی (کہ اتنے میں) انھیں ہماری مدد پہنچی۔ (عبد الماجد دریا آبادی)۔
 • یہاں تک کہ جب رسولوں کو ظاہری اسباب کی امید نہ رہی اور لوگ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا تھا (اعلیٰ حضرت)۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین نے بہت سی بیجا بحث کی ہے اور جس احتمال کو تفسیر کبیر اور روح المعانی میں رد کیا گیا ہے اس قول کو دیگر مترجمین نے اقوال مفسرین سے بے خبری کے عالم میں پسند کیا اور اس کے مطابق ترجمہ کیا۔ اور بظاہر جو اعتراض ہوتا ہے جس کا مفسرین کرام نے جواب دیا ہے۔ اسی اعتراض کو دور کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ کیا تھا کہ رسولوں کو ظاہری اسباب کی امید نہ رہی۔ اس پر بھی یار لوگوں نے اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان الفاظ میں اعتراض کیا:-

حق اذا استیتس الرسول میں "ظاہری اسباب" فاضل بریلوی نے اپنی طرف سے ملا کر قرآن کے اندر بیان کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ "کذبوا" میں دو طرح کی قرأتیں ہیں ایک تخفیف سے معنی کذبوا اور دوسری تشدید سے یعنی کذبوا۔ ہر قرأت پر دو قسم کے قول پیش کئے گئے ہیں پہلا چونکہ تخفیف والی قرأت ہی زیر بحث ہے اس لیے طوالت سے بچتے ہوئے صرف اسی کو پیش کیا جا رہا ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: اعلم انہ قرأء اصم و حمزہ و الکسانی کذبوا بالتخفیف و کسر الذال و المباقون بالتشدید و معن الضیف من و جھین احدھما ان النطن واقع بالقوم ای حتی اذا استیتس الرسول من ایمان القوم فظن القوم ان الرسول کذبوا فیما وعدوا من النص و العظف۔

جان لو بے شک عام اور حمزہ اور کسانی رحمہم اللہ علیہم نے تخفیف سے پڑھا ہے

باقیوں نے تشدید سے اور تخفیف والی قرأت میں دو وجہ ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ گمان قوم سے واقع ہوا یعنی مطلب یہ ہوا کہ جب رسولوں نے قوم کے ایمان سے امید کو منقطع کیا پس لوگ یہ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا تھا، یعنی رسولوں سے جو امداد، کامیابی کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ اب اس وجہ کے مطابق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور کریں، آپ نے ترجمہ کیا "لوگ یہ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا ہے" یہ ترجمہ اس قول کے عین مطابق ہے لیکن دیگر مترجمین نے دوسری وجہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے جس کو مفسرین نے رد کیا ہے کیونکہ کسی نے ترجمہ کیا "اور رسول (خیاں کرنے لگے ان سے جھوٹ کہا تھا" کسی نے ترجمہ کیا "اور ان (رسولوں) کو گمان غالب ہو گیا ہماری فہم نے غلطی کی۔"

تفسیر کبیر نے دوسری وجہ بیان کی اور رد کیا ہے اسے دیکھیں: والوجه

الثانی ان یکون المعنی ان الرسل ظنوا انہم قد کذبوا فیما وعدوا
وهذا التاویل منقول عن ابن ابی ملیکۃ عن ابن عباس رضی
اللہ عنہما قالوا وانما کان الامر کذلک لاجل ضعف البشریۃ
الا انہ بعیدان المؤمن لا یجوز ان یظن بامثله الکذب بل ینخرج
بذالک عن الایمان فکیف یجوز مثله علی الرسل

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ بے شک جو ان سے وعدہ کیا گیا تھا اس میں وہ جھوٹا ہے گئے (تراجم کو دیکھیے خیال کرنے لگے ان سے جھوٹ کہا تھا) یہ تاویل ابن ابی ملیکہ سے ہے۔ انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا گویا یہ بوجہ ضعف بشریت کے ہے (لیکن علامہ رازی نے اس وجہ کو رد کیا اور کہا) یہ بہت بعید ہے کیونکہ ایک مؤمن کی شان کے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا گمان کرے بلکہ ایسا خیال کرنے والا شخص ایمان سے ہی نکل جاتا ہے ایسا قول رسولوں سے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

اب توجہ فرمائیں کہ جس قول کو رد کیا گیا ہے کہ رسولوں سے ممکن نہیں کہ وہ

اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو جھوٹ خیال کریں۔ اسی قول کے مطابق تراجم آپ کو نظر آئیں گے لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بلا اختیار ہے کیونکہ آپ کا ترجمہ پہلے قول کے مطابق ہے جو معتبرین کا طے شدہ قول ہے۔ خیال رہے کہ تفسیر روح المعانی میں اس آیت کریمہ کی تفسیر بہت ہی مفصل ہے۔ چونکہ اب اب اس کا بھی یہی ہے اس لیے اس کی عبارات کو نہیں پیش کیا جا رہا۔

اب رہا یہ اعتراض کہ اعلیٰ حضرت نے ظاہری اسباب کے الفاظ کا اضافہ کیوں کیا۔ چونکہ یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے جس کا جواب روح المعانی میں دیا گیا ہے ایک جواب صراحتاً اور ایک ضمناً جو جواب ایک بحث کے ضمن میں دیا گیا ہے اسی کو اعلیٰ حضرت نے اختیار کیا ہے۔ روح المعانی میں ہے: واستشكل بعضهم نسبة الاستياس اليهم عليهم السلام ايضا بناء على ان المظاهر انهم استياسوا مما وعدوا به واخبروا بكونه فان ذلك ايضا مما يليق بنسبة اليهم واجيب بان لا يروا ذلك وانما يروا انهم استياسوا من ايمان قومهم - اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ناسیہ کی نسبت انبیائے کرام کی طرف نظر پڑوسر کر دی گئی ہے کیونکہ ظاہر اہل بیت ہے کہ انبیائے کرام سے جو وعدے کئے گئے اور انہیں خبر دی گئی اس سے وہ ناامید ہو گئے حالانکہ انبیائے کرام کی شان کے لائق یہ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ وہ وعدوں سے ناامید نہیں ہوئے بلکہ قوم کے ایمان لانے سے امید کو منقطع کیا۔ دوسری بحث آپ کی اس طرح ہے: وذلك ان الغيب عن استياسهم مطلق وليس في الآية ما يدل على تقيده بما وعدوا به واخبروا بكونه واذا كان كذلك فمن المعلوم ان الله تعالى اذا وعد المرسل بنص مطلق كما هو غالب اخباراته لم يعين شيئا منه ولا مكانه ولا صفت فكثيرا ما يعتقد الناس في الموعود به صفات اخرى لم يدل عليها خطاب الحق تعالى بل اعتقدوا لها اسباب اخرى كما اعتقدوا ثلثة من المطلة وهي الله تعالى والابن والابن صلى الله

عليه وسلم انهم يدخلون المسجد الحرام ويطوفون به ان ذاك
يكون عام الحديبية لان النبي صلى الله عليه وسلم خرج معتمرا
وسجارا ان يدخل مكة ذلك العام ويطوف ويسعى فلما استيسوا
من ذلك ذلك العام لما صددهم المشركون حتى قاضاهم عليه
الصلوة والسلام على الصلح المشهور بقي في قلب بعضهم شئ
حتى قال عمر رضي الله عنه مع انه كان من المحدثين المتخبرين
يا رسول الله انا ندخل البيت ونطوف
قال بلى انا خبرت انك تدخله هذا
اذ ما ج قال لا - قال انك داخله و مطوف

ب۔
ناامیدی کی خبریں مطلق ہیں آیت میں کوئی ایسے الفاظ نہیں جو انبیائے کرام کے
ساتھ کہے گئے وعدوں اور خبروں کی تقید پر دال ہوں۔ لہذا انبیائے کرام سے
جو امداد کے وعدے تھے وہ مطلق تھے۔ عام خبروں میں ایسے ہی سے ان کو کسی زمانے
یا مکان یا صفات سے مقید نہیں کیا گیا۔ البتہ لوگوں نے صفات کا اعتقاد کیا حالانکہ
اللہ تعالیٰ کا خطاب ان پر دال نہیں جیسا کہ صحابہ کرام نے یہ اعتقاد کیا کہ اسی حدیث
کے سال مسجد حرام میں داخل ہونا، طواف کرنا معتبر ہے کیونکہ نبی کریم جب عمرہ کرنے
کی غرض سے نکلے طواف، سعی کی امید کرتے ہوتے لیکن جب نبی کریم نے کفار کے
روکنے پر ان سے صلح کر لی جس کے نتائج پر آپ ہی باخبر تھے) بظاہر شرط الطواف اگرچہ مشکل
نظر آتی تھی لیکن حقیقتہً وہ مسلمانوں کے حق میں مفید تھیں۔ تو مسلمانوں نے ناامید
کے حال میں کچھ چیزوں کو دلوں میں لایا یعنی کچھ ٹسکوک پیدا سوتے یہاں تک کہ حضرت
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجود اس کے آپ صاحب لہام والقار تھے لیکن عرض کیا
یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خبر نہیں دی تھی کہ ہم بیت اللہ شریف میں داخل ہوں گے۔
اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا، میں نے خبر دی تھی لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا

کہ اسی سال تم بیت اللہ میں داخل ہو گے۔ تو فاروقِ اعظم نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا کہ تم ضرور بیت اللہ شریف میں داخل ہو گے اور طواف کرو گے۔ اس بحث کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئیگی کہ نبی کریم نا امید نہیں ہوئے بلکہ آپ بات چیت تھے کہ ضرور ہی بیت اللہ شریف میں داخل ہو گا صرف ظاہری اسباب کا وقتی طور پر انقطاع تھا نہ کہ حقیقتاً یہ ناامیدی دوسرے حضرات کو تھی۔ خود نبی کریم اس سے دور تھے۔

اب اعلیٰ حضرت کی علمی بصیرت اور محبتِ رسل واضح ہو گئی کہ آپ کا ترجمہ مفتخر کرام کی آراء سے مختلف نہیں۔ اگر کوئی شخص تفاسیر کا مطالعہ نہ کرے صرف اپنے دل کو بھانسنے والے تراجم کو دیکھ کر کچھ اچھا لانا شروع کرے اور یہ بھی سمجھے کہ جس ترجمہ کو میں من گھڑت کہہ رہا ہوں وہی اقوالِ مفسرین کرام کے عین مطابق ہے اور جن مترجمین کی میں تعریف کر رہا ہوں انہوں نے مرجوح اقوال کو اپنے تراجم میں پیش کیا ہے اور شانِ انبیائے کرام کے مطابق نہ ہونے پر بظاہر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو وہ تفاسیر کے مطابق اپنے تراجم سے مندرج نہ کر سکے بلکہ ان کے تراجم پر وہی اعتراضات ہوتے ہیں۔

مِنْ حَمَلٍ مَّسْنُونٍ دیکھا ہے

- سنے ہوئے گارے سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- سنے گارے سے (شاہ عبدالقادر)۔
- جو کہ سڑے ہوئے گارے سے بنی تھی۔ (مولانا اشرف علی)۔
- سڑے ہوئے گارے سے۔ (فتح محمد)۔
- جو اصل میں ایک سیاہ بدبو دار گارہ تھی۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- انسان کی تخلیق کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو بھتی ہوئی (کھٹکھٹا) مٹی سے پیدا کیا جو اصل میں ایک سیاہ بدبو دار گارہ تھی۔ یہاں یہ بیان کرنا تو مقصود نہیں ہے۔

کہ باقی تراجم سے مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں یا وہ کسی اعتراض کو مندرج نہیں کرے
یا شان الوہیت فرسالت کا صحیح طور پر لحاظ نہیں کیا گیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا
ہے تفاسیر کے مطابق بیان حقیقت اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح ہے۔

جلالین میں ہے: من حمایہ طین اسود مسنون متغیر سیاہ رنگ کا گارا
بدلا ہوا۔ اس متغیر پر حمل کی عبات اس طرح ہے متغیر ای متغیر المرائحۃ من
طول مکشہ یعنی زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے اس کی بُو بدلی ہوئی ہو۔ اسی طرح
روح البیان میں ہے: قولہ مسنون صفتہ حمایہ من متن و بالفاس سیۃ بونٹے
گرفتہ بواسطہ بسیار بودن در آب یعنی ترکیبی لحاظ سے مسنون صفت ہے
حمایہ کی جس کا معنی بدبو دار ہونا۔ پھر فارسی میں بھی یہی معنی کیا ہے کہ زیادہ دیر پانی
میں ٹھہرنے کی وجہ سے اس میں بُو آجانا۔ اسی طرح مدارک میں ہے ای طین
اسود متغیر سیاہ رنگ کا گارا بدبو دار۔ جو بعد میں خشک ہو کر صلصال بن گیا جو
بچنے کھنکھنے لگا۔

مِنْ نَارِ السَّمُومِ (پ ۱۲۱)

• آگ لون کی سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔ ٹوکی آگ سے (محمود الحسن)۔

• ٹوکی آگ سے (شاہ عبدالقادر)۔

• آگ سے وہ ایک گرم ہوا تھی (مولانا اشرف علی)۔

• آگ کی بیٹ سے (مودودی)۔ گرم آگ سے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)

• بے دھوئیں کی آگ سے (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں جن کی تخلیق کا ذکر ہے کہ جنوں کو ہم نے انسان سے قبل آگ سے پیدا

کیا جس میں دھواں نہیں تھا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بے دھوئیں کی آگ، باقی تراجم، ٹوکی

آگ، آگ جو گرم تھی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ جلالین میں ہے

ھی نار لدخان لہا تنفذ فی المسام۔ یعنی نار السَّمُوم وہ آگ ہے جس میں دھواں

نہیں مساموں میں نافذ ہو جاتی ہے۔ بیضاوی میں ہے: من نار السموم ای
 من نار الحمر الشدید۔ سخت گرم آگ ہے۔ روح المعانی میں ہے: قبیل
 السموم نار لادخات لها یعنی سموم سے مراد وہ آگ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔
 وقیل السموم افراط الحرو والاضافۃ من اضافة الموصوف الی الصفة
 والمراد من النار المنرطة الحراسۃ یعنی سموم کا معنی سخت گرم۔ یہاں موصوف
 کی اضافة صفت کی طرف ہے، مراد اس سے سخت گرم آگ ہے۔

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوْحِي (پچھلے)

اس میں اپنی بے بہا چیز یعنی رُوح پھونک دی۔ (فتح محمد)۔
 اور پھونک دوں بیچ اس کے رُوح اپنی سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے۔ (شاہ عبد القادر)۔ محمود الحسن۔
 اس میں اپنی جان ڈال دوں۔ (اشرف علی)۔
 اور اس میں اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں (مودودی)
 اور اس میں اپنی طرف کی خاص معزز رُوح پھونک دوں (اعلیٰ حضرت)
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ ہے کہ اپنی طرف سے خاص معزز رُوح پھونک
 دوں۔ باقی تراجم میں ہے اپنی جان ڈال دوں یا اپنی جان سے پھونک دوں، یہاں
 ذکر ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا، میں انسان بنانے والا ہوں بھتی ہوئی
 مٹی سے، جب میں اس کی تخلیق کر لوں مکمل، اس میں ایک معزز رُوح ڈال دوں تاکہ
 وہ زندگی حاصل کر لے۔ جمل میں ہے: من روحی من زائدا او تبعیضیۃ
 ای نفخت فیہ سماویا ہی بعض الاسواح الی خلقہا ای
 ادخلتہا واجریبتہا یعنی من روحی میں من زائدہ ہے یا تبعیضیۃ یعنی میں اس
 میں رُوح ڈال دوں جو میرے تخلیق شدہ ارواح کا بعض ہوگا۔ جلالین میں ہے:
 اضافة الروح الی تشیالہم اور حاشیہ جلالین میں ہے اضافة الروح الی

تشریفاً كما يقال بيت الله -

جس طرح بیت اللہ حقیقتاً اللہ کا گھر نہیں بلکہ اضافت تشریفی ہے اسی طرح
 من رُوحی میں اللہ کا روح جان نہیں بلکہ مراد وہ روح ہے جو اللہ کی مخلوق ہے لیکن
 اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے معزز ترین ہو گئی۔ تفسیر کبیر میں ہے:
 وإنما اضاف الله سبحانه ما روح آدم الى نفسه تشریفاً له وتكريماً
 اللہ تعالیٰ نے روح آدم کو اپنی طرف تشریف عطا کرنے اور تکریم کے لیے منسوب کیا۔
 مقصد واضح ہو کہ اصل مدعی بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف
 سے ایک معزز روح پھونکی۔ یہ مقصود نہیں کہ اپنی جان ان میں ڈال دی۔ اعلیٰ حضرت کا
 ترجمہ ابتداء ہی مقصود کو بیان کر دیتا ہے جب کہ دیگر تراجم میں جب تک تاویل نہ کی
 جائے اور تفاسیر کی تقریر کو اپنی زبان میں نہ پیش کیا جائے اس وقت تک مدعی حاصل
 نہیں ہوتا جب کہ ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام آدمی کو کچھ نہ کچھ قرآن پاک
 کی سمجھ آجائے ورنہ علمین نے کرام جو تفاسیر کی ایجاد کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ
 ترجمہ کے محتاج نہیں۔ لہذا وہی ترجمہ ذی شان ہوگا جو عام انسان کو حدیثات سے
 دور رکھے۔ ایسے تراجم کا کیا مقصد جن کے پڑھنے کے بعد وہ کہیں اللہ تعالیٰ نے
 اپنی جان (روح) کیسے ڈال دی۔ کیا وہ حادث تو نہیں؟ کیا روح باری تعالیٰ اس
 سے جدا ہو سکتی ہے؟ کیا روح کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے حدیثات
 سے بچنے کے لیے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا رَیْبًا

- کہ ان سے شراب بناتے ہو (فتح محمد)۔
- لیتے ہو تم اس سے مست کرنے والی چیزیں (شاہ رفیع الدین)۔
- بناتے ہو اس سے نشہ۔ (شاہ عبد القادر۔ مولانا محمود الحسن)۔
- تم لوگ نشہ کی چیز بناتے ہو (اشرف علی)۔

جسے تم نشہ آور بھی بتاتے ہو۔ (مودودی)۔

اس سے نشہ پتیریں بتاتے ہو (عبدالماجد دریا آبادی)۔

اس سے نبیذ بتاتے ہو (اعلیٰ حضرت)۔

اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں اور قدتوں کو بیان فرما رہا ہے اور فرمایا کہ کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے تم نبیذ بتاتے ہو اور اچھا رزق۔ اعلیٰ حضرت نے سکر کا معنی نبیذ کیا ہے لیکن دیگر حضرات نے نشہ معنی کیا ہے۔ اگرچہ تفاسیر میں نشہ بھی معنی لیا گیا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت فخر کی حرمت کی آیت سے منسوخ ہے لیکن امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما اس آیت کو منسوخ نہیں مانتے بلکہ وہ اس سے مراد نبیذ لیتے ہیں اور اس کی حالت پر یہی آیت دلیل مانتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ مدارک میں ہے: وقیل السکر النبذ وهو عصیر العنب والزبيب والتمر اذا طبع حتی ینذهب مثلثاہ شریترک حتی یشد وهو حلال عند ابی حنیفہ و ابی یوسف الی حد السکر ویحتجان بہذہ الایۃ بیان کیا ہے کہ سکر سے مراد نبیذ ہے۔ نبیذ کے کہا جاتا ہے جو انگور اور شمش اور کھجور کو جب پکایا جائے اور اس کے دو حصے زائل ہو جائیں ایک حصہ باقی رہ جائے پھر اس کو چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ گاڑھا ہو جائے وہ شیخین کے نزدیک حلال ہے جب تک نشہ نہ دے۔ انھوں نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ الْآيَةُ (پہلا پارہ)

• اور جن کو پکارتے ہو سوائے اللہ کے نہیں پیدا کرتے کچھ اور وہ پیدا کیے جاتے ہیں مردہ ہیں نہیں زندہ اور نہیں جانتے کب اٹھائیں جائیں گے۔

(شاہ رفیع الدین)

• اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی تو نہیں بنا سکتے بلکہ خود ان کو اور بناتے ہیں وہ لاشیں ہیں بے جان، انکو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ اٹھائے کب جائیں گے۔ (فتح محمد)۔

• اور وہ دوسری سبتیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں مُردے نہ کہ زندہ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ اٹھیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔ (مودودی)

• اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتے اور آپ پیدا ہوتے ہیں مردے ہیں جن میں جی نہیں اور خبر نہیں رکھتے کب اٹھائے جائیں گے۔ (شاہ عبدالقادر)

• اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مُردے ہیں جن میں جان نہیں اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے۔

(مولانا محمود الحسن)

• اور جن کو یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں وہ کسی کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بھی مخلوق ہیں اور وہ مردے ہیں نہ کہ زندہ اور ان کی اتنی بھی خبر نہیں کہ (مردے) کب اٹھائے جائیں گے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• اور اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہیں وہ کچھ نہیں بناتے وہ خود بنانے ہوتے ہیں۔ مُردے ہیں زندہ نہیں اور انہیں خبر نہیں لوگ کب اٹھائے جائیں گے۔ اعلیٰ حضرت۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "پوجتے ہیں" اور دیگر مذکورہ تراجم میں "ایکے پکارتے ہیں"۔ اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے اسی آیت کو بڑے زور و شور سے اولیائے عظام اور انبیائے کرام پر حیاں کیا جاتا ہے یہی ان کا طریقہ واردات ہے۔ وہی آیتیں جو مشرکین کے حق میں نازل ہوئیں ان کو مسلمانوں پر حیاں کرنا اور جو آیتیں بتوں کے بارے میں ہیں ان کو اولیاء و انبیاء کرام پر جمول کرنا، بس یہی ان کا ایمان، یہی علم۔ ان کے اعتراضات کا محور مسلمان، اولیائے کرام اور انبیائے کرام ہیں۔

شاہ عبدالقادر کے حاشیہ میں ہے۔ شاید یہ ان کو فرمایا جو مرے بزرگوں کو پوچھتے ہیں۔ شاید کوئی وہم کرے کہ اس سے مراد ان حضرات کی یہود و نصاریٰ ہوں جو حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو معبود مانتے تھے لیکن یہ وہم اس لیے درست نہیں کہ اکثر و بیشتر اسی طرح تقاریر اور اپنے درس قرآن میں حضرات کو یہی کہتے سنا گیا ہے کہ مزارات پر جانا منع ہے بلکہ نہایت شدت سے کہا جاتا ہے کہ مزارات پر جانا حرام ہے وہ تو خود مر چکے ہیں وہ تو کچھ نہیں کر سکتے۔ اس آیت کریمہ کا ترجمہ نوٹ کرتے ہیں۔ یہ ظلم عظیم! کوئی مسلمان کسی بزرگ کو معبود نہیں مانتا ہے اور نہ اس کو پوجتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ پھر یہ کہنا کیسے کہ یہ مشرک ہیں۔ اب یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں :-

ایک بزرگان دین کے مزارات پر جانا، ان کے توسل سے دعا کرنا کہاں تک جائز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ بتوں اور بت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مسلمانوں، اولیائے کرام اور انبیائے کرام کے حق میں بیان کرنا ظلم ہے۔ پہلے اس بات کو تفاسیر کی روشنی میں بیان کر دیا ہوں کہ یہ آیت کریمہ بتوں اور بت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جلالین میں اس طرح تفسیر کی گئی: وَالَّذِينَ يَدْعُونَ بِالشَّيْءِ وَالْيَاسْرِ يَسْعُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَهِيَ لَاصْنَامٌ إِلَّا يُخْلِقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يَخْلُقُونَ يَهُودٌ وَمِنْ الْهِنْدِ وَغَيْرُهُمْ - أَمْ وَاتَّ لَهُمْ فِيهِمْ خَيْرٌ تِلْكَ غَيْرُ أَحْيَاءٍ تَأْكِيدٌ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيْ الْأَصْنَامُ إِيَّانَ وَقَدْ يُبْعَثُونَ أَيْ الْخَلْقُ فَكَيْفَ يَسْعُدُونَ إِذْ لَا يَكُونُ الرَّهْمَانُ إِلَّا الْخَالِقُ لِلْحَالِمِ بِالْغَيْبِ یعنی وَالَّذِينَ يَدْعُونَ میں دو قرأتیں ہیں يَدْعُونَ بالیاء اور يَدْعُونَ بالتاء، معنی اس کا يَسْعُدُونَ یا يَعْبُدُونَ ہوگا جو لوگ عبادت کرتے ہیں پوچھتے ہیں اللہ کے غیروں کو۔ یہاں غیروں سے مراد بت ہیں وہ کسی چیز کو نہیں بناتے وہ تو خود بنائے جاتے ہیں پتھروں وغیرہ سے ان کو تیا یا جاتا ہے۔ وہ مٹ رہے ہیں یعنی ان میں روح ڈالی ہی نہیں گئی۔ یہ دوسری خبر ہے اور غیر احیاء تاکید ہے۔ وہ بت جانتے ہی نہیں کس وقت مخلوق کو اٹھایا

جائے گا۔ ان کی کیسے عبادت کی جاسکتی ہے جب کہ معبود تو وہ ہوتا ہے جو خالق ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو، غیبی امور کو جاننے والا ہو لیکن مبت تو ان صفات سے عاری ہیں۔ مدارک میں ہے نفی عنہم خصائص الالهیۃ بنفی کونہم خالقین واحیاء لایموتون وعالمین بوقت البعث واثبت لہم صفات الخلق بانہم مخلوقون اموات جاہلون بالبعث ومعرف اموات غیر احیاء انہم لو کانوا الہیۃ علی الحقیقۃ لکانوا احیاء غیر اموات۔ یہاں الوہیت کی نفی کی گئی ہے کیونکہ وہ خالق نہیں، دائمی طور پر زندہ نہیں، وقت بعثت کو جانتے نہیں۔ ان کے لیے مخلوق کی صفات ثابت نہیں یعنی وہ مردہ ہیں، قیامت سے بے خبر ہیں۔ ان کے مردہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں زندگی آئی ہی نہیں اگر وہ حقیقتاً معبود ہوتے، پوچھنے کے قابل ہوتے، وہ دائمی طور پر زندہ ہوتے۔ روح المعانی میں ہے: شرفہم فی تحقیق ان الہیۃم بمعزل عن استحقاق العبادۃ۔ اسی آیت کریمہ کی وضاحت میں یہ کہا ہے کہ یہاں سے یہ تحقیق شروع کی جا رہی ہے کہ ان کے معبود جن کو وہ پوجتے ہیں وہ مستحق عبادت نہیں۔ بلکہ اس استحقاق سے دور ہیں۔ اسی تفسیر میں والذین یدعون کے ماتحت یہ بھی آتا ہے: والہیۃ الذین تعبدونہم ایہا الکفار۔ وہ معبود جن کو اے کافر تم پوجتے ہو۔ اسی طرح بیان کیا گیا ہے وھذا من باب التہکم بہم بنا علی اسراۃ الاصنام لان شعور الجماد بالامور الظاہرۃ بدیہی الاستحسان عند کل احد فکیف بما لا یعلمہ الا العلیم الخبیر۔ وفي الجوان فیہ تمکس بالمشرکین وان الہتہم لایعلمون وقت بعثتہم یجازون علی عبادتہم ایہا ہر۔ یہ کلام تمکیم کے طور پر کی گئی ہے کیونکہ جماد ہیں ان سے امور ظاہر کا شعور ممکن نہیں بلکہ ہر ایک کے نزدیک بدستہ محال ہے۔ پھر خاص کہے ان چیزوں کو وہ کیسے جان سکتے ہیں جن کو صرف علیم وخبیر جانتا ہو۔ اسی طرح بجز یہ ہے کہ مشرکوں سے تمکیم ہے کہ ان کے معبود جب قیامت کے

وقت کو ہی نہیں جانتے ان کو ان کی عبادت پر جزا کیا دیں گے۔ یہاں خیال ہے کہ روح المعانی میں اموات غیر احیاء کی تاویل کر کے حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ کو بھی شامل کیا ہے اور والذین یدعون کو بھی بعض کے نزدیک عام رکھا گیا ہے لیکن مراد پھر بھی جنوں ہی ہیں۔

بفضلہ تعالیٰ مسلمان انبیائے کرام یا اولیائے کرام کو معبود نہیں سمجھتے اس لیے اس آیت کریمہ کو اپنے مقصد پر دلیل بنانے والے اس غموم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اب دوسری بحث یہ سمجھنے کے قابل ہے کہ توسل اور تبرک آثار صالحین سے جائز ہے۔ پہلے مطلقاً توسل پر پھر انبیائے کرام، اولیائے کرام کے مزارات سے توسل و تبرک پھر زندگی بعد از وفات پر مختصر بحث کر رہا ہوں تفصیلی بحث اگر مژدس کا سنا اور ان کی بزرگی زندگی پر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی صاحب مدظلہ العالی کی کتاب جلازالصدر کا مطالعہ کرے، اس میں یہ بحث بالتفصیل ہے اور تحقیق و تدقیق پر مبنی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اس کے بعد وہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ اس جبہ مبارک کو دھو کر اس کے پانی سے بیمار شفا حاصل کرتے حضرت اسماء فرماتی ہیں: وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسہا ففطن نفسہا للمرضی لئن شفی بہا مسلم شرف جلد ثانی باب تعویج انار الذهب والفضة علی الرجال الخ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ نبی کریم جو جبہ پہنا کرتے تھے ہم اسے مریضوں کی صحت یابی کے لیے دھو کر اس کے پانی کو استعمال میں لاتے تھے۔ اس حدیث پاک کے ماتحت علامہ نووی فرماتے ہیں: و فی هذا الحدیث دلیل علی استحباب التبوک بالانوار الصالحین و شامہ یعنی اس حدیث پاک میں دلیل ہے کہ آثار صالحین اور ان کے کپڑوں سے تبرک حاصل کرنا جائز ہے۔ اب علامہ نووی کی اس تحقیق کے بعد مزید ضرورت نہ رہی کہ بیان کیا جائے کہ آثار صالحین سے تبرک جائز ہے کیونکہ آپ نے صرف جواز ثابت نہیں کیا بلکہ استحباب ثابت کیا ہے۔

جس پر عمل کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت سہل نے ایک مرتبہ ابو حازم اور

دیگر حضرات کو بتایا کہ یہ وہ پیالہ ہے جس سے نبی کریم اور آپ کے صحابہ کرام نے پیلے

بعد میں اسی پیالہ سے ان حضرات نے بطور تبرک پیا قال ابو حازم فاخرج لنا

سہل ذلك القدم فشرى بنا فيه ثم استوهب بعد ذلك عمر

بن عبد العزيز فرحب له۔ - مسلم شریف جلد ثانی

باب اباحة النبيذ - ابو حازم کہتے ہیں کہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ

نے وہ پیالہ ہمیں عطا فرمایا، ہم نے اس سے پیا۔ بعد میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ

علیہ نے وہ طلب کیا تو ان کو دے دیا گیا۔ ابو حازم وغیرہ کا اس پیالہ سے پینا اور حضرت

عمر بن عبد العزیز کا مانگنا صرف بوجہ تبرک تھا اس میں کوئی اور وجہ نہ تھی بلکہ اس حدیث پاک

کی شرح میں علامہ نووی کا بیان نہایت جامع ہے۔ - هذا فيه التبرك باناس

النبي صلى الله عليه وسلم وما سبه او لبسه او كان منه فيه

سبب وهذا نحو ما اجمعوا عليه واطبق السلف والتخلف عليه

من التبرك با لصلوة في مصلى رسول الله صلى الله عليه وسلم

وفي الروضة الكريمة ودخول الغار الذي دخله صلى الله عليه

وسلم وغير ذلك ومن هذا اعطاه صلى الله عليه وسلم ابا طلحة

شعره ليقتسمه بين الناس واعطاه صلى الله عليه وسلم حقوه

لنكفن فيه بنته وجعله الجريدتين على القبرين

وجمعت بنت ملحان عرقه صلى الله عليه وسلم

وتمسحوا بوضوئهم وذكروا وجوههم بنخامة صلى الله عليه

وسلم واشباه هذا كثيرة مشهورة في الصحيح وكل ذلك واضح لا شك فيه۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ نبی کریم کے آثار سے

تبرک حاصل کرنا بہتر ہے جس کو نبی کریم نے مس کیا ہو یا پینا ہو یا کسی طرح بھی وہ چیز نبی کریم

سے متعلق ہوتی ہو اس سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے سلف صالحین متاخرین کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نبی کریم کے نماز پڑھنے کی جگہ نماز پڑھنے سے تبرک حاصل کیا جائے نبی کریم کے روضہ مطہرہ سے تبرک حاصل کیا جائے جس غار میں نبی کریم داخل ہوئے اس غار میں داخل ہو کر تبرک حاصل کیا جائے۔ اس پر نبی کریم کا ابو طلحہ کو اپنے بال مبارک عطا کرنا تاکہ لوگوں میں تقسیم کریں اور ان کو اپنی چادر مبارک دینا تاکہ اس میں بیسی گو دفن کریں اور دو قبروں پر دو شاخوں کا رکھنا۔ اور بنت ملحان کا نبی کریم کا پسینہ مبارک صحیح کرنا اور صحابہ کرام کا وضو کے پانی کو اپنے جسم پر ملنا اور آپ کے نخامہ مبارک کو چہروں پر ملنا، یہ تمام اسی پر دال ہیں۔ اس قسم کی کثیر صورتیں احادیث صحیحہ میں موجود ہیں اور یہ واضح ہے کہ ان میں کوئی شک نہیں۔

اب علامہ نووی کی وضاحت کے بعد جس کو آپ نے بلا شک کہا ہے اگر کوئی شک کرے تو وہ اپنی قسمت پر روتے ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ ماننے والے صاحب عقل سلیم کے لیے تو یہ کافی ہے نہ ماننے والے کے لیے کثیر دلائل بھی نا کافی!

مزارات انبیائے کرام اور صلحائے تبرک | حضرت یوسف کی وفات کے بعد بنی اسرائیل میں

سے تبرک حاصل کی غرض سے ہر ایک نے خواہش کا اظہار کیا کہ آپ کو ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے۔ مدارک نے ۱۳ توفی مسلما والمقنی بالمصالحین کے تحت بیان کیا، تمام اہل مصر و تشا جوفی دفنہ کل یحب ان یدفن فی محلہم حتی ہوا بالقتال فراوا ان یعملوا لہ سندوقا من مرمر وجعلوہ فیہ و دفنوا فی النیل بمکان یمر علیہ الماء ثم یصل الی مصر لیکونوا کلہم فیہ شریفا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد اہل مصر نے جھگڑا کیا۔ تمام نے آپ کے دفن میں کوشش کی کیونکہ ہر ایک ہی پسند کرتا تھا کہ آپ کو ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے یہاں تک کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار اس بات پر صلح ہوئی کہ آپ کو تنگ ممر

کے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں دفن کیا جائے تاکہ وہاں سے پانی گزر کر شہر میں آئے اور سب ہی اس سے فائدہ حاصل کریں۔

نبی کریم کے مزارِ انور سے تبرک

وعن ابی جوزاء قال قحط

اهل المدينة قحطاً شديداً فشكروا الى عائشة فقالت انظروا قبر النبي صلى الله عليه وسلم فاجعلوا فيه كوى الى السماء حتى لا يكون بينه وبين السماء سقف ففعلوا فمطروا ومطرا حتى نبت العشب وسمنت الابل حتى تفتقت من الشحم فسمى عام الفتنق سواه الديارحى - مشکواة باب الكرابات ابن جوزاء سے مروی ہے ایک مرتبہ اہل مدینہ سخت قحط میں مبتلا ہو گئے یعنی بارش نہیں پڑ رہی تھی تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس شکایت کی۔ آپ نے فرمایا نبی کریم کے مزارِ انور کی طرف دیکھو اور ان کے حجرہ سے محوڑا سا سوراخ کر دو یہاں تک کہ آپ کی قبر انور اور آسمان کے درمیان کوئی چھت یعنی حجاب نہ رہے۔ پس صحابہ کرام نے ایسے ہی کیا۔ اتنی کثیر بارش ہوئی جس سے بہت بارش سے بہت سی گھاس اُگی۔ اونٹ وہ گھاس کھا کھا کرتے موٹے ہوئے کہ چربی کی وجہ سے ان کی گھانٹیں وغیرہ پھٹ گئیں۔ اس سال کا نام ہی عام الفتنق (پھٹنے کا سال) پڑ گیا۔ اس حدیث کے ماتحت علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاة میں بیان فرماتے ہیں۔

وقيل انه صلى الله عليه وسلم كان يستشفهم به عند الجذب فمطر السماء فامرت عائشة بكشف قبره مبالغتني لاستشفاع فلا يبقى بينه وبين السماء حجاب بيان کیا گیا ہے کہ نبی کریم کے توسل سے جب قحط سالی میں بارش طلب کی جاتی تو بارش ہو جاتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو فرمایا کہ آپ کے مزارِ انور اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے یہ توسل میں مبالغہ ثابت کرنا تھا۔ اسی طرح ایک واقعہ دلو انہم اذ ظلموا انفسهم الخ کے ماتحت بحوالہ مدارک گزر چکا ہے۔ سمجھنے کے لیے کافی ہے طوالت سے بچنے کے لیے مختصار سے کام لیا جا رہا ہے ورنہ اور کئی

واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں۔

صلیٰ کے مزارات سے توسل

قال الامام الشافعی الی لا تبرک

بابی عنیفہ رحمۃ اللہ و اجیبی الی قبرہ فاذا عرضت لی حاجتہ
صلیت رکعتین و سالت اللہ عند قبرہ فتقضى سریعا۔ شامی جلد اول
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
سے تبرک حاصل کرتا ہوں۔ آپ کے مزار انور پر حاضری دیتا ہوں۔ جب کوئی حاجت
درپیش آتی ہے تو دو رکعت نماز نفل ادا کرتا ہوں۔ پھر امام ابوحنیفہ کی قبر کے پاس آکر
اللہ سے سوال کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری حاجت کو جلدی پورا کر دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سوال تو اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں لیکن امام
اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی قبر انور کے توسل سے۔ اور تبرک حاصل کرتے ہیں اور ان کی حاجت
پوری کی جاتی ہے۔ معروف الکرخنی بن فیروزی من المشائخ الکبار
مستجاب الدعوات یستقی بقبرہ وهو استاذ السری سقطی۔

والمختار جلد اول

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد کرخی بن فیروز جو بہت بڑے مشائخ سے
تھے جن کی دعا کو قبول کیا جاتا تھا۔ ان کی قبر انور کے توسل سے دعا قبول کی جاتی تھی
حیات الانبیاء و اولیاء علیہم السلام حضرت ابوالدرداء سے حدیث مروی ہے جس
کا کچھ حصہ یہ ہے: ان اللہ حرم علی الامم ان تاكل اجساد الانبياء
فنبی اللہ صلی علیہ وسلم۔ رواہ ابن ماجہ مشکوٰۃ باب الجمعة
نبی کریم کا ارشاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ انبیاء کرام
کے جسموں کو کھائے۔ اللہ کے نبی زندہ ہوتے ہیں انکو رزق دیا جاتا ہے۔

اس پر مرقاۃ میں ہے: ولذا قبل اولیاء اللہ لایموتون و لکن
یسئلون من دار العناء الی دار البقاء۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ

کے ولی نہیں مرتے لیکن وہ ایک دار سے دوسرے دار میں منتقل ہوتے ہیں۔ یزرق کے ماتحت لکھتے ہیں: ولاینا فیہ ان یکون ہناک رنق حسی ایضا وهو الظاہر المتبادر۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر انبیاء کو رزق دیے جاتے کے متعلق یہ کہا جائے کہ ان کو فی الواقع حساً رزق دیا جاتا ہے یہ کوئی منافی نہیں بلکہ ظاہر متبادر ہی ہے۔ والبیہقی فی کتاب حیاة الانبیاء عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ

وسلم قال الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون (الحاوی للفتاویٰ)

بیہقی نے کتاب حیاة الانبیاء میں حضرت انس سے روایت کی ہے نبی کریم نے فرمایا: کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔ الحاوی للفتاویٰ میں بیہقی کے حوالہ سے ہی بیان کیا گیا ہے ان علی بعد موتی کعلی فی الحیوة نبی کریم فرماتے ہیں کہ میرا علم وفات کے بعد بھی اسی طرح ہے جس طرح ظاہری زندگی میں قال الشیخ عقیف الدین الیافی الاولیاء مترجم علیہم احوال یشاہدون

فیہا ملکوت السموات والارض وینظرون الانبیاء احیاء غیر اموات کما نظر النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی موسیٰ علیہ السلام فی قبرہ قال وقد تقر ان ماجاز للانبیاء معجزة جاز للانبیاء کراماً

بشرط عدم التحدی (الحاوی للفتاویٰ)

شیخ عقیف الدین یافعی فرماتے ہیں کہ انبیائے کرام پر احوال پیش کیے جاتے ہیں وہ زمین و آسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انبیائے کرام زندہ حالت میں دیکھتے ہیں جس طرح کہ نبی کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں دیکھا۔ شیخ یافعی فرماتے ہیں کہ یہ ثابت ہے کہ جو چیز انبیائے کرام کے لیے بطور معجزہ ثابت ہو سکتی ہے وہ اولیاء کے لیے بطور کرامت ثابت ہو سکتی ہے البتہ انبیائے کرام کے معجزات بوقت معاضدہ ثابت ہوتے ہیں لیکن کرامات میں معارضہ نہ ہونا شرط ہے۔ آخر میں بطور تبرک قبلہ استاذی المکرم کی کتاب جلال الصدور سے ایک حوالہ مع ترجمہ نقل کر رہا ہوں۔ دلائل اس موضوع پر اسی میں دیکھے جائیں۔ میں نے تو تراجم کا فرق بیان کرتے ہوئے ضمناً اس موضوع پر مختصر

بحث کردی جس پر تراجم کے فرق کا سمجھنا موقوف تھا۔

علامہ قسطلانی شاکح بخاری مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں لا فرق بین موتہ

وحیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مشاہدۃ الامتہ ومعرفۃہم باحوالہم

و نیاتہم و عنانہم و خواطرہم و ذلک جلی عندہ لا خفاء بہ۔

(مواہب لدنیہ مع زرقانی جلد ثامن ص ۳۰۵) ترجمہ: آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات طیبہ اور عالم برزخ کی زندگی مبارک میں اپنی امت کے مشاہدہ اور ان کے احوال و کیفیات قلبی ارادوں اور نیات عزائم و خواطر کی معرفت میں کوئی فرق نہیں اور امت کے سب امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح و منکشف ہیں۔ ان میں کسی قسم کا خفا اور پوشیدگی نہیں۔ (انتہی)

صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم محفوظ رہتے ہیں۔ طحاوی میں آتا ہے کہ فان معاویہ لما

اراد تعویبہم ليجری العین القی باحد عند قبورہ المشہدہ

وجدہم کما دفسوا حق ان المصاة اصابت اصبع حمزة

رضی اللہ عنہ فانقطرت دما فترکہم۔ طحاوی فصل الصلوة علیہ

اعلی الشہید حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب احد کے شہداء کرام کی قبروں

کو بہرے لے کر ارادہ کیا تا کہ احد کے چشمہ کو جامی کیا جاسکے۔ ان کو ایسے ہی پایا جسے

وہ دفن کئے گئے تھے یہاں تک کہ غلطی سے کنڈالی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی انگلی

مبارک پر لگی تو خون جاری ہو گیا۔ پھر اسی حال پر ان شہداء کرام کو حضور دیا گیا۔

اب اس وضاحت کے بعد ثابت ہو گیا کہ اولیائے کرام اور انبیائے کرام کو قبروں

میں زندگی حاصل ہے۔ ان کے نوسل سے دعا جانتے ہیں۔ کوئی مسلمان ان کو محبوب سمجھ

کر پوجتا نہیں۔ مجبوری سے اللہ تعالیٰ وعدہ لا یشرک لہ۔ اب بھی اگر کوئی مسلمان

کو مشرک کہے اور اس آیت کریمہ کو ان پر ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اللہ ہی اس کو

ہدایت دے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے اجسام محفوظ رہنے میں راقم کو اس لیے بھی کامل یقین ہے کہ راقم کے

کے پردادا قاضی غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ۸ سال بعد قبر میں سوراخ ہو جانے کی وجہ سے پانی بھر گیا۔ اس پانی کو نکالنے کے لیے آپ کے جسم مبارک کو قبر سے باہر نکالا گیا تو جسم صحیح اور کفن درست۔ ڈاڑھی مبارک میں غسل کے پانی کے قطرات موجود تھے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفِ

الضَّرِّ عَنْكُمْ وَلَا خَوْلِيَّاهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ

يَتَّبِعُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَوْ سِئَلْتُمْ أَقْرَبُ وَيَجْعَلُونَ رَحْمَةً

وَيَخَافُونَ عَذَابَ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْظُورًا ﴿١٥﴾

• کہ پکارو جن کو سمجھتے ہو سو اس کے نہیں اختیار کھتے کہ تکلیف کھول دیں تم سے نہ بدل دیں۔ وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اس کی مہر کی اور ڈرتے ہیں اس کی ما سے۔ بے شک تیرے رب کی مار ڈرنے کی چیز ہے۔ (شاہ عبدالقادر)

• آپ فرمادیں گے کہ جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی سو وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار کھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا۔ اور یہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے قابل (مولانا اشرف علی)۔

• کہو پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اس کے، وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول دیں تکلیف تم سے اور نہ بدل دیں وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں۔ وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون سا بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اس کی مہر بانی کی اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے۔ بے شک تیرے رب کا عذاب

ڈرنے کی چیز ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

• ان سے کہو پکارو دیکھو ان مجبوروں کو جن کو تم خدا کے سوا اپنا کارساز سمجھتے ہو۔ وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ٹھا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون ان سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق (مودودی)۔

• تم فرماؤ پکارو انہیں جن کو اللہ کے سوا گمان کرتے ہو تو وہ اختیار نہیں رکھتے تم سے تکلیف دور کرنے اور نہ پھیر دینے کا وہ مقبول بندے تھیں یہ کافر پوجتے ہیں وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب ہے، اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمہارے رب کا عذاب ڈر کی چیز ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اولئک الذین یدعون کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے وہ مقبول بندے تھیں یہ کافر پوجتے ہیں۔ دوسرے تراجم میں مطلقاً ذکر ہے اور ان پوجنے کی بجائے پکارنا ہے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت یہ ہے کہ یہاں جن مجبوروں کا ذکر ہوا ہے وہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ ہیں۔ وہ یقیناً مقبول بندے ہیں۔

اسی طرح بعض تراجم میں یہ ہے "اور یہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں۔" لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں مشرکین کی جگہ کافر ہے۔ بعض میں یہ کافر پوجتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ پر مشرکین کے لفظ کا اطلاق اختلافی ہے لیکن کافر کا اطلاق اتفاقاً ہے۔ اب تفسیر کبیر سے عبارت پیش کی جا رہی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مجبوروں سے مراد حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ ہیں۔ اسی طرح مجبوروں کے مناسب لفظ پوجنا ہے نہ کہ پکارنا۔ ولیس المراد الاصنام لانہ تعالیٰ قال فی صفتہم اولئک الذین یدعون یتفون الی ہم الوسیلۃ وابتغوا الوسیلۃ الی ہامئہ تعالیٰ لایلیق بالاصنام المبتتہ۔

یہاں بت مراد نہیں ہو سکتے کہونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ مجبور تو خود اپنے سے زیادہ
مقرب کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ (یعنی ان کو مجبور ملنے تو وہ تمہارے قول کے مطابق کچھیت
مجبور ہونے کے اللہ سے مقابلہ کریں اور تم سے ضرر و نفع کو دور کریں۔ یہ ممکن نہیں)۔
بت تو یقیناً وسیلہ تلاش کرنے سے عاجز ہیں: اولئک الذین یدعون
ہم الانبیاء الذین ذکرہم اللہ تعالیٰ بقولہ ولقد فضلنا
بعض النبیین علی بعض وتعلق ہذا الکلام بما سبق ہوا ان
الذین عظمت منزلتہم وہم الانبیاء لا یعبدون
الامثہ ولا یستغون الوسیلۃ الالیہ فانتم بالاعتقاد بہم حق
فلا تعبدوا غیر اللہ تعالیٰ۔ یعنی اولئک الذین یدعون سے مراد انبیائے کرام
جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے قول سے ما قبل کی آیت کریمہ میں بیان کیا ہے ولقد
فضلنا بعض النبیین علی بعض۔ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت
دی۔ اس کلام کا تعلق ما سبق سے ہے۔ وہ جن کو عظیم مرتبہ عطا ہوا (وہ مقبول بندے
ہیں) اور وہ انبیائے کرام ہیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اپنے سے
مقرب (زیادہ مرتبے والے نبی) کا وسیلہ صرف اللہ کے قرب کے لیے ہی تلاش کرتے
ہیں۔ تمہیں بھی ان کی اقتدا کا ہی حق پہنچتا ہے۔ پس تم بھی اللہ کے بغیر کسی کی عبادت نہ
کرو۔ اب اس وضاحت کے بعد اس میں سمجھنا مشکل نہ رہا
کہ وہ جن کو پوجا کا ذکر ہے وہ انبیائے کرام ہیں۔ وہ مقبول بندے ہیں۔ مراد عبادت
(پوجا کرتا ہے) صرف پکارنا نہیں۔ اور منج عبادت سے کیا ہے نہ کہ ان کے وسیلہ
سے۔ مقرب کا وسیلہ تو خود قرآن پاک سے ثابت ہوا۔ اسے رد نہیں کیا گیا کیونکہ بیعتوں
الی سبہم الوسیلۃ! فرمایا گیا ہے۔ ان کے ضرر و نفع کی نفی ان
کی الوہیت سے مقید ہونے کی صورت میں ہے مطلق نہیں ورنہ شفاعت، دعا
اور ان کے وسیلہ سے نفع کا اندفاع پہلے کئی مقامات پر پیش کیا جا چکا ہے۔

وَكَانَ وَدَانَهُمْ مَمْلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا (پط ۱۷)

اور تھانرے ان کے ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو (شاہ رفیع الدین) کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔
(مودودی)

ان کے پرے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر (مولانا محمود الحسن)۔
ان کے پرے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر (شاہ عبدالقادر) اور ان لوگوں کے آگے کی طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا۔
(مولانا اشرف علی)

اور ان کے سامنے (کی طرف) ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کو زبردستی چھین لیتا تھا (فتح محمد)۔

اور ان کے سچھے ایک بادشاہ تھا کہ ہر ثابت کشتی زبردستی چھین لیتا۔ اعلیٰ حضرت یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر ہے جب کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑ دیا تھا یعنی اس کے دو ٹکڑے اکھیر دیے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر تعجب کرتے ہوئے اس امر کو امر عظیم سمجھا کیونکہ کشتی بان نے ان حضرات سے کرایہ بھی وصول نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے بھی یہ بات حیران کن تھی کہ اے شخص کا نقصان کرنا بہت ہی امر عظیم ہے۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے اس تعجب پر یہی سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ کشتی کو توڑنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ ہے اُن کے سچھے جو ہر ثابت کشتی کو چھین لیتا ہے اس لیے اس کشتی کو عیب ناک کیا ہے تاکہ اس سے بچ جائے اور معمولی مزدوری سے اس کو صحیح کر لے۔

یہ مضمون اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے زیادہ واضح ہے کیونکہ اگر وہ بادشاہ ہر کشتی کو چھین رہا تھا تو یہ بھی کشتی تھی باوجودیکہ عیب ناک تھی حالانکہ وہ تو فقط صحیح اور ثابت کو چھین لیتا تھا۔

يعب تلك السفينة بالتحريق يغبها ذلك الملك وفانت منافعها
عن ملاكها بالكلية - یعنی آپ کو معدوم تھا کہ اگر وہ کشتی کو توڑ کر عیب ناک نہیں
کرتے تو وہ بادشاہ اس کو چھین لے گا اور کشتی کے مالکوں کا مکمل طور پر نفع حاصل کرنا
ختم ہو جائے گا۔

اس سے مقصد یہ حاصل ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور بات
کو مکمل طور پر سمجھانا ہے۔

مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (پا ۶)

دُھوم اٹھاتے ہیں ملک میں۔ (مولانا محمود الحسن؛ شاہ عبد القادر)۔

زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر ہو رہا ہے سکندر ذوالقمرین کا جب ان کو ایک قوم نے کہا کہ یا جوج
ما جوج زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ہم تمہیں پیسے جمع کر کے دیتے ہیں تم ہمارے او
ان کے درمیان ایک دیوار بنا دو۔ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ مفسدون کا کیا ہے "زمین میں
فساد مچاتے ہیں" دیگر مذکورہ تراجم میں ہے "دھوم اٹھاتے ہیں" حالانکہ اردو محاورہ
میں اچھے کام کی شہرت ہو تو پھر بھی دھوم اٹھاتے ہیں یا دھوم مچاتے ہیں الفاظ استعمال
ہوتے ہیں۔ اس لیے دھوم اٹھانا مقصد کو واضح نہیں کرتا بلکہ مقصد کے مطابق یہ ہی
ہے کہ زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ان کے فساد کو تفسیر کبیر میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے :

واختلفوا في كيفية افسادهم في الارض فقيل كانوا يقتلون الناس

وقيل كانوا ياكلون لحوم الناس وقيل كانوا يخرجون ايام

الربيع فلا يتركون لهم شيئا اخضروا بالجملة فلفظ الفساد محتمل لكل

هذه الاقسام - یا جوج بل جوج کے زمین میں فساد پھیلانے میں مختلف قول ہیں کہ وہ

کسے فساد پھیلاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ لوگوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ایک قول یہ

ہے کہ وہ لوگوں کا گوشت کھاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ موسم بہار میں نکلتے تھے۔

ان کے لیے کوئی سبز چیز یعنی درخت، پودے وغیرہ نہیں چھوڑتے تھے۔
حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ فساد ان تمام صوتوں کا احتمال رکھتا ہے کہ وہ ان قسموں
میں سے ہر ایک کو شامل ہے۔ یعنی وہ ان فساد کاموں میں سے ہر ایک کام کرتے تھے۔

روح المعانی میں ہے: مفسدون فی الارض اى فی الارضنا
بالقتل والمقزیب وسمائر وجبوه الافساد المعلم
من البشر وہ زمین میں فساد مچاتے ہیں یعنی وہ ہماری زمین میں قتل و غارت،
تخریب کاری، ہر قسم کا غلط کام جو انسانوں سے واقع ہوتا ہے وہ کرتے ہیں۔
معلوم ہوا کہ ان مذکورہ معانی کو فساد مچاتے ہیں "ترجمہ حاوی ہے نہ کہ دھوم
مچاتے ہیں۔"

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (پہلا پارہ)

آپ کہ دیجیے کہ میں تو بس تمہارا ہی جیسا بشر ہوں۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔
کہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ (فتح محمد)۔

تو کہ میں ایک آدمی ہوں جیسے تم (محمود الحسن)۔
تو کہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم۔ (شاہ عبدالقادر)۔
کہ سوائے اس کے نہیں کہ میں آدمی ہوں مانند تمہارے (شاہ رفیع الدین)۔

آپ کہ دیجیے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں۔ (اشرف علی)

اے نبی کہو میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا (مودودی)۔

تم فرماؤ ظاہر صورت بشری میں تو میں تم جیسا ہوں (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت کے اس ترجمہ پر معترضین نے ان الفاظ بہ اعتراض کیا :-

"مولتا بریلوی نے یہاں تمہاری طرح کے ساتھ ظاہری صوت بشری کا اضافہ کر کے

قرآنی مفہوم کو اپنے عقیدے کے مطابق ڈھالنے کی سادش کی۔ یہ اعتراض فقط مخالفت
پر مبنی ہے یا نبی کریم کی حقیقت سے بے خبری کی علامت ہے اور نبی کریم کی نورانیت کا

انکار ہے حالانکہ قرآن پاک سے نبی کریم کی نورانیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے :

قد جاءكم من انثى نوسا و کتاب مبين پ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں علامہ آلوسی روح المعانی میں ذکر فرماتے ہیں : قد جاءكم من انثى نوسا - عظیم و ہونوس الانوار والنبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نورِ عظیم آگیا جو تمام نوروں کا نور اور نبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے بعد اس طرح ذکر کیا :

وقال الطیبی انه اوفق لتکریب قولہ سبحانہ وتعالیٰ قد جاءکم بغیر عطف فعلق بہ اولاد وصف الرسالت والثانی وصف الکتاب ولا یبعد عندی ان یواد بالنوسا و الکتاب المبین هو النبی صلی اللہ علیہ وسلم علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہاں زیادہ مناسب یہ ہے کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی ہو کیونکہ پہلے یا اهل الکتاب قد جاءکم سولنا ذکر فرمایا پھر بغیر عطف کے قد جاءکم من انثى نوسا ذکر فرمایا۔ دونوں سے مراد ایک ہی ذات ہے۔ اسی لیے صرف عطف کو ذکر نہیں فرمایا لیکن صرف عطف معانرت پر دلالت کرتا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ کوئی بعید نہیں کہ نور سے مراد اور کتاب مبین سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ بلا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح شفا میں یہی فرماتے ہیں وای مانع من ان یجعل النعتان لسول صلی اللہ علیہ وسلم فانہ نوسا عظیم کمال ظہور ہاہ بین الانوار و کتاب مبین حیث انه جامع لجميع الاسماء و مظهر للحکام و الدعوال والاخبار۔ کون سا امر مانع ہے کہ نور اور کتاب مبین دونوں ہی سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں کیونکہ آپ انوار کے درمیان کمالِ ظہور کے لیے نورِ عظیم ہیں اور آپ کتاب مبین اس لیے ہیں کہ آپ تمام اسرار کے جامع ہیں اور تمام احکام و احوال اور اخبار کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ البتہ مستتر لیوں نے نور اور کتاب مبین سے مراد قرآن پاک لیا ہے جیسا کہ روح المعانی میں ہے : وقال ابو علی الجبائی عنی بالنوسا القرآن لکشفہ و اظہارہ طرق الہدی والیقین و اقتصر علی ذلک الزم حشری - ابو علی جبائی نے

کہا کہ نور سے مراد قرآن پاک ہے کیونکہ قرآن پاک ہدایت و یقین کے طریق کو ظاہر اور
 مشکف کرتا ہے۔ ز محشری بھی اسی کا قائل ہے۔ لیکن اہل علم حضرات سے یہ مخفی نہیں
 کہ ابو علی جیانی اور ز محشری معتزلہ کے امام اور رئیس مانے جلتے ہیں۔
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کے انکار میں اس حد تک متجاوز ہونا کہ معتزلہ
 کا مقلد بن جانا اور اکابر اہل سنت علامہ آلوسی صاحب روح المعانی اور علی قاری اور
 دیگر مفسرین کرام کے اقوال سے روگردانی عقل و دانش کا کام نہیں۔ اور پھر نبی کریم
 صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد گرامی اول ما خلق اللہ نوری (سب سے پہلے
 اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا کیا) کو مولانا حسین احمد مدنی نے اٹھاباں شاقب میں
 نقل کیا مولانا اشرف علی صاحب نثر الطیب میں نور محمدی کے باب میں کئی احادیث
 بیان کرتے ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کا ذکر ہے۔ اور مولانا محمد قاسم
 نانوتوی قصائد قاسمیہ میں اس طرح فرماتے ہیں۔

رہا جمال پہ تیرے حجاب بشریت نہ جانا کسی نے تجھے بجز ستار
 سوا خدا کے بھلا کوئی تجھ کو کیلے جانے تو شمسی تو ہے شہر منط اولوالابصار
 اپنے اکابر کی ان تخریروں کو پڑھنے کے بعد تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض نہ کیا
 جلتے کہ آپ نے ظاہر بشریت کہا ہے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نور اور
 ظاہر بشریت کے عقیدہ میں اعلیٰ حضرت منفر و نہیں بلکہ یہی عقیدہ سلف صالحین کا ہے۔
 علامہ خواجه شرف شفا میں لایمکن فی سنیۃ اللہ اس سال الملک الاولین
 ہو من جنس او من خصہ اللہ کالانبیاء والرسل - کے تحت فرماتے ہیں:

فانہم خلقہا اللہ تعالیٰ بابدان بشریۃ و ارواح ملکیتہ فکانوا دون غیبہم
 مستعین لمقاومت الملک و مخالفتہ و مخاطبہ - (نسیم الریاض جلد ۱)
 انبیاء اور رسولوں پر ملائکہ کا نزول اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
 بدن ظاہری بشری بنائے لیکن ان کے ارواح ملکی یعنی نوری ہیں اسی وجہ سے انبیاء
 ملائکہ سے میل جول اور مطلب کی طاقت رکھتے ہیں جبکہ دوسرے انسان اس طاقت

سے قاصر ہیں۔

اسی طرح نسیم الریاض جلد سوم میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق بعینہ الفاظ ملتے ہیں ظاہرہ صلی اللہ علیہ وسلم بشری ویاطنہ ملکی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر بشری ہیں اور باطنی ملکی ہیں۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ آپ کا ترجمہ کتنی بڑی تفصیل کو بالا اختصار حاوی ہے۔
اس مسئلہ نور و بشر کو اگر کوئی بالتفصیل دیکھنا چاہے تو اس تازی المکرم کی کتاب تنویر الابصار کا مطالعہ کرے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي (پارا ۱۰)

یو لاءے رب میرے بوڑھی ہو گئیں ہڈیاں (شاہ عبدالقادر)۔
عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں۔ (اشرف علی)۔
یو لاءے رب بوڑھی ہو گئیں میری ہڈیاں (محمود الحسن)۔
عرض کیا اے میرے رب میری ہڈی کمزور ہو گئی (اعلیٰ حضرت)۔
یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی پیرائہ سالی میں التجاہ ہے۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ حال صاحب اعظم کا ترجمہ ہڈی کرتے ہیں۔ تمام مترجمین فارسی اور اردو اس کا ترجمہ جمع کے صیغہ میں ہڈیاں لکھتے ہیں۔ حال صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اعظم پر الف لام کیسا ہے اور اس کا ترجمہ بصیغہ جمع تمام سلف نے کیوں کیا۔ پہلے تو یہ غور کریں کہ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کے لیے دعا کی اور عرض کیا کہ میری ہڈی کمزور ہو گئی۔ اس ہڈی سے مراد صلب یعنی پشت کی ہڈی مراد ہے جو نطفہ کی جائے قرار ہے۔ قرآن میں دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :
يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ جُو نکلتا ہے پیٹھ اور سینوں کے بیچ سے چونکہ مرد کا نطفہ پیٹھ میں ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے : وَهْنُ الْعَظْمِ

انہی ضعف و اسناد ذلک الی العظم لانه عماد البدن و دعام الجسد
 فاذا اصابه الضعف والرخاوة تداخى ماوسا ائمه وتساقطت
 قوتہ - یعنی وہن کا معنی کمزور ہے اور اس وہن کی نسبت ہڈی کی طر
 کی گئی ہے کیونکہ وہ جسم و بدن کا ستون ہے۔ جب وہ کمزور ہو جائے تو تمام جسم کمزور ہو
 جاتا ہے اور قوت ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سے سمجھ آتا ہے کہ بدن کا ستون اگر ٹرھ کی
 ہڈی ہی ہے اور وہی مختبر ہے۔ روح المعانی کی عبارات میں مفرد ضمائر بھی اس معنی
 پر وال ہیں:- وافرد علی ما قالہ العلامة الزمخشیری و اس تضاع کثیر

من المحققین لان المراد هو البدال علی معنی الجنسیة والقصد الی
 ان الجنس الذی هو العمود والقوام واشد ما ترکب منه للجسد
 قد اصابه الوهن - (روح المعانی) یہاں عظم اہڈی کو مفرد لایا گیا علامہ زمخشر
 نے بھی یہی کہا ہے اور کثیر محققین نے اسے سی پسند کیا ہے کیونکہ مفرد وہ معنی جنسیہ پر
 وال ہے اور جنس سے مراد جسم کا ستون اور قوام ہے اور وہ سخت ہے جس سے جسم مرکب
 ہوتا ہے اور کبھی اس میں کمزوری آجاتی ہے مفرد معنی کثیر محققین کا پسندیدہ ہے اور مراد
 اس سے ریڑھ کی ہڈی ہی ہے۔ و وجدہ لان الواحد هو البدال علی معنی
 الجنسیة والمراد ان هذا الجنس الذی هو العمود والقوام واشد
 ما ترکب به الجسد قد اصابه الوهن - (مدارک)

عظم (ہڈی) کو واحد ذکر کیا گیا ہے کیونکہ واحد یہاں معنی جنسیہ پر وال ہے اور جنس سے
 مراد وہ ستون اور قوام اور وہ سخت ہے جس سے جسم مرکب ہوتا ہے اور اس میں
 کمزوری واقع ہوتی ہے۔ مدارک سے بھی پتہ چلا کہ معنی مفرد والا یہی زیادہ مناسب ہے
 اب یہ کہنا کہ خال صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ الف لام کیسا ہے۔ اس سے یہ بہتر تھا
 کہ کہا جاتا کہ خال صاحب کو تو یہ معلوم تھا کہ الف لام جنسی ہے البتہ خال صاحب
 کے بغیر دو ہڈوں کو الف لام کا ترجمہ کرنا نہیں آیا کہ الف لام جنسی کا ترجمہ کیسے کیا جانا
 چاہیے۔ الف لام جنسی کا ترجمہ جمع سے نہیں کیا جاتا۔ الرجل خیر من المرأة

یعنی ماہیتِ رجل ماہیتِ مرآة سے بہتر ہے۔ اور یہ معنی نہیں کہ افرادِ رجل افرادِ مرآة سے بہتر ہیں۔ (ایضاح المطالب شرح کافیہ مولانا مشیت اللہ دیوبندی)۔

ان الجنسی ما یشار بہا الی ماہیۃ الثئی من غیر ملاحظۃ الوحده والکثیرۃ
(تحریر مستنبط) الف لام جنسی سے کسی چیز کی ماہیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے وحدت و کثرت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ الف لام جنس آٹرا گویند کہ اشارہ کند بسوی ماہیت مدخل خود قطع نظر از فرد و افراد (جامع الفروض) الف لام جنسی اسے کہتے ہیں کہ جس سے ماہیت کی طرف اشارہ ہو کسی ایک فرد یا زیادہ افراد کا لحاظ نہ کیا جائے جب کہ الف لام جنسی کثرت یعنی جمع کے معنی کو مستلزم ہی نہیں تو پھر جمع کا معنی کرنے پر اصرار کیوں اور اپنی لاعلمی کو دوسرے پر محمول کرنا کہاں کی دانش ہے۔

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ رِطًا

- پھر وہ اپنی قوم کے روبرو حجرہ میں سے برآمد ہوئے (عبدالماجد دریا آبادی)۔
- پس نکلا اوپر قوم اپنی کے محراب سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- پھر نکلا اپنے لوگوں کے پاس حجرے سے (شاہ عبدالقادر)، (مولانا محمود الحسن)
- پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے۔ (اشرف علی)۔
- چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا (موودوی)۔
- تو اپنی قوم پر مسجد سے باہر آیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے جب آپ محراب سے اپنی قوم پر باہر تشریف لائے۔ یہاں محراب کا معنی باقی حضرات نے حجرہ کیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں محراب کو مسجد کہہ دیا گیا ہے۔ تفاسیر میں بھی محراب کو مسجد کے معنی میں لیا گیا ہے۔ حجرہ عام ہے کسی کمرہ پر بھی بولا جاسکتا ہے لیکن مسجد خاص ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ حجرہ کا اطلاق مسجد پر ضروری ہے جلالین میں ہے: من المِحْرَابِ ای مسجد وکانوا ینتظرون فقہ لیسوا فیہ بامرہ علی العادۃ۔ یعنی محراب سے مراد

مسجد ہے۔ لوگ آپ کے کھولنے کے منتظر رہتے تھے تاکہ بحسب اوقات آپ کے حکم سے اس میں نماز ادا کریں۔ جمل میں ہے: **وَكَانُوا يَنْتَظِرُونَ** الخ فان هو مقیابہ ولا یفتحہ الا وقت الصلوة ولا یدخلونہ الا باذنہ۔ آپ اس میں مقیم رہتے تھے سوائے نماز کے وقت کے۔ اس کو نہیں کھولتے تھے۔ اول لوگ آپ کی اجازت کے بغیر اس میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ رُوح المعانی میں ہے:

من المحراب ای من المصلی یعنی نماز کی جگہ (مسجد) سے نکلے۔ ویسی ہی محل العبادۃ محراب بالمان العابد کالمحارب للشیطان فیہ (روح المعانی) عبادت کی جگہ کو محراب کہا جاتا ہے کیونکہ عابد وہاں شیطان سے لڑائی کرتا ہے کیونکہ محاربت کا معنی لڑائی کرنا ہے۔ مدارک میں ہے: من المحراب ای من موضع صلواتہ وکانوا ینتظرونہ۔ محراب سے مراد نمازوں کی جگہ (مسجد) ہے۔ لوگ آپ کی انتظار فرماتے تھے۔

ان تقاسیر کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ محراب کا معنی مسجد ہی زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ حجرہ ضروری نہیں کہ نماز کی جگہ ہو اور مسجد کو بھی شامل ہو۔ جلالین اور جمل کی عبارات سے یہ عقده بھی حل ہو گیا کہ مراد مسجد ہی ہے۔ عام حجرہ میں کبھی کبھی نماز ادا کر لی جاتی ہو یہ مراد نہیں بلکہ عام لوگ اس میں نماز پڑھتے تھے اور اس کی چابی حضرت زکریا کے پاس ہوتی تھی اور آپ اسے نماز کے وقت کھولتے تھے۔ یہ واضح حقائق اس کا بین ثبوت ہیں کہ مراد مسجد ہے۔

وَاتَيْنَا الْحُكْمَ صَبِيًّا (پہلے)

- اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکپن میں۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- اور دیا ہم نے اس کو حکم لڑکپن سے (شاہ رفیع الدین)۔
- اور ہم نے ان کو لڑکپن میں سمجھ دے دی تھی (عبد الماجد وریا آبادی)۔
- اور ہم نے ان کو لڑکپن ہی میں دانائی عطا فرمائی۔ (فتح محمد)۔

- اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکپن میں (محمود الحسن)۔
 - اور ان کو لڑکپن ہی میں سمجھ عطا فرمائی (مولانا اشرف علی)۔
 - ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا۔ (مودودی)۔
 - اور ہم نے اسے بچپن ہی میں نبوت دی۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- باقی حضرات کے تراجم میں تو حکم کرنا مذکور ہے۔ اسی طرح دانائی۔ سمجھ عطا کرنا۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ ہے کہ ہم نے نبوت دی۔ اس معنی کی تائید کی تفسیر کبیر کو دیکھا جائے جس میں یہ مذکور ہے: والاقرب حملہ علی المنبوة لوجهین الاول
- ان الله تعالى ذكر في هذه الآية صفات شرفه ومنقبته ومعلوم ان المنبوة اشرف صفات الانسان فذكرها في معرض المدح ادلى من ذكر غيرها فوجب ان تكون نبوته مذكورة في هذه الآية ولا لفظ يصلح للدلالة على المنبوة الا هذه اللفظة فوجب حملها عليها۔
- والثاني ان الحكم هو ما يصلح لان يحكم به على غيره ولغيره على الاطلاق وذلك لا يكون الا بالمنبوة۔ تفسیر کبیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ نے حکم کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے ایک معنی نبوت کیا ہے اور حکم بمعنی نبوت کے زیادہ بہتر سمجھتے ہوئے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
- حکم کو نبوت کے معنی میں لینا زیادہ مناسب ہے۔ اس کی دو وجہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت سخی علیہ السلام کی صفات میں سے اشرف صفات کا ذکر فرمایا اور آپ کی منقبت بیان کی ہے اس لیے یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ انسان کی صفات میں سے اشرف صفت نبوت ہی ہے اس لیے مقام مدح میں اسی کا ذکر کرنا بہ نسبت اور صفات کے زیادہ مناسب ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس آیت میں نبوت کا ذکر ہو اور نبوت پر دلالت کرنے کے لیے اس لفظ حکم کے بغیر اور کوئی لفظ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو نبوت کے معنی میں لیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بغیر حکم دینا یعنی اوامر و نواہی، جزا و سزا کا اعلیٰ الاطلاق

بغیر نبوت کے ممکن نہیں اس لیے بھی حکم کو بمعنی نبوت لینا زیادہ مناسب ہے۔

وَعَصَىٰ آدَمَ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (پارا ۱۱)

- اور حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا پھر راہ سے بہکا۔ (شاہ عبد القادر)۔
- اور آدم نے نافرمانی کی اپنے رب کی۔ پس گمراہ ہوئے (مولوی عاشق الہی میرٹھی)۔
- حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا پھر راہ راست سے بہکا (مولانا محمود الحسن)۔
- آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے۔ (مولانا شرف علی)۔
- آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ (مؤدودی)۔
- آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو وہ غلطی میں پڑ گئے (عبدالماجد دریا آبادی)۔
- آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ پائی۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کرتے وقت حضرت آدم علیہ السلام کے مقام کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا کیونکہ نبی کا گمراہ ہونا، بھٹک جانا، غلطی میں پڑ جانا نشان نبوت کے خلاف ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ادب و احترام میں غلطی کا استعمال کیا۔ اس مقام پر علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں اس طرح ذکر فرمایا:

ان ظاہر القراءات وان دل علی ان آدم عصى وغوى لكن ليس لاحد ان يقول ان آدم كان عاصيا غاویا۔ یعنی بیشک ظاہر قرآن پاک اگرچہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے عصیان و غایت واقع ہوئے لیکن کسی کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حکم ٹالا، وہ گمراہ ہوئے بھٹک گئے۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمائے جس کو حق پہنچا ہے۔ وہ اپنے بندے کے حق میں جو الفاظ استعمال کرے لیکن وہی حقیقتاً ان کے معانی سے ہم آگاہ ہے۔ روح المعانی میں ہے: وقد صرح القاضی ابوبکر بن العرب بعدم جواز نسیت العصیان للاباء الاذنیین الینا المماثلین

لنا کیفیہوں، نسبتاً لانا نسیباً، الاقدام والنوی المقدم المکرّم واسرافی ذلک القرطبی -
 قاضی ابوبکر نے صراحتاً بیان فرمایا کہ عصیاں یعنی نافرمانی، بھٹک جانا، بہک جانا،
 گمراہ ہو جانا، اس قسم کے الفاظ کی نسبت جب ہم اپنے والدین، آباؤ اجداد کی طرف نہیں
 کر سکتے اور یہ جائز نہیں تو انبیاء کرام جو کہ برگزیدہ، مکرم اور ہر طرح تعظیم و تکریم کے
 لحاظ سے مقدم ہیں انکی طرف ایسے الفاظ کی نسبت کیونکر ہو سکتی ہے یہ عالم التنزیل میں
 ہے: واعلم انه لا یجوز اطلاق العاصی وغیرہ علی آدم علیہ السلام لانہ
 انما یقال عاصی لمن اعتاد فعل المعصیۃ کا الرجل یخیط
 ثوبہ ولا یقال هو خیاط حتی یعاد ذلک
 ویعتادہ - یہ یقین بات ہے کہ آدم علیہ السلام برعاصی وغیرہ کے الفاظ
 یعنی ، نافرمان ہوا، بہک گیا، حکم ٹالا، گمراہ ہوا، قصور کیا، غلطی میں پڑ گیا، بھٹک
 گیا، کا اطلاق جائز نہیں، اس لیے کہ عاصی تو اسے کہیں گے جو عصیاں بار بار کرے اور
 اس کی عادت بنالے جس طرح کوئی آدمی کپڑا سیتا ہے اسے اس وقت تک خیاط (دری) یا
 نہیں کہیں گے جب تک وہ دوبارہ نہ کرے اور عادت نہ بنالے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام
 کے بارے میں یہ تو کہیں گے کہ ان سے ٹھول واقع ہوئی، لغزش واقع ہوئی، لیکن مخالف اللہ
 صاحب ایمان جو شان انبیاء کرام سے واقف ہو اس کے لیے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ
 کہے کہ نبی نے رب کا حکم ٹالا دیا، نبی بہک گیا، نبی نے قصور کیا، نبی غلطی میں پڑ گیا،
 نبی بھٹک گیا، نبی گمراہ ہو گیا۔ ہر صاحب خود ان الفاظ سے جو آدم علیہ السلام کی طرف
 منسوب کیے گئے ہیں اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جو الفاظ آپ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں،
 فرق سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات خود بخود واضح ہے کہ جس مقام پر بڑے بڑے جلیل القدر
 مفسرین کرام تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور عاصی اور غادی کے الفاظ کو براہ راست
 بغیر تاویل کیے آدم علیہ السلام پر چھول کرتے ہوئے چکپاتے ہیں اور اس نازک مرحلہ
 میں اپنے ایمان کی کشتی گمراہ بھنور میں پھنسنے سے گھبراتے ہوئے تاویلات کر کے
 اپنے آپ کو بچاتے ہیں تو ان کے شانہ بشانہ اعلیٰ حضرت بھی ترجمہ کرتے ہوئے اردو زبان میں

وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے سلامتی کے کنارے کشتی کو پار لگاتے ہیں لیکن اس کے عکس دیکر مترجمین اللہ کے نبی کو بہک گیا، بھٹک گیا، گمراہ ہو گیا کہ گمراہی طرح وادیِ خلدوا میں بھٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مہرزی دانش تراجم پر نظر کرنے سے تفاوتِ مقامات اور علمی سطح کا اندازہ خود کر سکتا ہے۔

اِذْ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ امِّكَ مَا يُوْحٰى د پ ۱

• یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا۔ ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا ہے۔ (مودودی)۔

- جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سنا تے ہیں۔ (محمود الحسن)۔
- جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سنا تے ہیں۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- جب ہم نے تمہاری والدہ کو الہام کیا تھا جو تمہیں بتایا جاتا ہے۔ (فتح محمد)
- جس وقت کہ وحی ڈالی ہم نے طرف ماں تیری کے وہ چیز کہ وحی کی جاتی ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

• ہم نے تیری ماں کو الہام کیا جو الہام کرنا تھا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر ہے۔ یہاں ظاہر طور پر یہ وہم ہوتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی جانب وحی آئی تو کیا وہ مقامِ نبوت پر فائز تھیں؟ اس کا ازالہ مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ یہاں وحی بمعنی الہام ہے۔ اور الہام کے لیے نبی کا ہونا ضروری نہیں۔ الہام غیر نبی کو بھی ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو واضح کرتا ہے کیونکہ آپ کے ترجمہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا بلکہ پہلے ہی اس کو زائل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے کہ "جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو" تو اس میں وہ اعتراض برقرار ہے کہ ہو سکتا ہے وہ حکم بواسطہ جبرائیل بھیجا گیا ہو اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی ہوں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کہ اس میں اعتراضات کو زائل کر دیا جاتا ہے اور ترجمہ لغابیر کے مطابق ہوتا

ہے۔ مدارک نے مایو حنی کے بعد ثنا اور الہام کے الفاظ کو ذکر کیا یعنی آپ کو الہام ہوا کسی چیز کا منکشف ہونا یا آپ کو سوائے ہوتے خواب میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ علامہ رازی نے بھی تفسیر کبیر میں وحی کو بمعنی الہام یا خواب یا دل میں تختہ ارادہ کا پایا جانا لیا ہے اور وجہ ان تاویلات کی یہ بیان کی ہے۔ اذ او حیثا فقد اتفق الاکثرون علی ان ام موسیٰ علیہ السلام ساکنت من الانبیاء والرسول فلا یجوز ان یکون المراد من هذا الوحی هو الوحی الواصل الی الانبیاء وکیف لا نقول ذلك والمرأة لا تصلح للقضاء والامامة بل عند الشافعی رحمہ اللہ لا تمکن من تزویجها نفسہا فکیف تصلح للنبوة۔ اکثرین کا اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہیں تھیں نہ ہی رسول تھیں پس اسی وجہ سے یہ جائز نہیں کہ اس وحی سے مراد وہ وحی ہو جو انبیاء کی طرف آتی ہے۔ یہ ہم کیسے نہ کہیں کیونکہ عورت جبکہ قاضی اور امام نہیں بن سکتی بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو وہ اپنا نکاح بھی خود بخیر ولی کی اجازت کے نہیں کر سکتی تو نبی کیسے بن سکتی ہے۔ اسی وجہ سے مذکورہ بالا توجیہات کی ضرورت درپیش آئی۔ علی حضرت کا ترجمہ بھی اس مقصد پر دال ہے۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب کا ترجمہ جو انھوں نے کیا یوحی کا کیا ہے، مقصد کے خلاف ہے۔

وَفَتَّكَ فَتُونًا اَبًا اَبًا

- اور جانچا ہم نے تجھے ایک ذرا جانچنا (محمود الحسن)۔
 - اور جانچا تجھ کو ایک ذرا جانچنا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 - اور آزما یا ہم نے تجھ کو آزمائش۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 - اور خوب تجھے جانچ لیا (علی حضرت)۔
- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے کہ ہم نے تمہیں غموں سے نجات اور

کئی قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب جانچ لیا یعنی کئی آزمائشوں میں مبتلا کیا۔ دوسرے مذکورہ تراجم میں ہے ایک ذرا جانچا۔ لفظ فتون مصدر ہو یا جمع ہو، قلت کے معنی پر وال نہیں اور نہ تنوین کو تخلص کے معنی میں لینے کی ضرورت ہے کیونکہ مصدر ہو تو تاکید کے معنی کو مستلزم ہے اور تاکید کے لحاظ پر صرف اتنا ترجمہ کافی ہے۔ جانچا ہم نے تجھے جانچنا۔ اور جمع کے لحاظ پر معنی ہی یہ ہو گا جو اعلیٰ حضرت نے کیا ہے: فتونا و جہات احدہما ان مصدر کا العکوف

والجلوس والمعنى وفتناك حقا لقوله تعالى وكلمنا موسى تكليما والشافى ان جمع فتن او فتنه اى فتنك ضرورى با من الفتن (المعنى من الكبير فتون میں دو وجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ مصدر ہے جس طرح عکوف اور جلوس مصدر ہیں اور معنی یہ ہے فتنك حقا یعنی ہم نے تمہیں یقیناً آزمایا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ہے: وكلمنا موسى تكليما۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یقیناً کلام کیا۔ یا یہ معنی کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی کلام کرنا۔ جس طرح یہاں قلت کا معنی مقصود نہیں اسی طرح فتونا میں بھی قلت کا معنی مقصود نہیں۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فتونا فتن یا فتنہ کی جمع ہے اور اب اس صوت میں معنی یہ ہو گا کہ ہم نے تمہیں کئی قسموں کی آزمائشوں سے آزمایا۔ اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے کہ ہم نے تجھے خوب جانچ لیا۔

قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذُكُرُهُمْ يُقَالُ لِرَبِّهِمْ دَرَبًا ۙ

- وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان ان کو کچھ کہتا اس کو پکارتے ہیں ابراہیم (شاہ عبدالقادر)
- بولے ہم نے ایک نو جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے۔ (موردی)

• کہا انھوں نے ہم نے ایک جوان کو کہ ذکر کرتا تھا اُن کا کہتے ہیں اس کو ابراہیم۔
(شاہ رفیع الدین)

• وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے اس کو کہتے ہیں
ابراہیم (محمود الحسن)۔

• بعضوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراہیم کہ کے پکارا جاتا
ہے، ان بتوں کا تذکرہ کرتے سنا۔ (مولانا اثر فاعلی)۔

• لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو اُن کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے اس کو ابراہیم
کہتے ہیں۔ (فتح محمد)

• اُن میں کچھ بولے ہم نے ایک جوان کو انھیں برا کہتے سنا جسے ابراہیم کہتے
ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے جبکہ آپ نے بتوں کو توڑ دیا تو آپ
کی قوم جب اپنے میتے سے واپس آئی تو کہنے لگے کہ یہ ہمکے بتوں سے ایسا کام کس
نے کیا؟ تو ان میں کچھ نے کہا کہ ہم نے ابراہیم کو ان بتوں کو برا کہتے سنا۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بتوں کے عیب
نکالتے تھے ان کو بُرا کہتے تھے جبکہ دیگر تراجم میں یہ ظاہر نہیں کیونکہ بتوں کو کچھ
کہنا یا اُن کا تذکرہ کرنا اُن کے عیب نکالنے اور ان کے برا کہنے کو مستلزم نہیں جبکہ
مقصود یہی ہے۔ اسی طرح یہ کلام ان میں سے بعض کی تھی جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام
کی کلام کو سنا ہوا تھا نہ کہ تمام کی۔

دوسرے دیکھو تراجم میں سے بعض نے مطلقاً یہ ذکر کیا تو وہ بولے۔ اس سے
یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ یہ کلام بعض کی تھی یا کہ تمام کی۔

یہ دونوں فرق جو بیان کئے گئے ہیں ان پر تفاسیر کو دیکھیں:۔ قالوا ای بعض
منہم وہ الذین سمعوا قولہ علیہ السلام۔ (روح المعانی)
یعنی ان میں سے بعض نے کہا جنھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سنا تھا

کہ آپ سے ایسا سلوک کریں گے جو ان کے سامنے آیا۔ سمعنا فتی یدکرہم
 یعیبہم فلعل الذی فعل ذلک بہم۔ (روح المعانی) ہم نے ایک جوان کو ان
 کے عیب نکالتے سنا، شاید اسی نے ان سے یہ کام کیا ہوگا۔ قالوا ای بعضہم
 لبعض سمعنا فتی یدکرہم ای یعیبہم یقال لہ ابراہیم (جلالین)
 بعض نے بعض کو کہا ہم نے ایک جوان کو انہیں برا کہتے سنا جسے ابراہیم کہتے ہیں۔
 اب واضح ہو کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ واضح ہے کہ کلام بعض کی تھی اور
 ابراہیم علیہ السلام بتوں کی برائی بیان کیا کرتے تھے۔

قَالَ بَلْ فَعَلْتَ كَيْزُهُمْ هَذَا اِبْنُ ۱۰

• یوں نہیں، پر یہ کیا ان کے اس بڑے نے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

• یوں نہیں، پر یہ کیا ان کے اس بڑے نے (محمود الحسن)۔

• انھوں نے فرمایا کہ نہیں بلکہ اس بڑے نے کی (مولانا اشرف علی)۔

• اس نے جواب دیا بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے۔ (موقدوی)۔

• کہا بلکہ کیا ہے او سوکو بڑے ان کے نے یہ (شاہ رفیع الدین)۔

• فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے کیا ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بتوں کو توڑ دیا، کلہاڑا سب سے ٹٹے

بت کے کندھے پر رکھ دیا جب وہ لوگ واپس آئے تو آپ سے پوچھنے لگے کہ

یہ کام تم نے کیا ہے؟ تو آپ نے یہ جواب دیا۔

اب بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر آپ نے اس بڑے بت کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس بڑے نے یہ کام کیا ہے تو جھوٹ لازم آتا ہے جبکہ

اس بت میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ دوسرے بتوں کو توڑ سکتا۔ تو آپ نے

یہ کیسے فرمایا؟ اس کے جواب میں مفسرین کرام نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے: : یکنون حکایۃ لعمایلزم علی مذہبہم

كان قال لهم ما تنكرون ان يفعلكم كبيرهم فان من حق من يعبد ويدعي
الهما ان يقدر على هذا واشد منه (كبیر) ان کے مذہب کے مطابق ہو لازم آتا
ہے اس کی حکایت ہے، گویا کہ انھیں آپ نے فرمایا، تم تو ان کے بڑے کے فعل کا
انکار نہیں کر سکتے کیونکہ جس کو معبود سمجھتے ہو اور اس کے خدا ہونے کے دعویدار
ہو اس کو یہ کام کرنے کی قدرت ہونی چاہیے بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ کام کرنے کا
حق دار ہونا چاہیے۔

اسی توجیہ کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے کہ یہ کام ان کے اس بڑے نے
کیا ہو گا جس کو تم خدا سمجھ کر عبادت کرتے ہو۔ تمہارے خیال میں تو یہ کام اس نے
ضرور ہی کیا ہو گا۔ آپ کا یہ ترجمہ اس وہم کو بھی زائل کر رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے یہ کیسے کہا۔ کذب کی نسبت آپ پر لازم آتی ہے۔

دوسرا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کو تمہا سمجھا بھی دیا کہ جس کو تم بڑا معبود سمجھ رہے
ہو وہ اپنے دوسرے بتوں کو نہیں چاسکا تو معبود بننے کے لائق کیسے ہو سکتا ہے۔
عام آدمی اس وجہ کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ اور بھی کئی توجیہات ہیں
لیکن یہ زیادہ معتبر اور مفید ہے۔

لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هُوَ بِأَنْ يَنْطِقُونَ (پ ۱۰۰)

• تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں (مولانا محمود الحسن)، (شاہ عبدالعادم)۔

• کہ تمہیں خوب معلوم ہے یہ بولتے نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت نے مانا فہم کے مطابق ترجمہ کیا ہے کہ "یہ بولتے نہیں"۔ اس پر تفسیر

کی تائید موجود ہے۔ مدارک میں ہے: والمعنى لقد علمت عجزهم عن النطق

فكيف نسألهم۔ معنی یہ ہے کہ آپ تو یقیناً جانتے ہیں کہ یہ بت بولنے سے عاجز

ہیں (یہ بولتے نہیں) ان سے ہم کیسے سوال کریں۔ ابوالسعود میں ہے: وامثلة

لقد علمت ان ليس من شأنهم النطق فكيف تاملنا بسؤالهم

بخدا آپ تو خوب جانتے ہیں، یہ بولتے نہیں، آپ ہمیں ان سے سوال کرنے کا کیسے حکم دے رہے ہیں۔

اِنَّ لَكُمْ وَلِيًّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِيَّاكُمْ

- بیزار ہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے (محمود الحسن)۔
 - تف ہے تم پر اور جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، ان پر بھی (فتح محمد)۔
 - بیزار ہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا (شاہ عبدالقادر)۔
 - تف ہے تم پر اور ان بتوں پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو (اشرف علی)۔
 - تف ہے تم پر بھی اور ان پر بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو (عبدالماجد)۔
 - تف ہے تم پر اور ان بتوں پر جن کو اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام ہے جو انھوں نے اپنی قوم سے کی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں واضح ہے کہ اس سے مراد وہ قوم اور ان کے سبب دیت مراد ہیں نہ کہ مطلقاً وہ جن کی وہ لوگ جہالت کرتے تھے کیونکہ آپ کی قوم کے لوگ چاند، سورج اور ستاروں کو پوجتے والے بھی تھے لکن یہاں چاند، سورج اور ستارے مراد نہیں ہیں بلکہ بت مراد ہیں۔ اسی پر تفسیر جلالین کی عبارت دال ہے: اِنَّ هٰذِهِ الْاَصْنَامُ لَا تَسْتَحِقُّ الْعِبَادَةَ وَلَا تَصْلِحُ لَهَا وَاِنَّمَا يَسْتَقْبِلُهَا اللّٰهُ تَعَالٰی۔ یعنی یہاں بت مراد ہیں۔ یہ مستحق عبادت نہیں اور نہ ہی ان میں صلاحیت ہے کہ ان کی عبادت کی جائے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے۔
- اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جتنی وضاحت ہے اور مقصد کے مطابق ہے اس کی مثلاً نہیں ملتی۔ یہ ہی اس ترجمہ میں خوبی ہے کہ تفسیر کے مطابق ہے اور مقصد کو سمجھانے میں اس کا ایک منفرد مقام ہے۔

مؤیسنہ اشرف علی صاحب کا ترجمہ یہاں درست ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (پہلے)

- اور جب تجھ کو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہان کے لوگوں پر (محمود الحسن)۔
- اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہان کے لوگوں پر (عبد القادر)۔
- آپ کو اور کسی کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگ (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لیے۔ (مولانا اشرف علی)۔
- اے محمد! ہم نے جو تجھے بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔ (مودودی)۔

• اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سائے جہان کے لیے۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں وسعت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہان کے لیے رحمت ہیں آپ نے اپنے ترجمہ میں لوگوں کے لیے رحمت کی قید نہیں لگائی لیکن دوسرے مترجمین نے جہان کے لوگوں یا دنیا جہان کے لوگوں کی قید سے نبی کریم کی رحمت کا دائرہ تنگ کیا ہے اور مولانا مودودی نے تو نبی کریم کی رحمت کو ہی تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم کو بھیجا دنیا والے لوگوں پر رب کی رحمت ہے یعنی آپ خود رحمت نہیں نبی کریم کی رحمت کا دنیا والے لوگوں پر انحصار یا آپ کی رحمت ہی تسلیم نہ کرنا کسی طرح بھیجی درست نہیں نبی کریم کا رحمت ہوتا اور آپ کی رحمت کی وسعت تفاسیر سے ثابت ہے جمل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

الارحمة يجوز ان يكون مفعول لاله اى لاجل الرحمة وان ينتصب على الحال مبالغة في ان جعله نفس الرحمة واما على حذف مضاف اى اذ رحمة او بضمه فى راحم وفى الحديث يا ايها الناس انما انا رحمة مهداة - يعنى رحمت پر نصب کی وجہ یا مفعول نہ ہونے کی وجہ سے یہ مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے کیونکہ آپ کا سارے جہان والوں کے لیے رحمت ہوتا اس ارسال کی علت اور وجہ ہے۔ یا نصب لوجہ

حالیۃ کے ہے۔ مقصد یہ ہوا کہ ہم نے آپ کو بھیجا اور اتنا لیکہ آپ سارے جہان کے لیے رحمت ہیں۔ رحمت مصدر ہے حال بنا بظاہر درست نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہاں مبالغہ ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ آپ اتنا رحم فرماتے والے ہیں گویا عین رحمت ہیں اس طرح اور اس کے نصب کی وجہ یہ ہے کہ حذف مضاف ہے یعنی دار رحمت۔ مفہوم یہ ہوگا کہ آپ صاحب رحمت ہیں۔ یا پھر رحمت مصدر مبنی للفاعل ہے۔ راحم کے معنی ہیں کہ آپ رحم فرماتے والے ہیں کیونکہ نبی کریم خود فرماتے ہیں کہ میں رحم کرنے والا، ہدایت دینے والا ہوں۔

اس تقریر سے اتنا واضح ہو گیا کہ رحمت سے مراد نبی کریم ہی ہیں۔ مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ حقیقت حال سے کوسوں دور ہے۔ اگرچہ نبی کریم کو بھیجا بلاشبہ رب تعالیٰ کی رحمت ہے لیکن اس آیت کریمہ کا معنی اس طرح کرنا جس میں آپ کو بھیجا رب کی رحمت ہے، سمجھ آئے۔ یہ ترجمہ نہ تو عربی عبارات کا گرامر کی رو سے درست ہے اور نہ ہی مقصد بیان کے مطابق ہے۔ نبی کریم کی رحمت عامہ کو علامہ آلوسی رحمۃ اللہ روح المعانی میں اس طرح بیان فرماتے ہیں: المراد بالعالمین جمیع الخلق فان العالم ما سوی اللہ تعالیٰ وصفاتہ جل شانہ وجمع جمع العقلاء تبلیغاً لا شراف علی غیرہ۔ وكونہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمة للجمیع باعتبار انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام واسطۃ فیض الالہی علی الممکنات علی حسب القوابل لذلک ان نوحاً علیہ السلام الخلق فی الخیر اول ما خلق اللہ تعالیٰ نوحاً نبیاً یا جابراً۔ وجاملہ المعطى واما القاسم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے لیے رحمت ہیں کیونکہ عالمین سے مراد تمام مخلوق ہے اس لیے کہ عالم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بغیر تمام کائنات پر مشتمل ہے۔ (اگرچہ عالم کا اطلاق ذوی العقول غیر ذوی العقول تمام کو شامل ہے لیکن جمع و اوائل اور یار مانوں سے ذوالعقول کی ہوتی ہے تو عالمین کا اطلاق تمام کائنات پر کیسے؟) تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ذوی العقول کو شرافت کے پیش

نظر غیر ذوی الحقول پر غلبہ دیتے ہوئے اس طرح جمع بنائی گئی۔ نبی کریم تمام کائنات کے لیے رحمت ہیں اس لیے آپ اللہ تعالیٰ کے فیضانِ کرم اور کائنات کے درمیان واسطہ ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا نور اول المخلوقات سے ہے۔ اور حدیث پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم نے فرمایا :-

”اے جابر! اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے نور کو سب سے پہلے

پیدا کیا۔“

اور حدیث پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ :-

”اللہ تعالیٰ نعمتیں عطا فرماتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔“

اسی طرح اور یہ فرمایا: العالم جسد واحد النبوة ولا قيام للجسد بدون روح۔ تمام جہان ایک جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے بغیر روح کے جسم کا قیام ممکن نہیں۔“

اس کے بعد اور فرمایا: والذي اختره ان صلى الله عليه وسلم انما بعث رحمة لكل فرد فرد من العالمين ملائكتهم وانسهم وجنسهم ولا فرق بين المؤمن والكافر من الانس والجن في ذلك مختار مسلک یہ ہے کہ نبی کریم کو تمام کائنات کے ہر فرد کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ ملائکہ، انسانوں اور جنوں تمام کے لیے رحمت ہیں مومنوں اور کافروں کا کوئی امتیاز نہیں تمام مومنوں اور کافروں کے لیے رحمت ہیں خواہ وہ انسان ہوں یا جن۔

اب آپ خود توجیہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ کتنا حسین اور خوب تر کا مل ہے جس میں نبی محترم کی رحمت عامہ کا ذکر واضح طور پر تفاسیر کے مطابق موجود ہے۔ جب کہ دیگر ترجمین نے رحمت کا دائرہ تنگ کر کے یا اشارتاً انکار کر کے شانِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والتنازل کو چھپانے کی کوشش کی ہے لیکن جس شانِ رحیم کو مالک کائنات ظاہر فرمائے وہ کیسے چھپ سکتی ہے!

وَذَا النُّونِ إِذْ هَبَّ مُقَاضِبًا فَظَنَّ أَن لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ
فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَن لَّا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي
كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (پاچھ)

• اور مچھلی والے (پنچیر کا بھی ذکر کیجیے) جبکہ وہ خفا ہو کر چلے گئے اور یہ سمجھے کہ ہم ان پر تنگی نہ کریں گے۔ پھر انھوں نے اندھیروں میں سے پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو ہی سب نقائص سے پاک ہے۔ بیشک میں ہی قصور وار ہوں۔
(عبدالماجد دریا آبادی)

• اور ذوالنون کو یاد کرو جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے کی حالت میں چل دیے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پاسکیں گے۔ آخر اندھیرے میں خدا کو پکارنے لگے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک میں قصور وار ہوں (فتح محمد)
• اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا یاد کرو جب وہ بگڑ کر چلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ آخر کوس نے تار بکھوں میں پکارا، نہیں ہے کوئی خدا مگر تو پاک ہے تیری ذات۔ بیشک میں نے قصور کیا (مودودی)
• پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اس کو، پھر پکارا ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے (محمود الحسن)۔
• اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصے سے لڑ کر پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے پھر پکارا ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

• اور ذوالنون کو یاد کرو جب چلا غصے میں بھرا تو گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے تو اندھیروں میں پکارا کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاکی ہے مجھ کو بے شک مجھ سے بے جا ہوا (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے فظن ان لن نقدر علیہ کا ترجمہ کیلئے تو گمان کیا ہم اس پر تنگی نہ کریں گے۔ دوسرے مذکورہ تراجم میں ہے سوائے عبدالمجاہد کے سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے گرفت نہ کریں گے۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اس طرح آیا ہے انی کنت من الظلمین بے شک مجھ سے لے جا ہوا اور باقی مذکورہ تراجم میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے میں گنہ گاروں سے تھا میں نے قصور کیا۔ تراجم میں پہلا فرق جو بیان کیا ہے اس پر توجہ فرمائیں کہ یہ کہنا سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے یا یہ کہنا سمجھا ہم پکڑنے کی قدرت نہیں رکھتے یا یہ کہا جائے کہ سمجھا ہم پکڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اردو محاورہ میں تمام الفاظ کا ایک ہی مطلب لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسی مطلب کو علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں رد کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

و ثانیہ اقوالہ تعالیٰ فظن ان لن نقدر علیہ . و ذلك یقتضی کونہ شاکا فی قدسہ امتہ تعالیٰ . جن حضرات نے انبیائے کرام سے گناہ سمرزد ہوتا جائز قرار دیا ہے ان کی یہ دوسری دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد و کرامی فظن ان لن نقدر علیہ - تقاضا کرتا ہے کہ یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرتا ہے ہوں (جو شک کرنا ہوتا ہے وہ گنہ گار ہوتا ہے) اس دلیل کو آپ نے اس طرح رد فرمایا: والجواب عن التشبہ الثانیہ وهو التمسک بقولہ تعالیٰ فظن ان لن نقدر علیہ ان نقول من ظن عجزا لئلا تعالیٰ فهو کافر ولا ینحرف انہ لا یجوز نسبت ذلک الی احاد المؤمنین فکیف الی الانبیاء علیہم السلام فاذن لا بد فیہ من التاویل و فیہ وجہ احدہا فظن ان لن نقدر علیہ لن تضیق علیہ وهو کقولہ تعالیٰ لئلا یبسط الریح لمن یشاء من عبادہ ویقدر علیہ ای یضیق و من قدر علیہ ریحہ ای ضیق و اما اذا ما بتلاہ فقد ر علیہ ہزقہ ای ضیق و معنہ ان لن تضیق علیہ و اعلم ان هذا التاویل تفسیر الایتر حجت لنا و ذلك لان یونس علیہ السلام ظن انہ منخیر

ان اشار اقام وان شاعر حوانه تعالیٰ لایضیق علیہ فی اختیار -
 معترضین کی دلیل کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں لن تقدس علیہ کا معنی
 لن تضیق علیہ ہے تو اب یہ معنی ہوا کہ انھوں نے گمان کیا کہ ہم ان پر تنگی نہ
 کریں گے۔ آپ نے اس معنی پر قرآن پاک کی تین آیات سے استدلال پکڑا ہے کہ قدر
 کا معنی تنگی قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے۔ امثله یبسط للفرق لمن یشاء ویقدس۔

ومن قدس علیہ وساقہ۔ اور واما اذا ما ابتلاه فقدن علیہ وساقہ
 ان تمام آیات میں قدر کا معنی تنگی کرتا ہے لہذا یہاں بھی اس کا معنی تنگی کرنا
 ہی ہے۔ پھر آپ نے یہ فرمایا کہ یہ تاویل ہمارے لیے دلیل ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام
 نے یہ خیال کیا کہ اب کو اختیار ہے اگر چاہیں مقیم رہیں اور چاہیں تو اس قوم کو چھوڑ
 کر چلے جائیں اور اللہ تعالیٰ آپ کے اس اختیار میں تنگی نہیں فرمائے گا اسی طرح
 مدارک میں بھی آتا ہے: فظن ان لن نقدر تضیق علیہ وعن ابن عباس
 انه داخل علی معلویۃ فقال لقد ضربتني امواج القرآن البارحة فضرقت
 فیہا فلم اجد لنفسی خلاصا الا بک قال وما ہی یا معاویۃ ففی الایۃ
 وقال او یظن نبی امثله ان لایقدس علیہ قال هذا من القدس لا من
 القدسۃ - یعنی اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں
 کریں گے۔

حضرت ابن عباس سے مڑی ہے کہ وہ ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ کے پاس
 گئے۔ انھوں نے کہا کہ میں گذشتہ رات سے قرآن پاک کی موجوں میں غرق ہوا آپ
 کے بغیر ان سے نجات ممکن نہیں۔ آپ نے کہا کہ اے معاویہ اوہ کیلئے ہے، انھوں
 نے یہی آیت مبارکہ پڑھی اور کہا کہ کیا اللہ کا نبی بھی گمان کر سکتا ہے کہ اللہ قدرت
 نہیں رکھتا تو آپ نے کہا ان لن نقدر قدر سے مشتق ہے نہ کہ قدرت سے۔ مطلب
 یہ ہے کہ اس کا معنی تنگی ہے نہ کہ طاقت۔ لہذا معنی یہ نہیں کہ ہم پکڑ نہیں سکیں گے بلکہ
 معنی یہ ہے کہ ہم تنگی نہیں کریں گے۔

اب دوسرا فرق دیکھیں: انی کنت من الظالمین کا ترجمہ "بیشک مجھ سے بے جا ہوا" دوسرے تراجم میں ہیں تھا گنہگاروں سے، میں نے قصور کیا، میں قصور وار ہوں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید تفسیر کبیر سے ملتی ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں: انی کنت من الظالمین فهو واجب التاویل لانا لواجبنا ہا علی ظاہرہا لوجب القول بكون النبي مستقلا للظلم وهذا لا يقول مسلم واذا وجب التاویل فنقول لا شك انه كان تاركا للافضل مع القداسة علی تحصیل الافضل فكان ذلك ظلما۔ یعنی اس آیت میں تاویل ضروری ہے کیونکہ اگر ظاہر پر رکھا جائے البتہ نبی کا مستحق لعنت ہونا (العیاذ باللہ) لازم آئے گا کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام کا اگر قول یہ ہو کہ میں ظالم (گنہگار) تھا تو ظالم لعنت کا مستحق ہے اس لیے کہ قرآن پاک میں ہے فلعنتنا مثله علی الظالمین۔ ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، حالانکہ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کا نبی ظالم (گنہگار) اور لعنت کا مستحق ہے۔ اس لیے تاویل ضروری ہے۔ لہذا ہم بلاشک یہ کہتے ہیں کہ آپ نے افضل کو چھوڑا یعنی وہاں رہنے کو باوجود اس کے کہ آپ افضل کے حاصل کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ یعنی آپ وہاں سے چلے گئے۔ یہ جانا ترک افضل تھا اسی کو ظلم سے تعبیر کیا ہے معنی یہ ہوا کہ میں نے افضل کو چھوڑا اس لیے مجھ سے بے جا ہوا۔ یہ مراد نہیں کہ مجھ سے گنہ ہوا، ظلم ہوا، میں تھا گنہگاروں سے۔ یہ معنی نبی کی شان کے لائق نہیں۔ اسی لیے علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے رد کیا اور تاویل کر کے اس کا صحیح استعمال بتایا اور اعلیٰ حضرت نے بھی اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے ایسا ترجمہ فرمایا جو بلاغیاریہ ہے جس پر اعتراض کی گردش ممکن نہیں۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ بِاصْوَابٍ (پ ۱۱)

- پس انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو۔ (مودودی)۔
- پس یاد کرو نام اللہ کا اوپر اس کے پاؤں باندھے ہوئے (شاہ رفیع الدین)

- سو پڑھوان پر نام اللہ کا قطار باندھ کر (شاہ عبد القادر)۔
 - سو تم ان پر کھڑے کر کے اللہ کا نام لیا کرو (مولانا اشرف علی)۔
 - سو تم انھیں کھڑا کر کے اللہ کا نام لیا کرو (عبد الماجد دریا آبادی)۔
 - تو اقرباتی کرتے وقت قطار باندھ کر ان پر خدا کا نام لو (فتح محمد)۔
 - تو ان پر اللہ کا نام لو ایک پاؤں بندھے تین پاؤں کھڑے۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- قرباتی کے جانوروں کا ذکر سوا ہے کہ وہ قربانی کے جانور یعنی اونٹ اور گائے اللہ کی نشانیوں سے ہیں۔ اس کے بعد اونٹوں کے ذبح کرنے کا طریقہ بیان فرمایا کہ ان کو مسنون طریقہ سے ذبح کیا جائے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ وہ اونٹ ایک پاؤں سے بندھے ہوں اور تین پاؤں سے کھڑے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مطلب بہت واضح ہے جبکہ دیگر تراجم میں یہ مقصد ظاہر نہیں۔ تفاسیر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تا تید کر رہی ہیں۔ جلالین میں ہے:

فاذکر و اسم اللہ علیہا عند نحرها صواف قائمت علی ثلاث معقولة البیدالیسی یعنی ذبح کے وقت ان پر اللہ کا نام ایسے حال میں لیا جائے جب وہ تین پاؤں پر کھڑے ہوں اور ان کا اگلا پایاں پاؤں بندھا ہوا ہو۔ فاذکر و اسم اللہ علیہا بان تقولوا عند ذبحها بسم اللہ و اسم اللہ اکبر اللہم منك و لك۔ صواف ای قائمات قد ضعفن ایدیہن وارجلہن لان البدنة عند الذبح تعقل احدی یديہا فتقوم علی ثلاث و عقلها عند الفرسنة عن ابن سابط رضي اللہ عنہ عن ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ كانوا یعقلون ید البدنة اليسری وینحرونها قائمت علی ما

بقی من قوائمها۔ (المختصر من روح المعانی) یعنی ان کو ذبح کے وقت

کہے: بسم اللہ و اسم اللہ اکبر اللہم منك و لك اس طرح کہ تین پاؤں کھڑے ہوں کیونکہ اونٹ کے ذبح میں مسنون یہی ہے کہ اس کا اگلا پایاں پاؤں باندھا جائے اور تین پاؤں پر وہ کھڑا ہو۔ کیونکہ حضرت ابن سابط رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

نبی کریم اور آپ کے صحابہ کرام اونٹ کو ذبح کے وقت اس کا اگلا پایا پاؤں بانڈھ دیتے تھے اور ذبح کرتے جبکہ وہ تین پاؤں پر کھڑا رہتا۔

وَلَوْلَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهَيَّمَتْ صَوَامِعُ
وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدٌ يُذَكِّرُ فِيهَا اسْمَ اللَّهِ كَثِيرًا (پج)

- اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے تو ڈھلے جاتے تھکے اور مدر کے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت (شاہد عقاد)۔
 - اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھلے جاتے تھکے اور مدر کے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت (محمود الحسن)۔
 - اور اگر اللہ آدمیوں میں ایک دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور ڈھاکا جاتیں خانقاہیں اور گرجا اور کلیے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے۔
- (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے مطابق دیکھیں کیسے مقصد کو واضح کر رہے ہیں جب کہ دیگر مذکورہ تراجم اس سے خالی ہیں اور وہ کہاں تک درست ہیں؟ تفاسیر کی عبارات کو دیکھنے سے واضح ہو جائے گا۔ مدارک میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: ولولا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ صَوَامِعُ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدٌ يُذَكِّرُ فِيهَا اسْمَ اللَّهِ كَثِيرًا (پج)۔

ای کنائس سمیت الكنيسة لانه يصلي فيه ولا للمسلمين مساجدہم یعنی اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے منفع نہ فرمایا تو نصاریٰ کے گرجے نہ رہتے اور ان کے پادریوں کی خانقاہیں نہ رہیں اور یہود کے کلیے نہ رہتے۔

کلیسا کو مجازاً صلوة سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ محل صلوة ہے۔ اور نہ مسلمانوں کی مسجدیں رہیں۔ جلالین میں ہے: صوامع للمساہبان وبيع کنائس۔

لأن نصارى وصلوات کنائس لليهود بالعبرانية ومعهد للمسلمين۔

یعنی صوامح سے مراد نصاریٰ کے پادریوں کی خانقاہیں ہیں اور بیح سے مراد نصاریٰ کے گرجے اور صلوات سے مراد یہود کے کلیے اور مساجد سے مراد مسلمانوں کی مسجدیں۔
 رُوح المعانی میں جو ذکر کیا گیا ہے وہ مختصر یہ ہے: وَالْبَيْعُ وَاحِدٌ
 بَيْعَةٌ بِيَوْمَانِ فَعَلَتْ وَهِيَ مَصْلَى النَّصَارَى وَلَا تَخْتَصِرُ
 بَرَحَ بَانِهِمْ كَالصُّومِ مَعْتَمِرَاتٍ جَمْعُ صَلَاةٍ وَهِيَ كَنِيْفَتُ الْيَهُودِ -
 یعنی بیح کا واحد بیعۃ بوزن فعلتہ یہ عیسائیوں کا گرجا ہے۔ یہ عبادت
 خانہ ان کے پادریوں سے خاص نہیں جس طرح صومعتہ (صوامح کا واحد)۔ ان
 کی پادریوں کی عبادت گاہ سے خاص ہے۔ اور صلوات، صلوة کی جمع سے اور یہ
 یہودیوں کا کلیسا ہے۔ اسی طرح کی عبارات کبیر، ابوالسعود، الخطیبؒ بھی ہیں۔
 اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے اور آیت کریمہ میں جو مقصد معتبر ہے
 اس کا صحیح ترجمان ہے۔

لَا تَجْرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ قِتَالًا تَنْصُرُونَ (پہلے)

- مت چلاؤ آج کے دن تم ہم سے پھڑائے نہ جاؤ گے (شاہ عبدالقادر)۔
 - مت چلاؤ، آج کے دن تم ہم سے پھوٹ نہ کر سکو گے (محمود الحسن)۔
 - آج فریاد نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہاری مدد نہ ہوگی (اعلیٰ حضرت)۔
- اس مقام پر لائنوں کا ترجمہ کیا گیا ہے "تم پھڑائے نہ جاؤ گے"۔
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں آیا ہے تمہاری مدد نہ ہوگی۔ لغوی معنی یہ ہی ہے۔ مولانا
 اشرف علی صاحب نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ امداد کے نہ ہونے سے عذاب
 سے نہ پھڑایا جاتا ہے۔ یا من کو لا تنصرون کا صلہ مانا جائے تو معنی ہوگا:
 تمہیں عذاب سے روکا نہیں جائے گا۔ لیکن معترضین تو با محاورہ ترجمہ
 کے قائل ہی نہیں تو یہاں با محاورہ ترجمہ یا مجازی طور پر ترجمہ کیوں کیا گیا ہے؟ کیونکہ
 اعلیٰ حضرت نے ظلم کا معنی بے جا کیا تو معترضین یہ کیا گئے لفظ کی لغوی اور اصطلاحی

حقیقت کا علم یہاں کون سا لغوی معنی یا اصطلاحی معنی کیا گیا ہے۔
 تفسیر مدارک میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید موجود ہے۔ ذکر ہے: انکم منا
 لا تنصرون ای من جہنم لا یلحقکم نصرہ معونۃ یعنی ہماری طرف سے
 تمہاری مدد نہ ہوگی۔ روح المعانی میں ہے: لا یلحقکم منا نصرۃ تنجیککم
 مما انتم فیہ۔ یعنی جس عذاب میں تم ہو اس سے نجات حاصل کرنے کے
 لیے ہماری طرف سے تمہاری مدد نہیں ہوگی۔

سُتْکِرِیْنَ بِسَمِیْرًا تَهْجُرُونَ دِیْمًا

• تکبر کرتے ہوئے ساتھ اس کے افسانہ کوئی کرتے ہوئے بے ہودہ بکتے
 تھے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

• اپنے گھمنڈ میں اس کو خاطر ہی میں نہ لاتے اپنی چوپایوں میں اس پر باتیں پھیلاتے
 اور بکواس کیا کرتے تھے۔ (مودودی)

• اس سے بڑائی کر کر ایک کہانی والے کو چھوڑ کر چلے گئے (شاہ عبدالقادر)

• اس سے تکبر کر کے ایک قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے (محمود الحسن)۔

• تکبر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے بیہودہ بکتے ہوئے (عبدالمنان)

• ان سے سرکشی کرتے کہانیوں میں مشغول ہوتے اور بیہودہ بکواس کرتے

تھے (فتح محمد)۔

• خدمتِ حرم پر بڑائی مانتے ہوئے رات کو وہاں بے ہودہ کہانیاں بکتے تھے

کو چھوڑے ہوئے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

مضمون یہ بیان کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے کفار کے

امیروں کو عذاب میں پکڑا یعنی وہ مسلمانوں سے شکست کھانے لگے، ان کی تلواروں کے

عذاب میں آئے یا قحط سالی میں مبتلا ہوئے تو وہ فریاد کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے

ان کی فریاد پر فرمایا، آج تم فریاد نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہاری کوئی امداد نہ ہوگی۔

کیونکہ جب میری آیات تم پر تلاوت کی جائیں تم ان سے روگردانی کر جانتے تھے اور
 خدمتِ حرم کی وجہ سے تم اپنی بڑائی مانتے اور تکبر کرتے تھے اور رات کو یہودہ باتیں
 کرتے کبھی قرآن کو جادو کہتے، کبھی شعر کہتے اور نبی کریم کی شان میں گستاخانہ کلام
 کرتے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور قرآن پاک کو چھوڑتے تھے سیر میں اسی
 طرح بیان کیا گیا ہے اور اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے بھی یہ واضح ہے :-

متكبرين به اى بالبيت الحرام لانهم يستكبرون ويفترون
 بانهم خدام البيت وقوام وهذا ما عليه جمهور الفسرين سمرًا
 اى تمسرون بذكر القرآن والطعن فيه وذلك انهم كانوا يجتمعون
 حول البيت بالليل يمسرون وكانت عامة سمرهم ذكر القرآن
 وتسمية سحرًا وشعرًا - (هذا ما حصل من روح المعاني)

یعنی متکبرین یہ سے مراد یہ ہے کہ وہ خدمتِ حرم کی وجہ سے تکبر کرتے
 تھے، اپنی بڑائی بیان کرتے اور فخر کرتے تھے کہ ہم بیت اللہ شریف کے خادم اور
 اس کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ جمہور مفسرین کرام کے نزدیک یہی معنی ہے۔
 سمر کا معنی یہ ہے کہ وہ رات کو بے ہودہ کہانیاں کہتے، قرآن پاک کا
 تذکرہ کرتے اور اس میں طعن کرتے۔ بیت اللہ شریف کے اردگرد رات کو جمع
 ہوتے اور یہودہ باتوں اور کہانیوں میں قرآن پاک کو جادو اور شعر کہتے۔
 تہجرون پھر سے لیا ہوا ہے جس کا معنی قطع کرنا اور ترک کرنا ہے یعنی وہ اللہ
 تعالیٰ یا نبی کریم یا قرآن پاک کو چھوڑنے والے ہوئے۔ جلالین میں ہے :-

متكبرين عن الايمان به اى بالبيت او الحرام بانهم اهل في امن
 بخلاف سائر الناس في مواضعهم سمرًا حل اى جماعة يتحدون
 بالليل حول البيت (يقدرون حول البيت بالطعن في القرآن) تہجرون
 من اثنائى تتكون القرآن ومن الوباى اى تقولون غير الحق في السنن
 والسران - یعنی وہ ایمان لانے سے تکبر کرتے تھے بیت اللہ شریف یا

حرم کی وجہ سے کیونکہ حرم والے بہ نسبت دوسرے لوگوں کے امن میں رہتے۔ رات کو بیت اللہ شریف کے گرد بیٹودہ کہانیاں بکتے۔ قرآن پاک میں عیب نکالتے۔ تہجرون اگر ثلاثی سے ہو یعنی ہجر سے مشتق ہے تو معنی یہ ہے کہ قرآن پاک کو چھوڑتے اور اگر رباعی سے ہو یعنی بابِ افعال سے (رباعی کا مصطلح معنی نہیں) ہو تو معنی یہ ہوگا کہ نبی کریم اور قرآن پاک کی شان میں ناحق کہتے۔

تفسیر کے بیان کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت رُزروشن کی طرح ہو گی۔ زیادہ تبصرہ کی محتاج نہیں۔ نیز مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ حقیقت سے دور، تہجرون کا ترجمہ کیا ہی نہیں۔ باقی ترجمہ بھی ذہنی اختراعات پر مبنی ہے۔

بَلْ آتَيْنَاهُمْ بِلَاغًا مِّنْ لَّدُنَّا أَن كَذَّبُوا بِلَاغِنَا الَّذِي هُوَ لَدُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ مُّشْتَقٍ ۖ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ (پہلے)

• نہیں بلکہ ہم نے ان کا اپنا ہی ذکر انکے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے مٹھ مٹھ رہے ہیں۔ (مودودی)

• کوئی نہیں پہنچاتی ہم نے انکو ان کی نصیحت۔ سو وہ اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے۔ (محمود الحسن)

• بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کی نصیحت کی بات بھیجی۔ سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)

• کوئی نہیں ہم نے پہنچاتی ہے انکو ان کی نصیحت۔ سو وہ اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے۔ (شاہ عبدالقادر)

• بلکہ ہم نے تو ان کے پاس ان کی نصیحت (ہی کی بات) بھیجی سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں (عبدالماجد)

• بلکہ ہم تو ان کے پاس وہ چیز لائے جس میں ان کی ناموری تھی تو وہ اپنی عزت سے ہی منہ پھیرے ہوئے ہیں (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تاہد تفسیر روح المعانی سے ملتی ہے مقصد بیان یہ ہے

کہ ان کو قرآن پاک عطا فرمایا جس میں ان کی ناموری تھی۔ انھوں نے قرآن پاک سے منہ پھیرا جس پر ایمان لانے میں ان کی عزت تھی۔ تو قرآن پاک سے اعراض عزت سے اعراض ہوا۔ روح المعانی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: ای بل اتینہم بفضلہم و شرفہم الذی کان یحب علیہم ان یقبلوا علیہ کم من اقبال و یتوبوا ما فیہ کم من قبول فہم بما فعلوا من المنکوح عن ذکرہم ای فخرہم و شرفہم خاصۃ معرضون لاعن غیر ذلک مما لا یوجب اقبال علیہ ولا اعتناء بہ والمراج بالذکر القران الذی ہو فخرہم و شرفہم ینظر بقولہ تعالیٰ وانہ لذکرک و تقویٰ یعنی قرآن پاک میں تو ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہوا کہ بلکہ ہم نے ان کو عطا کیا وہ جس میں ان کے لئے شرافت و فخر تھا یعنی ان کی ناموری تھی۔ ان پر واجب تھا کہ وہ اس کی طرف کامل توجہ کرتے اور اس کے جمیع احکام و اجاد کو تسلیم کرتے لیکن انھوں نے الٹ کیا اور انھوں نے ذکر سے یعنی اپنے فخر و شرافت (عزت) سے اعراض کیا، منہ پھیرا۔ ان کا منہ پھیرنا اسی چیز سے تھا جس کی طرف ان کو توجہ کرنی ضروری تھی اور اہتمام شان ضروری تھا۔ یعنی ذکر سے مراد قرآن پاک ہے جو ان کے لیے باعث شرافت و فخر تھا ان کے پاس وہ چیز لائے جس میں ان کی ناموری تھی اس پر خود قرآن پاک شاہد ہے کہ بیشک یہ قرآن پاک آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ذکر ہے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی مقصد کو واضح کر رہا ہے اور آپ کی وقت نظر کی نشاندہی کر رہا ہے۔

وَلَا تَكْرِهُوْا فِتْيَانَكُمْ عَلَىٰ الْبِعَارِ اِنَّ اَرْدَنَ مَحْصَنًا دِيَارًا

• اور نہ زور کرو اپنی چھو کر یوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے رہنا۔

(شاہ عبدالقادر)

• اور نہ زبردستی کرو اپنی چھو کر یوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید

سے رہنا (محمود الحسن)۔

• اور مجبور نہ کرو اپنی کنیزوں کو بدکاری پر جب کہ وہ بچنا چاہیں (اعلیٰ حضرت) اعلیٰ حضرت نے فتیات کا ترجمہ کیا ہے "کنیزوں" اور دوسرے مترجمین نے ترجمہ کیا ہے "چھو کر یوں"۔ اسی طرح شخصاً کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیلئے "بچنا" اور دوسرے حضرات نے ترجمہ کیا "قید سے رہنا"۔

اس آیتِ کریمہ کے شانِ نزول سے فرق سمجھ آ جائیگا۔ شانِ نزول روح المعانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اخرج مسلم و ابو داود عن جابر بن عبد الله عن ابن جارية لعبد الله بن رسول يقال لها مسكة و اخرى يقال لها اميمة كان يكرههما على الزنا فشكنا ذلك الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فنزلت۔ مسلم شریف اور ابوداؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن رسول اپنی کنیز مسکتہ اور دوسری کنیز امیمہ کو زنا پر مجبور کرتا تو انھوں نے نبی کریم کی خدمت میں آکر شکایت کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

والفتيات جمع فتاة وكل من الفتى والفتاة كناية مشهورة عن العبد والامة مطلقا ان اردن تحصن ليس لتخصيص السنوي بصورة اسماء تمين التعفف عن الزنا۔ (روح المعانی) فتیات جمع فتاة کی ہے۔ فتی یا فتاة سے مراد کنایہٴ غلام اور کنیز ہیں۔ ان اردنا تھمتنا سے یہ وہم نہ پڑے کہ شاید ان عورتوں کو مجبور نہ کیا جائے جو بچنا چاہیں بلکہ کسی کو بھی مجبور نہ کیا جائے۔ مقصد بیان یہی ہے کہ کنیزوں پر جبر نہ کرو جب وہ بچنا چاہیں۔ چھو کر یا قید سے رہنا یہ مقصد کو واضح نہیں کرتے جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کو واضح کر رہا ہے۔

وَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مَا عَمِلُوا مِن عَمَلٍ فَجَعَلْنَا مَهَابًا مِّنْهُمْ اذِ ابْتِغَاءِ

• اور آئے ہم طرف اوس چیز کے کہ کیا تھا انھوں نے سب کاموں سے پس

کیا ہم نے اس کو جیسے ذرے پر اگندہ - (شاہ رفیع الدین) -

• اور جو انہوں نے عمل کیے ہوں گے ان کی طرف متوجہ ہونگے تو ان کو اُڑتی خاک کر دیں گے - (فتح محمد) -

• اور ہم ان کے کاموں کی طرف متوجہ ہونگے جو یہ کر چکے ہیں سو ان کو ایسا ہی کر دیا گے جیسے پریشان غبار (عبدالماجد دریا آبادی)

• اور ہم پہنچے ان کے کاموں پر جو کئے تھے انہوں نے پھر ہم نے کر ڈالا اس کو خاک اُڑتی ہوئی (محمود الحسن) -

• اور ہم ان کے کاموں کی طرف جو وہ کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا ہی کر دیں گے جیسے پریشان غبار - (مولانا اشرف علی) -

• اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اُڑا دیں گے -

(مودودی)

• اور جو کچھ انہوں نے کام کئے تھے ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک

غبار کے پکھرے ہوئے ذرے کر دیا کہ روزن کی دھوپ میں نظر آتے ہیں (علیہ السلام)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے قدیمنا کا ترجمہ فرمایا ہے "ہم نے قصد فرمایا یہ

تفاسیر کے مطابق ہے وقد منا ای عمدنا و قصدنا کما وی عن ابن عباس

(روح المسانی) قدیمنا کا معنی ہم نے ارادہ کیا حضرت ابن عباس نے ایسا ہی فرمایا

ہے وقد منا ان القدوم لا یصح الا علی الاجسام لان القدوم حرکت والمراد

بالحرکت محدث و مثبت ان امثله عز وجل لا یجوز ان یکون محدثا

فوجب تاویل لفظ القدوم وهو من وجوه احدها وقد منا الی ما علوا من

عمل الی و قصدنا الی اعمالہم و اطلق المسبب علی السبب مجازا

(المختصر من الکسبیر) یعنی قدوم (آنا، پہنچنا، متوجہ ہونا) یہ

صرف اجسام پر پولا جاتا ہے کیونکہ قدوم حرکت ہے اور حرکت حادث میں پائی جاتی

ہے۔ اللہ تعالیٰ حادث ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے لفظ قدوم میں تاویل ضروری ہے۔

اور وہ تاویل کئی وجہ سے ہے۔ ایک یہ ہے کہ ہم نے قصد فرمایا یعنی قدماً بعضی قصداً ہے۔ یہاں مسبب کا اطلاق مجازاً سبب پر ہے۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہباء منتشراً کا واضح ہے۔ کیونکہ صرف خاک اڑانا، غبار کا پریشان ہونا صحیح ترجمانی نہیں و لخرج جماعة عن مجاهد والحسن وعكرمة وابي مالك وعامر انه شعاع الشمس في الكوة وكانهم ارادوا ما يرى فيه من غبار كما هو المشهور عند اللغويين قال الراغب هباء دقاق التراب وما انبت في الهواء فلا يبدو الا في اثناء ضوء الشمس في الكوة منتشراً مبالغتاً في الغناء اعمالهم فان الهباء تراه منتظماً مع الضيق فاذا حركت الريح تناثر وذهب كل مذهب فلم يكف ان شبا اعمالهم بالهباء حتى جعل متناثراً لا يمكن جمعه والانتفاع به اصلاً۔ (المختصر من روح المعاني)۔

ایک جماعت نے مجاہد حسن، عکرمہ، ابوماک اور عامر سے بیان کیا ہے کہ سورج کی شعائیں جو روزن (روشن دان) سے نظر آتی ہیں جن کو دیکھتے والا غبار کے ذرات سمجھتا ہے اسے ہباء کہتے ہیں۔ یہی اہل لغت کے نزدیک مشہور ہے۔
راغب نے کہا، ہباء مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات کو کہتے ہیں جو ہوا میں اٹھتے ہیں۔ وہ نظر فقط اس وقت آتے ہیں جب سورج کی روشنی روزن سے باہر آتی ہے۔
منتشراً کا مطلب ہے کہ ان کے اعمال کامل طور پر لغو اور بے کار ہیں کیونکہ غبار کے ذرات جب روشنی میں منتظم، مجتمع ہوں۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ ہر طرف بکھر جاتے ہیں۔

اسی طرح ان کے اعمال کی بھی ہباء سے اس وقت تشبیہ کامل ہوگی جب کہ ان کے اعمال بھی منتشر بکھرے ہوئے سمجھے جائیں گے کہ ان کا جمع ہونا ممکن نہیں اور ان کو ان کے اعمال کا کوئی نفع نہیں۔ تفاسیر کی ان عبارات کو دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کرنے کی

جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ نے قدیمنا کا معنی ”ہم نے قصد کیا“ بیان کیا ہے وہ ایک اعتراض کو مندرج کر رہا ہے اور سبباً منشوراً کا بھی آپ کا ترجمہ کامل اور واضح ہے۔ دوسرے تراجم کو دیکھ کر اہل انصاف خود ہی کوئی رائے قائم کر لیں: **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ**

اِذْ قَالَ لَهُمْ اٰخُوهُمْ نُوحٌ الْاَتَتْكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (پہلے)

• جب اُن سے ان کے بھائی نوح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں (فتح محمد)۔
• جس وقت کہ کہا واسطے ان کے بھائی نوح نے کیا نہیں ڈرتے تم۔
(شاہ رفیع الدین)

• جب کہا اُن کو ان کے بھائی نوح نے کیا تم کو ڈر نہیں (شاہ عبدالقادر)
" " " " " (محمود الحسن)۔

• جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟
(مودودی)

• جب کہ اُن سے اُن کے بھائی نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں (عبدالماجد)۔
• جبکہ ان سے ان کے ہم قوم نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت نے یہاں ”ہم قوم“ کا ترجمہ اُن کے ہم قوم کیا ہے جب کہ دوسرے حضرات نے ”ان کے بھائی“ کیا۔ صرف بھائی کہنے میں وہم ہے کیا حقیقی بھائی تھے یا دینی بھائی؟ **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اٰخُوَةٌ** کے مطابق یا کہ قومی بھائی تھے یا شان کے لحاظ سے بھائی کی طرح تھے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ حقیقت کو واضح کر رہا ہے کسی وہم کی اس میں گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان کے ہم قوم تھے۔ اسی وجہ سے جلالین میں ذکر ہے **اٰخُوهُمْ** نسبتاً بین السطوریں صاوی کے حوالہ سے **ای ذوق اندین** یعنی اُن کے ہم قوم نے کہا۔ یہاں دینی بھائی مراد نہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے: **اٰخُوهُمْ** نسبتاً **لَانَّهُمْ كَانُوا مِنْهُمْ** من قول العرب

یا الخابنی تمیم یریدون واحدا منهم۔ یعنی اُن کے نسبی بھائی
ہم قوم مراد ہیں کیونکہ وہ ان سے سے ایک تھے جس طرح اہل عرب کہتے ہیں :
یا الخابنی تمیم۔ اور مراد اس سے ان میں سے ایک فرد ہوتا ہے۔ اسی طرح
یہاں بھی ہے۔ مدارک میں بھی ہے : اذ قال لهم انھم نسبالا دیننا
جب کہ اُن کو ہم قوم نے کہا نہ کہ دینی بھائی نے۔

وَتَجِثُّونَ مِنَ الْجِبَالِ بِيُوتًا فَارِهِينَ (پ ۱۹ ع ۸)

• اور تراش لیتے ہو تم پہاڑوں سے گھر یا تکلف۔ (شاہ رفیع الدین)
• اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے ہوئے مکان بناتے ہو۔ (عبدالماجد)
• اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو (فتح محمد)۔
• اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف کے (مولانا محمود الحسن)۔
• اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف سے (شاہ عبدالقادر)۔
• اور کیا تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے ہوئے مکانات بناتے ہو (اشرف علی)
• تم پہاڑ کھود کھود فخر یہ انداز میں عمارتیں بناتے ہو۔ (مودودی)۔
• اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو اُستادی سے۔ (اعلیٰ حضرت)
• قوم نمود کا ذکر ہے۔ اعلیٰ حضرت نے فارہین کا معنی کیا اُستادی سے اس
کی تائید میں تفاسیر کی عبارت ذکر کی جا رہی ہیں۔ مدارک میں ہے : فارہین

شامی و کوفی حاذقین حال غیر ہم فرہینت اشیرین والفرہینت
الکسیر والنشاط۔ شامی اور کوفی حضرات نے فارہین (الف کے سا)
پڑھا ہے جس کا معنی ماہر ہونا، استاد ہونا۔ یہ حال واقع ہے۔ شامیوں اور کوفیوں
کے غیروں نے فرہین (بغیر الف کے) پڑھا ہے جس کا معنی تکبر کرنا، اترانا۔
فرہیت کا معنی عقلمندی، زیرکی اور شاش بٹاش رہنا ہے۔ جلالین میں
ہے : فرہین بطریقین و فی قراءۃ فارہین حاذقین یعنی جس

قرأت میں فرہین ہے اس کے مطابق معنی ہے اترانا، تکبر کرنا اور مشہور قرأت میں فرہین (الف کے ساتھ) ہی ہے اس لیے اس کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق مہارت سے، استادی سے ہوگا۔ اگر مشہور قرأت فرہین (غیر الف کے) ہوتی تو اترانا، اکرٹنا، تکبر کرنا یہ معانی نہ درست ہوتے لیکن مشہور و معروف قرأت کے مطابق تفاسیر کی رائے کو دیکھتے ہوئے کہتا پڑے گا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر سے مطابقت رکھتا ہے۔

وَادْخُلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ (پہلے)

• اور داخل کر مجھ کو ساتھ رحمت اپنی کے بیچ بندوں اپنے صالحوں کے۔
(شاہ رفیع الدین)

- اور مجھے اپنی رحمت سے داخل رکھ اپنے نیک بندوں میں (عبدالماجد)
- مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما (فتح محمد)
- اور ملا لے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں (مولانا محمود الحسن)
- اور ملا مجھ کو اپنی مہر سے اپنے نیک بندوں میں (شاہ عبدالقادر)
- اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھئے (اشرف علی)
- اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل کر (مودودی)
- اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے ان بندوں میں شامل کر جو تیرے قرب خاص کے سزاوار ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے اس لیے نبی کی دعا صرف نیک بندوں میں ہونے کی کافی نہیں بلکہ نیک بندے وہ مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کا قرب خاص حاصل ہو کیونکہ نیک آدمی تو عام غیر انبیاء بھی ہیں۔ اسی وجہ سے جلالین میں صلیب کی تفسیر الانبیاء والاہ لیا چونکہ یہ قرب خاص کے سزاوار ہیں لہذا ان میں شامل کرنے کی دعا کی مدارک تفسیر کی ہے: ای فی ذمیرۃ انبیاءک المرسلین

اور مع عبادت الصالحین یعنی مجھے انبیاء و مرسلین کی جماعت میں شامل کر
یا اپنے خاص مقرب بندوں میں شامل کر۔

لَوْلَا اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا دِيْهَا

• اگر نہ ہم نے گرہ دی ہوتی اُس کے دل پر (محمود الحسن)۔

• اگر نہ ہم نے گرہ کر دی ہوتی اس کے دل پر (شاہ عبدالقادر)

• اگر ہم اُن کے دل کو مضبوط نہ کئے رہے (عبدالماجد دریا آبادی)

• اگر ہم نہ ڈھارس بندھاتے اس کے دل پر (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر ہے جب کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام
کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم اس کے
دل کی ڈھارس نہ بندھاتے تو قریب تھا کہ وہ بے قرار ہوتیں۔

اس جگہ لَوْلَا کا جواب محذوف ہے جس پر ما قبل اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ

دلالت کر رہا ہے۔ یہاں بھی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصود پر دلالت کر رہا ہے اور جو معنی تقاضا

نے لیا ہے اسی کو آپ نے ذکر فرمایا۔ جلالین میں ہے: لَوْلَا اِنْ رَّبَطْنَا عَلٰی

قَلْبِهَا بِالصَّبْرِ اِی سَكْنَاهُ۔ یعنی اگر ہم اس کے دل کو تسکین نہ دیتے، ڈھارس

نہ بندھاتے۔ اسی طرح رُوح المعانی میں ہے: لَوْلَا اِنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا

اِی بِمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْهِ مِنَ السَّكِينَةِ وَالْمَرَادُ لَوْلَا اِنْ ثَبَّتْنَا قَلْبِهَا وَصَبَّرْنَا

فَالرَّبَطُ عَلِی الْقَلْبِ مِجَازٌ عَنِ ذَلِكِ۔ یعنی رَّبَطْنَا عَلِی قَلْبِهَا

کا معنی ہے کہ ہم نے جو اس پر تسکین کو نازل کیا۔ مراد یہ ہے کہ اگر ہم اس کے دل کو

ثابت نہ رکھتے اور نہ صبر دلاتے معنی اس کے دل کی ڈھارس نہ بندھاتے۔ یہاں رَّبَطْنَا

قَلْبِهَا بِهٖ مِجَازٌ مَعْنٰی هِيَ۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصود کو واضح کر رہا ہے۔ اس کے

سمجھنے میں کوئی استحالہ درپیش نہیں آتا اور حقیقی معنی گرہ دینا مراد نہیں بلکہ مجازی

معنی ہی معتبر ہے جیسا کہ رُوح المعانی سے واضح ہے۔

فَصْرٌ ثَابِتٌ عَنْ جَنْبٍ (پتہ ۱۴)

پھر دیکھتیں رہیں اس کو جنبی ہو کر (محمود الحسن)۔

تو اسے دُور سے دیکھتی رہی (اُعلیٰ حضرت)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب دریا میں ڈال دیا گیا تو آپ کی بہن دریا کے کنارے کنارے دُور سے صندوق کو دیکھتی رہی۔

اُعلیٰ حضرت نے عن جنب کا ترجمہ ”دور سے“ کیا ہے مفسرین کرام نے بھی زیادہ طور پر یہی معنی لیا۔ تفسیر کبیر میں ہے عن جنب ای عن بعد یعنی دور سے۔

مدارک میں بھی اسی طرح ہے عن جنب عن بعد دور سے۔ جلالین میں ہے:

عن جنب من مکان بعید اختلافاً یعنی دور مکان سے نظر بچا بچا کر دیکھتی رہی۔ جو روح المعانی میں ہے اختصاراً ذکر کیا جا رہا ہے: عن جنب

ای عن بعد وقیل ای عن شوق وقال الکرمانی الموصوف

محدوفاً ومعناه عن مکان بعید۔ وقیل عن جانب لانہا کانت

تمشی علی الشیء۔ یعنی دور سے دیکھتی رہی بعضوں نے کہا

کہ اس کا معنی ہے شوق سے دیکھتی رہی۔ کرمانی نے کہا کہ اس کا موصوف محدود

ہے۔ اصل عبارت ہوئی مکان جنب۔ اس کا معنی یہ ہوا دور مکان سے دیکھتی رہی۔

بعضوں نے کہا، ایک کنارے سے دیکھتی رہی کیونکہ وہ کنارے پر چل رہی تھی۔

”جنبی ہو کر دیکھتی رہی“ میں کسی حد تک ہے وہ یہ ہے: وقیل المنظر

عن جانب ان تنظر الی الشیء کانت لا عیدہ بعضوں نے کہا ایک

طرف سے دیکھتی رہی یعنی کسی چیز کی طرف اس طرح نظر کرنا گویا کہ اس کو دیکھنے کا

ارادہ نہیں تھا تاہم اس کا بھی واضح معنی تو یہ تھا کہ نظر بچا بچا کر دیکھتی رہی۔ حقیقت

ہے کہ اُعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں زیادہ تفاسیر کے اقوال ہیں۔

عَلَىٰ نَّ تَا جَرِي نِي ثَمَانِي حَجَبٍ (پتہ ۱۴)

- اس عہد پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو فتح محمد۔
 - اس شرط پر کہ تو میری نوکری کری کرے آٹھ برس (محمود الحسن)
 - اس پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس (شاہ عبدالقادر)۔
 - اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (مولانا شرف علی تھانوی)۔
 - بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو (مودودی)۔
 - اس مہر پر کہ تم آٹھ برس میری ملازمت کرو (علی حضرت)۔
- یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی کلام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کی کہ میں اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا ہتھکے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں شرط یہ ہے کہ مہر کے عوض تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ اس وقت آپ کی شریعت میں یہ مہر تھا۔

علی حضرت کے ترجمہ سے یہ واضح ہے آٹھ سال تک ملازمت کی شرط بطور مہر تھی۔ یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ شاید آپ صرف بیٹی کا رشتہ دینے کا لالچ دے کر یہ خدمت کرانا چاہتے ہوں اور مہر بعد میں کوئی اور مقرر کیا جانا ہو۔ باقی تراجم میں یہ وہم ہو سکتا ہے لیکن علی حضرت کے ترجمہ میں اس وہم کا کوئی ثابہ نہیں۔

روح المعانی میں ہے ویعقوب ذلك المهر کہ اس سے مہر مراد ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (پتہ ۱۵)

- تحقیق تو نہیں ہدایت کرتا جس کو چاہے (شاہ رفیع الدین)۔
- جس کو آپ چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے (عبدالماجد دریا آبادی)
- اے محمد تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے (فتح محمد)
- تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے (شاہ عبدالقادر محمود الحسن)

اے نبی اتم جسے چاہو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے (مؤدودی)۔

بے شک یہ نہیں کہ تم جسے اپنی طرف سے چاہو ہدایت کرو (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہاں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں ”جسے اپنی طرف سے چاہو“

کیونکہ آپ نے ایک اعتراض کو مندرجہ کیا۔ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کی ہدایت کی نفی فرمائی کہ آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَأَنْتَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ کہ آپ سیدھی راہ کی ہدایت فرماتے ہیں۔

اب ایک ہی ذات کا ہدایت فرمانا اور ہدایت نہ دینا ان میں منافات ہے۔ اس لیے

اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ فرمایا کیونکہ مقصد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر خود ہی

اپنی طرف سے کسی کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

اسی وجہ سے مدارک میں لا تَقْدَسُ أَنْ تَدْخُلَ فِي الْإِسْلَامِ كُلِّ مَنْ

اجبت کہ آپ جسے چاہیں اس کو اسلام میں داخل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

مطلب یہ ہوا کہ نفی قدرت ہے نہ کہ نفی ہدایت وہ بھی مشیتِ انبوی کے بغیر۔ اگر رب

خود قدرت عطا فرمائے تو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: اِنَّهٗ

تَعَالَى قَالَ فِي هَذِهِ الْآيَةِ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَجَبْتَ وَقَالَ فِي

آيَةِ اٰخَرَى وَاِنَّكَ لَتَهْدِي اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ وَلَا مَنَافَا

بَيْنَهُمَا فَاِنَّ الَّذِي اَشْبَهَ وَاَضَافَ اِلَيْهِ الدَّعْوَةَ وَالَّذِي نَهَى

عَنْهُ هَدَايَةَ التَّوْفِيقِ وَشَرَحَ الصَّدْوَةَ وَهُوَ خَوْفٌ يَقْذِفُ

فِي الْقَلْبِ فَيَحْيَا بِهِ الْقَلْبُ - مطلب یہ ہے کہ ایک آیت میں ہدایت

کا ثبوت ہے اور دوسری آیت میں ہدایت کی نفی ہے لیکن ان میں کوئی منافات نہیں

اس لیے کہ جس آیت میں ہدایت کا ثبوت ہے اس میں دعوتِ حق اور بیانِ شرع ہے۔

جس میں نفی ہے اس میں توفیق عطا کرنا، سینہ کو کھولنا، دل میں نور ڈالنا جس سے

دل کو زندگی حاصل ہو اور نورِ ایمان کو قبول کر سکے۔

روح المعانی میں ہے: اِنَّكَ لَا تَهْدِي هَدَايَةَ مُوَصَّلَةٍ

الی البغیة لا معالة من احييت اى كل من احييته طبعاً من
 اناس قومك وغيرهم ولا تقدر ان تدخل في الاسلام
 یہاں ہدایت مراد منزل مقصود تک پہنچانا یعنی ایمان عطا کرنا جس کو آپ اپنی قوم
 وغیرہ سے پسند فرماتیں اس کو ایمان عطا فرماتیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مقصد یہ
 واضح ہوا کہ نفعی اس ہدایت کی ہے جس میں قدرت و توفیق پائی جائے وہ اللہ تعالیٰ
 کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہدایت فرمانا رب تعالیٰ
 کے اپنے ہی ارشادِ گرامی سے ثابت ہے۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب کے ترجمہ میں
 ”اے محمد“ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔

وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ (پط ۱۷)

- اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان (مولانا محمود الحسن)۔
 - اور پھونکی اس میں اپنی جان میں سے (شاہ عبدالقادر)
 - اور اس میں اپنی روح پھونکی (مولانا اشرف علی)۔
 - اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی (مودودی)۔
 - اور پھونکا بیچ اس کے روح اپنی سے (شاہ رفیع الدین)۔
 - اور ابھی میں اپنی طرف کی روح پھونکی۔ (علیٰ حضرت)۔
- علیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی طرف سے
 ایک روح عطا فرمائی یہ مراد نہیں کہ وہ اللہ کی اپنی روح انسان کو حاصل ہو گئی جیسا کہ
 بظاہر دیگر تراجم سے وہم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تفسیر کبیر میں ہے: و نَفَخَ
 فِيهِ مِنْ رُوحِ اِي الرَّوحِ التِّي هِيَ مَلَكَةٌ كَمَا يَقُولُ الْقَائِلُ دَارِي وَ عِبْدِي -
 یعنی یہاں روح سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی ملک میں ہے جس طرح کوئی کہے میرا
 گھر اور میرا غلام۔ اسی طرح یہاں بھی مراد ہے۔ علیٰ حضرت نے اسی وجہ سے یہ ترجمہ
 فرمایا اپنی طرف کی روح پھونکی۔ مدارک میں ہے: الاضافة للاختصاص كان

قال ولنفعم فيب من الشئ الذي اختص هو به ويعلمه - یعنی یہاں روح کی نسبت جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے وہ اختصاص پر دل ہے مطلب یہ ہے کہ انسان میں رب نے اس چیز کو چھوٹا کیا جو اس کے ساتھ خاص ہے اور اس کے علم میں ہے۔ اس سے بھی پتا چلا کہ رب نے اپنی طرف سے انسان کو روح عطا فرمائی روح کو اپنی جانب صرف شرافت و تخصیص کے لیے منسوب کیا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ اس کی اپنی جان اور روح مراد ہے۔ اردو محاورہ میں اس طرح کہا جاتے کہ میں تو اپنی جان کا ذمہ دار ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اس کام کے کرنے میں فقط اپنا ذمہ دار ہوں کسی اور کا نہیں۔ اسی طرح یہ کہا جائے کہ جب تک میرے جسم میں میری روح موجود ہے میں انشاء اللہ اسی عقیدہ پر قائم رہوں گا۔ اس سے مراد بھی اس کی اپنی روح ہے اس لیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وہم نہیں ہوتا لیکن دیگر تراجم میں یہ وہم پایا جاتا ہے۔

وَلَنذِيْقَنَّكُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ (پلہ ۱۱)

- اور البتہ چکھادیں گے ہم ان کو عذوڑا سا عذاب ورے اس بڑے عذاب سے (شاہ عبدالقادر)۔
- البتہ چکھائیں گے ہم ان کو عذوڑا عذاب ورے اس بڑے عذاب سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- البتہ چکھادیں گے ہم ان کو عذاب چھوٹا سوائے عذاب بڑے کے۔ (شاہ رفیع الدین)
- اور ضرور ہم انہیں چکھائیں گے کچھ نزدیک عذاب اس بڑے عذاب سے پہلے (اعلیٰ حضرت)۔
- اس مقام پر کفار کا ذکر ہوا ہے کہ ان کو آخرت کا عذاب یعنی عذاب پار

دیا جائے گا اور اس سے پہلے دنیا کا عذاب دیا جائے گا۔ وہ دنیا کا عذاب کیا ہے؟

جلالین میں ہے: عذاب الدنيا بالقتل والاسر والجدب
سنين والامراض - ان کو قتل کرنا، قید دلانا اور کئی سال قحط سالی میں مبتلا
کرنا، امراض میں مبتلا کرنا

اب یہ سمجھا جائے کہ اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے العذاب الودی کا ترجمہ
”نزدیک کا عذاب“ کیا ہے، تصوراً عذاب نہیں کیا کیونکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدنہ
کا لغوی معنی نزدیک ہے جبکہ یہ دنو سے لیا جائے اور گھٹیا ہے جبکہ یہ دنیا دنیا
سے لیا جائے۔ یہاں دنو سے لیا گیا ہے اس لحاظ پر نزدیک کا عذاب کرنا اس میں حسن
اور کمال ہے کیونکہ اس میں احتیاط ہے، دو متقابلوں میں سے ایک کو ذکر کرنا دوسرے
کو چھوڑنا احتیاط ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے۔

تفسیر کبیر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ولندیقنہم من العذاب
الودی فی مقابلة العذاب الاقصی والعذاب الاکبر فی مقابلة
العذاب الاصغر فما العنکة فی مقابلة الودی بالاکبر -
فنقول حصل فی عذاب الدنيا امران احدهما انه قريب والاخر
انه قليل صغير وحصل فی عذاب الاخرة ايضا امران احدهما
انه بعيد والاخر انه عظیم كثير لكن القرب فی عذاب الدنيا
هو الذي يصلح للتخريف به فان العذاب العاجل وان كان
قليلاً قد يحتوئ منه بعض الناس اكثر مما يحتوئ من العذاب
الشدید اذا كان اجلاً وكذا الثواب العاجل قد يرغب فيه
بعض الناس ويستبعد الثواب العظيم الاجل واما فی عذاب
الاخرة فالذي يصلح للتخريف به هو العظيم والكمين
لا البعيد لما بينا فقال فی عذاب الدنيا العذاب الودی ليحتوئ
العاجل عنه وقال لندیقنہم من العذاب الاصغر ما كان يحتوئ عنه

لصغره وعدم فهم كونه عاجلا وقال في عذاب الاخرة الاكبر لذلك المعنى
ولو قال دون العذاب الا بعد الاقصى لما حصل التخويف به مثل
ما يحصل بوصفه بالكبر وبالجملة فقد اختار الله تعالى في العذاب
الوصف الذي هو اصل للتخويف من الوصفين الاخرين فيهما الحكمة بالغة
یہاں بیان یہ کیا جا رہا ہے ولینذیقنہم من العذاب الاذنی
بمقابلت العذاب الاقصى کے ہے یعنی دنیا کا عذاب قریب ہے اور آخرت کا عذاب
دور ہے۔ اسی طرح العذاب الاکبر، العذاب الاصغر کے مقابلہ میں ہے مقصد یہ
ہے کہ آخرت کا عذاب بڑا ہو گا جب کہ دنیا کا عذاب چھوٹا اور تھوڑا۔ اب فرماتے ہیں
کہ دنیا کے عذاب کو ادنیٰ یعنی نزدیک سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخرت کے عذاب کو
بڑا کہا گیا ہے۔ اس میں یعنی نزدیک کا عذاب بمقابلہ بڑے عذاب کے ذکر کرنے میں
کیا فائدہ ہے۔ علامہ رازی اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عذاب
دنیا میں بھی دو چیز کا مل ہیں۔ ایک قریب ہونا اور دوسرا تھوڑا اور صغیر ہونا (شدید
نہ ہونا) اسی طرح عذاب آخرت میں بھی دو صورتیں ہیں، ایک بعید ہونا اور دوسرا بہت
زیادہ شدید ہونا لیکن عذاب دنیا کو ادنیٰ یعنی قریب (نزدیک) کے ذکر اس لیے
کیا گیا ہے کہ مقصود تو خوف دلانا ہے۔ اس میں زیادہ خوف حاصل ہو سکتا ہے۔
اس لیے کہ بعض لوگ جلدی عذاب سے زیادہ ڈرتے ہیں بے شک وہ تھوڑا ہی ہو بہ
نسبت اس عذاب کے جو دیر سے آنے والا ہو بیشک وہ زیادہ بھی کیوں نہ ہو۔ یعنی
دیروالے عذاب سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا جلدی والے سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح
آخرت والے عذاب میں اس کا شدید ہونا اور زیادہ ہونا ڈرانے کا سبب بننے کی زیادہ
صلاحیت رکھتا ہے اس کا دور ہونا ڈرانے کی صلاحیت اس طرح نہیں رکھتا جس
طرح اس کا زیادہ شدید ہونا۔ اسی وجہ سے دنیا کے عذاب کو نزدیک کا عذاب کہا
ہے تاکہ عقلمند آدمی اس سے بچے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ہم چکھائیں گے تھوڑا عذاب
تو اس سے اس عذاب کا جلدی ہونا تو سمجھ نہ آتا اور اس کے تھوڑے ہونے کی

وجہ سے اس سے احتراز نہ ہوتا (بچا نہ جاتا)۔

اسی وجہ سے آخرت کے عذاب کو اکبر کہا ہے (بڑا عذاب) اقصی نہیں کہا (دور کا عذاب) کیونکہ آخرت کے عذاب کو جو بڑا عذاب کہنے کی وجہ سے خوف دلانے والا مقصد حاصل ہو سکتا ہے وہ دور کا عذاب کہنے سے نہیں حاصل ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ کا یہ تقاضا ہے اس نے دونوں عذابوں کے ان وصفوں کو ذکر کیا ہے جس میں خوف دلانے کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ ان وصفوں کو نہیں ذکر کیا جن میں یہ صلاحیت نہیں۔

اب علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر دلیلیہ کے بعد کبھی کوئی شخص اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی کا منکر ہے اور آپ کی علمی بصیرت کو نہ تسلیم کرے تو یہی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے عناد کو دور کرے ورنہ کسی منصف شخص سے یہ امید کرنا ممکن نہیں کہ وہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو کامل ترین نہ ملنے۔ توجہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت نے العذاب اللادنی کا ترجمہ نزدیک کا عذاب اور دون کا ترجمہ پہلے کیا ہے اور دیگر مترجمین نے العذاب اللادنی کا ترجمہ تھوڑا عذاب اور دون کا "وس" (سوا) کیا ہے کون سا ترجمہ حکمتِ باری تعالیٰ کے مطابق ہے اور کون سا مخالف۔

فَاخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ (پانچ)

- تو دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں (فتح محمد)۔
- پس بھائی تمہارے ہیں بیچ دین کے اور چلے تمہارے ہیں (شاہ رفیع الدین)
- تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں (مولانا محمود الحسن)۔
- تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق (شاہ عبدالقادر)۔
- وہ تمہارے دین میں بھائی ہیں اور دوست (اشرف علی)۔
- وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں (مودودی)۔
- وہ تمہارے دین کے تو بھائی ہیں اور تمہارے دوست (عبدالماجد ریاضی)

تو دین تمہارے بھائی ہیں اور بشریت میں تمہارے چچا زاد (اعلیٰ حضرت)
 حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبیتی رلے پالک
 بیٹے) تھے اور لوگ ان کو ابن محمد کہنے لگے۔ اسی وجہ سے جب نبی کریم نے حضرت زینب
 بنت جحش سے نکاح کیا تو یہود و منافقین نے یہ کہا کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی کو بیٹا کہنے سے
 وہ حقیقتاً بیٹا نہیں بنتا اور جمیع احکام بیٹے والے اس پر جاری نہیں ہوتے کہ جس طرح
 حقیقی بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ زوجہ سے نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح اس سے بھی نہ ہو۔
 اس آیت کیوجہ میں یہ ذکر فرمایا کہ تم ان کو اپنے باپوں کے ناموں سے ہی پکارو۔ یہ ہی اللہ
 تعالیٰ کو پسند ہے۔

یعنی جس طرح تم زید ابن محمد کہتے ہو ایسے نہ کہو بلکہ زید بن حارثہ کہو۔ اسی طرح
 اور کسی کو پکارنا ہو تو اس کے باپ کے نام سے پکارو اگر تم ان کے باپوں کو نہیں جانتے
 تو وہ تمہارے دین میں بھائی ہیں اور بشریت میں چچا زاد۔ و مولیٰکم بنو عبدکم
 (جلائین) "اور تمہارے چچا زاد ہیں۔" اس پر حمل میں اس طرح ذکر کیا
 گیا ہے: - وَقَوْلُهُ يَهُودُ عَمَّكَ تَنْسِبُونَ لِلْمَوْلَىٰ فَإِنَّ الْمَوْلَىٰ يُطْلَقُ عَلَىٰ
 مَعَانِيٍّ مِنْ جَمَلَتِهَا بِنِ الْعَمِّ أَيْ فَإِذَا لَمْ تَعْرِفُوا أَبَا شَيْخِكُمْ
 تَنْسِبُونَ إِلَيْهِ وَإِسْمُ خَطَابٍ فَقَوْلُ الْمَوْلَىٰ يَا بَنِي عَمِّي - یعنی بنو عبدکم سے
 مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے مولیٰ کی تفسیر کی ہے کیونکہ مولیٰ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے
 یہاں چچا زاد کے معنی میں استعمال ہے کیونکہ اس کے معانی میں سے یہ بھی ہے۔
 مقصد بیان یہ ہے کہ اگر تم کسی شخص کے باپ کو نہیں پہچانتے جس کی طرف اسے
 منسوب کر سکو اور اس کا بیٹا کہہ کر اسے پکارو اور تم اسے پکارنا چاہتے ہو، اس سے
 کوئی خطاب کرنا چاہتے ہو تو اسے چچا زاد کہہ کر پکارو یعنی اے میرے چچا کے بیٹے!
 اے میرے چچا زاد! کہو۔ یا پہلے جو ذکر ہو چکا ہے فَاخْرُجُوا مِنَ الدِّينِ کہ وہ تمہارے
 دین میں بھائی ہیں، تو ان کو اے میرے بھائی کہہ کر پکارو۔

اس پر کمالین کی عبارت یہ ہے: بنو عمکرفان آدم علیہ السلام
جد کی نبی آدم والمولیٰ یطلق علی بنی العم ومنت قول ذکر یا
والی نخت الموالی من ووالی یعنی موالیکم کا معنی تمہارے چچا زاد کیوں ہے
اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام انسانوں کے جدِ امجد ہیں اور مولیٰ کا معنی چچا
آتا رہتا ہے جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے بارگاہِ انبوی میں عرض کیا والی
نخت الموالی من ووالی۔ یہاں بھی موالی چچا زاد کے معنی میں ہی ہے۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تفاسیر کی تائید موجود ہے اور آپ کا ترجمہ آپ
کے کمالِ علمیت پر دال ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ رِبِّكَ عَزَّمَ

• نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے (محمود الحسن)۔
• " " " " " " (شاہ عبدالقادر)
• یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے۔ (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید تفسیر مدارک میں اس طرح ہے: وهو
اولیٰ بہم ای روف بہم واعطف علیہم وانفع لہم کقولہ تعالیٰ
بالمؤمنین روف رحیم و فی قراۃ ابن مسعود النبی اولیٰ بالمؤمنین
وهو اب لہم قال مجاہد کل نبی فہو ابو امتہ ولذلك صار المؤمنون
لغوۃ لادن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوہم صرف الیدین۔
آپ مومنوں پر اولیٰ ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ان پر مہربان
اور رحمدل اور ان کے لیے نافع ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ مومنوں
پر مہربان اور رحیم ہیں۔

حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے النبی اولیٰ بالمؤمنین
من انفسہم وهو اب لہم۔ نبی مومنوں پر مہربان ہیں اور ان کے مالک ہیں

• تم میں سے جو کوئی کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی (عبدالماجد دریا آبادی)
 • جو تم میں صریح خیال کے خلاف کوئی جرات کرے (اعلیٰ حضرت)
 اس آیت میں خطاب نبی کریم کی ازواجِ مطہرات کو ہے جو امہاتِ المؤمنین ہیں۔
 ایک ہی مضمون کو ترجمہ کرتے وقت مختلف الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت
 کے ترجمہ اور دوسرے تراجم میں کتنا فرق نمایاں ہے۔ آپ نے ایسے الفاظ ترجمہ میں لائے
 ہیں جو ادبِ احترام پر دال ہیں جب کہ دیگر حضرات ازواجِ مطہرات کی شان میں الفاظِ
 ادب کو پیش نہ کر سکے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نواز دے وہی بزرگ ہستیوں کی
 شان کا پاس کرتا ہے۔

وَتَخَشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (پ ۲۲)

• اور ڈرنا تھا تو لوگوں سے اور اللہ بہت لائق ہے اس کا کہ ڈرے تو اس
 سے (شاہ رفیع الدین)۔

• اور ڈرنا تھا لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا (محمود الحسن)

• اور تو ڈرنا تھا لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا تجھ کو۔

(شاہ عبدالقادر)۔

• اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے

زیادہ سزاوار ہے۔ (مولانا اشرف علی تھانوی)

اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس

سے ڈرو (فتح محمد)۔

• اور تمہیں لوگوں کے طعنہ کا زیادہ اندیشہ تھا اور اللہ زیادہ سزاوار ہے کہ

اس کا خوف رکھو۔ (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو علمِ عطا فرمادیا تھا کہ آپ کے نکاح میں حضرت

زینب آئیں گی۔ آپ نے اس کو مخفی رکھا اور لوگوں کے طعنہ کا اندیشہ ہوا کہ لوگ

کہیں گے اپنے نے پاک بیٹے کی زوجہ (مطلقہ) سے نکاح کر لیا ہے۔ نبی کریم کو اس کا پہلے ہی علم تھا کہ حضرت زینب میرے نکاح میں آئیں گی۔ اس پر رُوح البیان کی عبات ملاحظہ ہوں وہو علم بان شامید سیطلقھا و سیکنھا یعنی انت تعلم بما اعدتک انہا مستکون زوجتک و انت تخفی فی نفسک هذا المعنی واللہ یرید ان یخزلک وعدہ و یرید انہا زوجتک بقولہ زوجناکھا۔ یعنی نبی کریم جانتے تھے کہ حضرت زینب کو طلاق دیدیں گے اور وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں علم عطا فرمایا کہ وہ آپ کی زوجیت میں آئیں گی لیکن آپ نے اسے مخفی رکھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ وہ آپ کی زوجیت میں آگئیں اور اللہ تعالیٰ نے زوجناکھا کہہ کر اس کو ظاہر فرما دیا

یہاں تک تو صرف سمجھانے کے لیے آیت کریمہ کا مفہوم پیش کیا۔ اب تراجم میں فرق کی طرف توجہ کی جائے۔ باقی تراجم میں ڈر کو عام رکھا گیا، تو ڈرتا تھا، یا تجھے لوگوں کا اندیشہ تھا۔ اس قسم کے تراجم اوہام باطلہ کا سبب بنتے ہیں جن سے یہ بتا چلتا ہے کہ نبی کریم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ آپ نے اکیلے ہوتے ہوئے قوم کو اللہ کی وحدانیت کا پیغام دیا۔ شعب ابی طالب میں قوم کی قطع تعلق کے سبب سے رہے لیکن پائے استقامت میں پکڑنے آئی۔ ایک مرتبہ اپنے سر پرست چچا ابوطالب کو بھی کہہ دیا کہ آپ میری سرپرستی بیشک چھوڑیں میں اللہ کی وحدانیت بیان کرنے سے نہیں رُک سکتا۔

مطلقاً یہ کہہ دیا جائے تو ڈرتا تھا تو نبی کریم کی شان کے خلاف ہے لیکن حضرت نے ایک خاص صوت میں ڈر اور اندیشہ کا ذکر کیا ہے یعنی آپ لوگوں کے طعنہ سے اندیشہ کرتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے نے پاک بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔ ڈر کا تعلق فقط اسی صورت میں ہے۔

جلالین میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: وتخشى الناس ان یقولوا تزوج

محمد بن ابی بکر - آپ لوگوں کے اس طعنہ کی فکر کرتے ہیں کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔

روح المعانی میں ہے وتخشى الناس غفاف من اعتواضهم وقيل

ای تسخى من قولهم ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم تزوج زوجة ابنته والمراد بالناس الجنس والمنافقون - آپ لوگوں کے اعتراضات

کی فکر تھی اور کہا گیا ہے کہ آپ انکی باتوں سے شرم محسوس فرماتے کہ یہ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔ لوگوں سے مراد بھی منافقین ہیں یعنی یہ فکر منافقوں کی کلام کی تھی۔

علیٰ حضرت کے ترجمہ کی یہی خصوصیت ہے کہ آپ نے ہر پہلو کو مد نظر رکھا اور متوقع خدشات کو پہلے ہی دور فرما دیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا (آیت ۲۲)

• ہم نے تجھے کو بھیجا بتانے والا (مولانا محمود الحسن)۔

(شاہ عبدالقادر)۔

• ہم نے آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا کہ آپ گواہ ہوں گے (شرف علی)

• ہم نے تجھے بھیجا گواہ بنا کر (مولانا مودودی)۔

• بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے بطور گواہ (عبد الماجد دریا آبادی)

• بے شک ہم نے تجھے بھیجا حاضر و ناظر (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت کے اس ترجمہ پر معترضین نے بڑے غصہ میں کہا کہ حاضر و ناظر

کسی لفظ کا ترجمہ نہیں۔ حاضر و ناظر معنی غلط ہے۔ قرآن پاک کے مفہوم سے نا بلند

ہونے کی علامت ہے۔ لیکن اس میں یہ ہے کہ معترضین تفاسیر سے نا بلند ہونے کی وجہ

سے علیٰ حضرت کے ترجمہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ

تفاسیر کو دیکھ کر جو بات نہ ملے پھر اعتراض کرے تفسیر روح المعانی میں دیکھا جائے

اس طرح ذکر ہوتا ہے :-

ہا ہا ان سلنک شاہدا علی من بعثت الیہم شرا قبا احوالہم
و تشاہد اعمالہم - ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا یعنی آپ جن کی طرف مبعوث
ہیں ان کے احوال کے محافظ اور ان کے اعمال کے ناظر ہیں۔ روح المعانی میں اور اس
طرح ذکر کیا گیا ہے : انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی بروحہ وجسدہ لیسیر
بعیث شامو فی اقطاس الارض وال ملکوت یعنی نبی کریم اپنے روح اور جسم کے ساتھ زند
ہیں اور آپ جہاں بھی چاہیں زمین و آسمان کے اطراف میں جا سکتے ہیں : سواتشار
بعین السادة الصوفية الى ان امثله تعالى قد اطلعہ صلی اللہ علیہ وسلم
على اعمال العباد فنظر الیہا ولذلك اطلق علیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
شاهد قال مولانا جلال الدین الرومی قدس سرہ العزیز فی مثنویہ -

در نظر بوش مقامات العباد زان سبب نامش خدا شاہد نہاد
فائل ولا تغفل بعض سادات صوفیائے کرام نے یہ فرمایا کہ آپ بندوں کے
اعمال پر مطلع ہیں ان پر نظر فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد
کہا گیا ہے۔ علامہ رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں فرمایا :
”بندوں کے مقامات آپ کی نظر میں ہیں اسی وجہ سے آپ کا نام اللہ تعالیٰ نے
شاہد رکھا۔“

اگے علامہ آکوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سوچ اور غافل نہ ہو مطلب یہ
ہے کہ غافل کو یہ بات سمجھ نہیں آ سکتی۔ اعلیٰ حضرت اپنے ترجمہ میں متفرد نہیں بلکہ تفسیر
میں بھی یہ معنی پیش کیا گیا ہے اور اولیائے کرام بھی اسی معنی کے قائل ہیں۔ البتہ یہ
خیال رہے کہ اہلسنت و جماعت کا حضور کے حاضر و ناظر میں یہ عقیدہ نہیں کہ حضور
اپنے جسم ظہر کے ساتھ ہر جگہ موجود ہیں اور ہر ایک کے سامنے ظاہر ہیں بلکہ عقیدہ
یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم میں جاری و ساری ہے حضور صلی
اللہ علیہ وسلم اپنی روحانی طاقت سے بیک وقت کئی مقام پر موجود ہوتے ہیں۔ اسی

وجہ سے اولیائے عظام نبی محترم کو حالتِ بیداری میں دیکھتے ہیں اور آپ کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں حضور کا سامنے ہونا بمعنی حاضر کے ہیں اور آپ کا اپنی ائمت اور امت کے احوال کو دیکھنا بمعنی ناظر کے ہے۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے شرح وقایہ کے حاشیہ سعایت میں تحریر فرمایا: السرفی خطاب التثمدان الحقیقہ المحمدیۃ کا مہاساریتہ فی کل وجود و حاضرتہ فی باطن کل عبد و انکشاف ہذہ الحالت علی الوجہ الا تم فی حالت الصلوۃ فحصل محل الخطاب یعنی علامہ عبدالحی لکھنوی فرماتے ہیں کہ تشہد میں السلام علیک ایہا النبی میں نبی کریم کو خطاب میں یہ راز ہے کہ حقیقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر وجود میں جاری ہے اور ہر بندے کے باطن میں موجود ہے اور یہ حالت کامل طور پر نماز میں حاصل ہوتی ہے اور اسکی وجہ سے محل خطاب حاصل ہو گیا۔

اسی طرح اشعۃ اللمعات شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

”بعضے از عرفا کفتمہ اند کہ ای خطاب بجمہت سر بیان حقیقتہ محمدیہ

است در ذرات موجودات و افراد ممکنات پس آنحضرت در ذوات مصلیا

موجود و حاضر است پس مصلی را باید کہ ازیں بارگاہ باشد و ازیں شہود

غافل نبود تا بہ انوار قرب و اسرار معرفت متنور و فائز گردد“

بعض عارفین نے التجلیات میں نبی کریم کے خطاب میں یہ وجہ بیان کی ہے کہ حقیقتہ

محمدیہ تمام موجودات کے ذرات اور ممکنات کے افراد میں موجود ہے پس نبی کریم

کی حقیقت نمازیوں میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے نمازیوں کو اس سے باخبر ہونا چاہیے

تاکہ نبی کریم کی موجودگی سے بخیر نہ رہیں اور نبی کریم کی تجلیات کے انوار سے منور

ہو سکیں اور کامیابی حاصل کر سکیں۔

اب یہ واضح ہوا کہ اہلسنت و جماعت کا نبی کریم کے حاضر و ناظر ہونے کا

جو عقیدہ ہے اس کو مخالفین و معتزلیں کے اپنے ہی مقدم مولانا عبدالحی لکھنوی نے

بھی تحریر فرمایا ہے۔ امید ہے کہ ان کی وجہ سے ہمیں بھی کوئی نام کا توحیدی اپنے

شکر کے فتویٰ سے بچائے گا یا پھر اپنے امام کو بھی اپنے فتویٰ کی لپیٹ میں لائے گا۔

بِحَبْلِ اَوْبِي مَعَهُ (پتا پتہ)

- اے پہاڑو! خوش آوازی سے پڑھو اس کے ساتھ (مولانا محمود الحسن)
- اے پہاڑو داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو (مولانا اشرف علی)۔
- اے پہاڑو اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (مودودی)۔
- اے پہاڑو ان کے ساتھ تسبیح کرو۔ اے پہاڑو اس کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرو (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر ہے کہ آپ جب اللہ کا ذکر فرماتے، تسبیحات پڑھتے، آپ کے ساتھ پہاڑ بھی پڑھتے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ خوبی ہے کہ مقصد بیان اور لغوی معنی دونوں کو شامل ہے کیونکہ اَوْبِي کا لغوی معنی رجوع کرنا ہے آپ نے ترجمہ فرمایا "اللہ کی طرف رجوع کرو" یعنی اللہ کی طرف راجع ہو کر اس کا ذکر کرو۔ روح المعانی میں ہے: وَالظَّاهِرُ اِنَّ عَرَبِيًّا مِنْ التَّوَابِيْبِ وَالْمُرَادُ رَجْعِي مَعَهَا تَسْبِيْحٌ وَرَدَّدِيَةٌ وَقَالَ ابْنُ عَطِيَّةٍ اِنْ اَصْلُ مَا ضَمِيَتْ اَبٌ وَضَعْفٌ لِلْمَبَالِغَةِ وَتَعْقِبُهُ فِي الْعَرَبِ لِقَوْلِهِ وَيُظْهِرُ اَنَّ التَّضْعِيْفَ لِلتَّعْدِيَةِ لِاَنَّ اَبٌ بِمَعْنَى رَجْعٍ لَازِمٌ صِلَةُ السَّلَامِ فَهَدَى بِالتَّضْعِيْفِ اِذَا شَرَحُوهُ بِقَوْلِهِمْ رَجْعِي مَعَهُ التَّسْبِيْحُ - يَرَوِي اِنَّ عَلِيَّ السَّلَامَ كَانَ اِذَا سَبَّحَ سَبَّحَتِ الْجِبَالُ مِثْلَ تَسْبِيْحِهِ بِصَوْتٍ يَسْمَعُ مِنْهَا وَلَا يَعْرِضُ اَمْلَهُ عَزَّوَجَلَّ اِنْ يَجْعَلُهَا بِحَيْثُ تَسْبِيْحُ بِصَوْتٍ يَسْمَعُ وَقَدْ سَبَّحَ الْحَمْدُ فِي كَفِّ نَبِيْنَا عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَسَمِعَ تَسْبِيْحَهُ وَكَذَلِكَ فِي كَفِّ ابْنِ بَحْرٍ رَضِيَ اَمْلَهُ عَنْهُ - يَعْنِي ظَاهِرِيَّةً يَسِيءُ اَنَّ اَوْبِيَّ عَرَبِيٌّ لَفْظُهُ اَوْ اس سے مراد یہ ہے کہ پہاڑو! اللہ کی طرف رجوع کرو یعنی ذکر کرتے ہوئے تسبیحات پڑھتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرو۔

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ اصل ماضی آب تھی پھر عین کلمہ کو مشدّد کیا۔ باب تفصیل پر لے گئے مبالغہ کے لیے۔ اور بحر میں یہ کہا گیا ہے کہ تضعیف متعدی بنانے کے لیے ہے۔ آب لازم ہے رَجْع کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا صلہ لام آتا ہے جب متعدی کیا گیا تو معنی ہوا اللہ کی طرف رجوع کرو تسبیح کرتے ہوئے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیحات کے ساتھ پہاڑ بھی تسبیح کرتے اور ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیحات سے مراد تلاوتِ زبور ہے کیونکہ زبور میں صرف ذکر، اذکار اور تسبیحات تھیں، اوامر و نواہی نہیں تھیں (اللہ تعالیٰ کو مشکل نہیں کہ وہ پہاڑوں کو تسبیحات کی طاقت عطا فرمائے اور ان کی آواز سنائی دے جیسا کہ نبی کریم کے ہاتھ مبارک میں کتکریوں نے کلام کی۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ رجوع مع تسبیحات کو مشکل ہے کیونکہ اللہ کی طرف رجوع اس کے ذکر اور تسبیحات کے بغیر نہیں۔ مدارک میں بھی اسی طرح اور بی معہ من التاویب ای رجعی معہ التسبیم۔ یعنی مع تسبیحات کے رجوع کرو مطلب یہ کہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔

فَلَمَّا خَرَّ (پ ۲۳)

- پھر جب وہ گر پڑا (مولانا محمود الحسن، شاہ عبدالقادر)۔
 - اسی طرح جب سلیمان گر پڑا (مودودی) • سو وہ جب گر پڑے (عبدالماجد)
 - پس جب گر پڑا (شاہ رفیع الدین)۔
 - پھر جب سلیمان زمین پر آیا۔ (اعلیٰ حضرت)
- حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں سے بیت المقدس کی تعمیر کرا رہے تھے۔ آپ پر تو کا وقت آگیا۔ ابھی تک بیت المقدس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ آپ کی خواہش پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی طرح عصا پر سہارا لے کر جس طرح کھڑے تھے ثابت رکھا جب عصا کو دیکھنے لگا اور آپ زمین پر تشریف لے آئے تو بیت المقدس کا کام بھی مکمل ہو

چکا تھا۔

یہاں تراجم میں فرق یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ادب کا لحاظ ہے غور فرمائیں جب وہ گریٹر ایاز میں پر آیا۔ ان دونوں میں کتنا نمایاں فرق ہے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ (پ ۲۳)

- تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک دھندے میں ہیں باتیں کرتے مشاہد عابد قادری۔
 - تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک مشغلہ میں ہیں باتیں کرتے (مولانا محمود الحسن)
 - اہل جنت بے شک اس روز اپنے مشغلہ میں خوش دل ہوں گے (عبدالماجد)
 - بے شک جنت والے آج دل کے بہلاؤوں میں چین کرتے ہیں (اعلیٰ حضرت)
- اعلیٰ حضرت نے فاکھون کا ترجمہ کیا ہے "چین کرتے ہیں" اس کی تائید میں تفسیر مدارک کی عبارت اس طرح ہے :- وَالْفَاكِهَةُ وَالْفَاكِهَةُ الْمَمْتَنِعَةُ الْمَمْتَلِذُ وَمِنْهُ الْفَاكِهَةُ مِمَّا يَمْتَلِذُ بِهِ -

یعنی فاکہہ اور فکہہ کا معنی چین میں رہنا اور لذت دینا۔ اسی وجہ سے پھلوں کو جولت دینے والے ہوتے ہیں فاکہہ کہا جاتا ہے۔

جلالین میں ہے :- فَاكُهون مَنَاعَمون وہ چین میں ہونگے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر تفسیر دال ہیں کیونکہ مقصود وہی ہے کہ وہ اپنے دل کے بہلاؤوں میں چین کرتے ہوں گے۔ آپ کا ترجمہ مقصد بیان سے مطابقت رکھتا ہے جو اس کے درجہ کمال پر صراحت دال ہیں۔

بَلْ هُمْ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ (پ ۲۳)

- بلکہ وہ آج ہکے دن فرماں بردار ہیں (شاہ رفیع الدین)
- کوئی نہیں وہ آج آپ کو گریٹر واتے ہیں۔ (شاہ عبدالقادر)۔

marfat.com

Marfat.com

• اُسے آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کئے دے رہے ہیں۔
• بلکہ آج تو وہ فرما رہے ہیں (فتح محمد)

(مودودی)

• بلکہ وہ آج گردن ڈالے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر ہتھیوں کا ذکر ہے کہ جب ان کو ہتھیوں کی طرف بھیجا جائے گا، رب تعالیٰ فرمائے گا ان کو ٹھہرا لو۔ ان سے پوچھتا ہے کہ آج تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ تو وہ کوئی جواب دینے کی طاقت میں تو نہیں ہوں گے، ندامت و سذلت سے سر جھکا لیں گے۔ گردن ڈالے ہوئے ہوں گے۔

اعلیٰ حضرت نے مسلمانوں کا ترجمہ کیا ہے ”گردن ڈالے ہیں“ جبکہ دیگر تراجم میں ”کوئی نہیں“ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔ ان کے نزدیک تو جو عربی لفظ مذکور ہے ان کے بغیر ترجمہ میں کوئی لفظ آجائے تو قرآن پاک کی معاد اللہ تحریف لازم آتی ہے۔ کیا وہ اپنے بزرگوں کو بھی محرف کہنا پسند کریں گے یا کہ دوسروں کو ہی اپنے فتوؤں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پھر مسلمانوں کا ترجمہ اپنے آپ کو پکڑواتے ہیں یا آپ کو پکڑواتے کس لحد کا ترجمہ ہے؟ اور فرماں بردار ”ترجمہ کرنا بھی مقصد کے خلاف ہے۔“

آئیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کی روشنی میں انصاف کی نظر سے دیکھیں تو بلاشبہ اس کی افادیت کا انکار نہیں ہو سکے گا۔ مدارک میں ہے :-

مسلمون منقادون او اسلم بعضہم بعضا

و عزل عن عجز فکلمہم مستسلم غیر منتصرو۔

یعنی وہ گردن ڈالے سر جھکائے ہوں گے ایک دوسرے سے بھی ندامت اٹھا رہے ہوں گے۔ سب اپنے عجز کی وجہ سے رسوا ہوں گے۔ تمام کے تمام سر جھکائے ہوں گے۔ کوئی کسی کی امداد نہیں کر سکے گا۔

جلالین میں ہے: منقادون اذلاً ذلت سے گردن ڈالے ہوں گے۔

خطیب میں ہے: منقادون اذلاء لا حیلۃ لہم فی دفعۃ تلك المضار۔

ذلت سے گردن ڈالے ہوں گے اس عذاب سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ نہیں ہوگا۔

رُوح المعانی میں ہے: مستسلمون منقادون لعجزهم
 والسداد الحیل علیہم واصل الامم تسلیم طلب السلامۃ
 والانتیاد لازم لذلك عرفا فلذا استعمال فیہ وہ اپنے عجز اور کوئی حیلہ نہ چلنے کی وجہ
 سے گردن ڈالے ہوں گے۔

اصل میں استسلام کا مطلب سلامتی کی طلب ہے۔ اور سر جھکانا، گردن ڈالنا یا
 اطاعت کرنا اسی کے عرف میں لازمی معانی ہیں۔ اسی وجہ سے اس میں استعمال ہے۔
 تفسیر کبیر میں ہے: یقال استسلم للشیء اذا القاد له ونهضم ومعناه
 فی الاصل طلب السلامة بتزك المنازعة والمقصود انهم صاروا
 منقادین لاحیلة لهم فی دفع تلك المضار لا العابد والمعبود۔
 استسلم لشیء کہا جاتا ہے جب کہ کوئی اس کے سامنے سر جھکائے اور عاجزی
 کرے۔ اصل میں اس کا معنی جھگڑا کو چھوڑنا اور مسالمت طلب کرنا۔ اور مقصود یہ ہے
 گردن ڈالے ہوں گے۔ عابد اور معبود میں سے کسی کو بھی اس عذاب کے مندرجہ گننے
 میں حیلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔

تفسیر کی عبارات دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر ڈالیں تو یقیناً
 عظیم الشان ترجمہ نظر آئے گا۔ اور موڈودی صاحب کا ترجمہ مقصد سے بہت ہی
 دور ہے۔

فَاغْلَبِيَهُ خَيْرًا بِالْيَمِينِ (پ ۱۴)

- پھران پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (عبدالماجد دریا آبادی)
- پھر ان کو دہنے ہاتھ سے مارنا (اور توڑنا) شروع کر دیا (فتح محمد)۔
- پھر گھسا ان پر مارتا دہنے ہاتھ سے (شاہ عبدالقادر)۔
- پھر گھسا ان پر مارتا ہوا دہنے ہاتھ سے (محمود الحسن)۔
- پھران پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے۔ (مولانا اشرف علی)

• اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں (موڈی)
 • تو لوگوں کی نظر بچا کر انہیں دہسنے ہاتھ سے مارنے لگا (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بتوں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ آپ نے اپنی قوم
 کی نظر بچا کر بتوں کو توڑ دیا۔ اعلیٰ حضرت نے فریغ علیہم کا ترجمہ کیا ہے "لوگوں کی نظر
 بچا کر" جب کہ دیگر مترجمین نے "پھر گھسا ان پر" یا "پھر ان پر قوت سے جا پٹے"
 اور "ان پر پل پڑا" ترجمہ کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کی تائید حاصل ہے۔

مدارک کا حوالہ ذکر کر رہا ہوں ملاحظہ ہو:۔ فاقبل علیہم ضربا فاقبل

علیہم مستخفیا کانہ قال فضر بہم ضربا لامنہ سماغ
 علیہم آپ ان کی طرف مخفی طور پر متوجہ ہوتے، گویا کہ یہ کہا گیا ہے
 ان کی نظر بچا کر (قوم کی) ان کو مارا۔

تفسیر کبیر میں ہے: فریغ الی الہتم یقلل داخ الیہ اذا مال الی فی السر

علی سبیل الخفیۃ ومنہ روغان الثعلب خیال رہے کہ تفسیر کبیر یہ عبارت اس

لیے پیش کی جا رہی ہے کہ دونوں جگہ لفظ فریغ استعمال ہے جو دونوں مقاموں پر

ایک ہی معنی میں استعمال ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فریغ الیہ کہا جاتا ہے جب وہ

کسی چیز کی طرف پوشیدہ مخفی طور پر مائل ہو۔ اسی معنی میں روغان الثعلب بھی

ہے لومڑی کا آہستہ طور پر مخفی ہو جانا۔ کبیر میں یہی ہے: فریغ علیہم ضربا

فاقبل علیہم مستخفیا۔ ان کی طرف مخفی طور پر متوجہ ہوتے۔

واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے مقصود بھی یہی ہے کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کی نظر بچا کر بتوں کو مارا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ

بھی یہی ہے جو مقصود پر دال ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت ظاہر رہا پھر

ہو گئی۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ قَالَ يُبْتِغِي بِنِيَّ أَرَى فِي الْمَنَامِ الْآيَةَ

(پتہ عظم)

• پھر جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تجھ کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو، تو کیا دیکھتا ہے۔ شاہ عبدالقادر • سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے۔ (مولانا اشرف علی)۔

• پس جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو، کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تم کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے (مولانا محمود الحسن) • جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا۔ (فتح محمد) • پس جس وقت پہنچا دوڑنے کو کہا اے چھوٹے بیٹے میرے تحقیق میں دیکھتا ہوں ذبح خواب کے تحقیق میں ذبح کرتا ہوں تجھ کو پس دیکھ کیا دیکھتا ہے تو (شاہ رفیع الدین)۔

• پھر جب وہ اس کے ساتھ کام کے قابل ہو گیا کہ اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔ اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے؟ (اعلیٰ حضرت)

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے جب کہ آپ نے خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو بیٹے سے مشورہ کیا کہ اس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے۔ آپ نے خواب آٹھ ذبح کو دیکھا اور اس ذبح کو ذبح پر عمل کر دیا۔

اب تراجم میں فرق دیکھیں۔ اعلیٰ حضرت نے "سعی" کا معنی کام کرنے کے قابل کیا ہے۔ باقی حضرات نے دوڑنا یا چلنا پھرنا کیا ہے۔ تفاسیر کے حوالے سے

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں ایک دن دیکھا اسی دن تروہ میں رہے کہ کیا واقعی اس پر عمل کرنا ہے۔ دوسرے دن یقین آنے پر تیسرے دن اس پر عمل کیا۔ اور حضرت اسمعیل علیہ السلام کے ذبح کا واقعہ جب درپیش آیا تو آپ کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ مقصد یہ ہے کہ جب خواب دکھی تو اسی وقت ذبح کا واقعہ درپیش آیا۔ یہ نہیں کہ خواب پانچ چھ سال پہلے دکھی ہو اور عمل بعد میں کیا ہو۔

اب اس بات کے سمجھنے کے بعد یہ واضح ہوا کہ یہ خواب والا معاملہ اس وقت درپیش آیا جب کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی اور تیرہ سال کا لڑکا باپ کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اگر معنی چلنے پھرنے والا کیا جائے تو تین سال میں بھی اس پر عمل کرنا ممکن ہے کیونکہ تین سال میں عمر میں لڑکا اچھی طرح چل پھر سکتا ہے اور اگر دوڑنے والا معنی کیا جائے تو پانچ سال کی عمر میں بھی اس پر عمل ہو سکتا ہے کیونکہ پانچ سال کی عمر میں لڑکا اچھی طرح دوڑ سکتا ہے۔ اگر معنی کام کے کیا جائے قابل تو اسی وقت تیرہ سال کی عمر درست ہو سکتی ہے کیونکہ کام کے قابل اس عمر میں ممکن ہے اس سے پہلے صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ اب اس پر تفاسیر کی عبارات پیش کرتا ہوں تاکہ بیان کردہ مضمون کی توثیق ہو سکے:-

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ بَلَغَ اَنْ يَّسْعِيَ مَعَ اَبِيهِ فِي اشْغَالِهِ وَحَاجَتِهِ

وَكَانَ لِذَلِكَ ابْنِ ثَلَاثِ عَشْرَةَ سَنَةً (المختصر من المدارج)

یہ جب وہ اپنے باپ کے ساتھ ان کے کاموں اور حاجتوں میں کام کرنے کے

قابل ہوتے۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ فلما بلغ معه السعی

ای ان یسعی معہ ویعیینہ۔ (جلالین) جب وہ آپ کے ساتھ

کوشش کرنے لگے اور ان کی امداد کرنے لگے یعنی ان کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوئے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ الْمَبْلَغَ الَّذِي يَسْعَى مَعَ اَبِيهِ فِي اَمُورِ دُنْيَاهُ مَعِيْنًا

علیٰ اعمالیہ (جمل) یعنی جب وہ امور دنیا اور معاملات میں اپنے باپ کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوتے۔

تراجم میں دوسرا فرق یہ ہے کہ ماذا تری کا اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "تیری کیا رائے ہے؟" جبکہ دوسرے بعض حضرات نے ترجمہ کیا ہے "تو کیا دیکھتا ہے" مفسرین کرام نے دیکھنے والے معنی کو روک دیا ہے اور رائے والے معنی کو پسند کیا ہے۔ مدارک میں ہے: ماذا تری الراي علی وجہ المشاوسیة لامن رؤیت

العین ولم يشاوسه ليرجم الی رایہ ومشورته ولكن لیعلم ایجنز عام یحسب مشورہ کے طور پر ان سے رائے لی کہ تمہاری کیا رائے ہے تری کو الراي سے لیا ہوا ہے رویت یعنی دیکھنے والا معنی نہیں کہ تم کیا دیکھتے ہو بلکہ معنی یہ ہے کہ تمہاری رائے کیا ہے؛ باقی آپ کا رائے لینا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کے مشورہ اور رائے پر عمل کریں گے بلکہ مشورہ اس لیے تھا تاکہ آپ کا صبر یا بے صبری ظاہر ہو جائے۔ جلالین میں ہے: ماذا تری من الراي

شاوہ لیافس بالذبح وینقاد لاسربہ یعنی تری ماخوذ ہے الراي سے آپ نے مشورہ کیا حضرت اسمعیل علیہ السلام سے تاکہ ان کو ذبح سے انس ہو جائے اور امر کو ماننے کے لیے مطیع ہو جائیں کیونکہ اس پر عمل تو ضروری تھا اس لیے کہ امر جہتی تھا کیونکہ وحیِ خفی سے ثابت تھا روح البعانی میں ہے: ماذا تری من الراي

وانما شاوہ فی ذلک وهو حتم لیعلم ما عندہ۔ یعنی ماذا تری میں تری کو راہی سے لیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمعیل علیہ السلام سے رائے لی کہ تمہاری رائے کیا ہے اور آپ نے ان سے مشورہ صرف اس لیے لیا کہ ان کی رائے بھی ظاہر ہو جائے ورنہ آپ نے اس کام کو ضروری کرنا تھا۔

تغاییر کی مذکورہ بالا عبارات سے ظاہر ہوا کہ اسٹی اور اسی طرح ماذا تری کا جو ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے اس کو تفاسیر کی تائید حاصل ہے اور مقصد بیان کے مطابق

ہونے کی وجہ سے اس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جس کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے
ترجمہ کو حسن و خوبی حاصل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔
عطر آں باشد کہ خود بیوید نہ کہ عطار بگوید

وَتَلَكُمُ الْجَبِيْنُ (پ: ۲۳)

• اور بچھاڑا اس کو ماتھے کے بل (مولانا محمود الحسن)۔
• ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا (مودودی)۔
• اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا (اعلیٰ حضرت)۔
جب کہ اس سے پہلے قلماً اسلماً اچھا ہے جس کا معنی ہے دونوں باپ اور
بیٹے نے اللہ کے حکم کے سامنے گردن جھکالی، دونوں فرماں بردار ہو گئے تو باپ
نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا۔ مطلب یہ ہے کہ جب دونوں باپ اور بیٹا اللہ
تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہوتے اس کی فرمانبرداری میں اس کام کو مکمل کرنے لگے
تو پھر گرانایا بچھاڑنا کیسے؟ اس لیے کہ عرفی معنی بچھاڑنا یا گرانانا کا یہ ہوتا ہے کہ
کسی کو زبردستی گرا دیا جائے لیکن کسی کے فرمانبرداری ہوتے ہوتے اس کو زمین
پر لٹانا ہی ہوتا ہے، بچھاڑنا یا گرانانا مراد نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے اعلیٰ حضرت نے
لٹانا ترجمہ کیا ہے اور یہ معنی ہی حضرت اسمعیل علیہ السلام کی شان کے لائق ہے۔

اِذَا بَقِيَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ (پ: ۲۴)

• جب بھاگ کر ہنچا اس بھری کشتی پر (محمود الحسن)۔
• جس وقت بھاگ گیا طرف کشتی بھری ہوئی کے (شاہ رفیع الدین)۔
• جب بھاگ کر ہنچا اس بھری کشتی پر (شاہ عبدالقادر)۔
• جب کہ بھاگ کر کشتی کے پس ہنچے (مولانا اشرف علی)۔
• اور جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔ (مودودی)

• جب وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے (عبدالماجد)۔
 • جب کہ بھری کشتی کی طرف نکل گیا (اعلیٰ حضرت)۔
 حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے۔ نبی کا بھاگ کر حلا جانانہی کی شان کے لائق نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ وہ بھاگ کر کشتی کی طرف چلے گئے۔ بلکہ آپ نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ کشتی کی طرف نکل گئے، چلے گئے۔ یعنی گویا کہ اعلیٰ حضرت نے اُنق کا ترجمہ کیا ہے کہ وہ نکل گئے۔ باقی حضرات نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ بھاگ گئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کے جانے کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ فظن ان لن نقدر علیہ کے ماتحت تفسیر کبیر کے حوالہ سے بحث گزر چکی ہے کہ آپ کے جانے میں آپ خطا کار نہیں تھے کیونکہ آپ نے اجتہاد سے کام لیا۔ آپ نے یہ خیال کیا کہ شاید مجھے جانے اور رہنے میں ایک جیسا اختیار حاصل ہے۔ آپ رب تعالیٰ سے حکم طلب کرنے کے بغیر اور حکم کے آنے کے انتظار کئے بغیر چلے گئے۔
 اس مقام پر لوگوں نے حضرت یونس علیہ السلام کے بھاگنے والا معنی لے کر کچھ وجہ بیان کی تھی لیکن صاحب کبیر نے اس کو رد کیا۔ بعض حضرات نے آپ کے بھاگنے کو اس سے تعبیر کیا کہ آپ اپنے سید، مالک یعنی اللہ تعالیٰ سے بھاگے۔ لیکن علامہ رازی نے فرمایا کہ یہ بعید بات ہے کہ اللہ کا نبی اللہ ہی سے دور بھاگے اور اس کی مخالفت کرے۔ بعضوں نے کہا تھا کہ آپ کے بھاگنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ تم بتی اسرائیل کی طرف جاؤ لیکن آپ نے اس حکم کو نہ مانا، اس لیے آپ اللہ تعالیٰ کے غضب و غضب سے ڈر کر بھاگے۔

علامہ رازی نے اس کو بھی رد فرما دیا اور کہا کہ یہ بھی بعید ہے۔ اللہ کا نبی ایسا نہیں کر سکتا۔ بعض نے کہا تھا کہ آپ کے بھاگنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی قوم کو تبلیغ کرنی چھوڑ دی تھی لہذا اس کو بھاگنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 لیکن اس کو بھی رد کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جب انبیاء کے کرام کو بھیجا ہی

اسی مقصد کے لیے جانتا ہے تو ان کا تبلیغ کو چھوڑنا ممکن نہیں۔

اب مقصد یہی ثابت ہوا کہ آپ اپنے اجتہاد کی وجہ سے وہاں سے کشتی کی جانب نکل گئے تاکہ یہاں سے نکل سکیں۔ یہ معنی ہی اللہ کے نبی کے منصب کے مطابق ہے کہ آپ بھاگے نہیں، ڈرے نہیں، اللہ کے حکم کو عمداً چھوڑا نہیں۔ ایسی باتیں اللہ کے نبی کی شان کے مناسب نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے نبی کی شان کے لحاظ سے ترجمہ کیا جب کہ باقی حضرات اس مقام کی گہرائیوں کو نہ پاسکے۔

وَآكْبَتْنَا عَلَيْهٖ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنَ (پ: ۲۳، ۲۴)

- اور ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت بھی لگا دیا (عبدالماجد دریا آبادی)
 - اور اگایا ہم نے اس پر ایک درخت بیل کا (شاہ عبدالقادر)۔
 - اور ہم نے ان پر ایک بیلدار درخت بھی اگایا تھا (مولانا اشرف علی)
 - اور اس پر ایک بیلدار درخت اگادیا (مودودی)۔
 - اور ہم نے اس پر کدو کا پٹر اگادیا (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت یونس علیہ السلام جب تھپلی کے پیٹ سے باہر تشریف لائے تو آپ کا جسم نرم اور نحیف ہو گیا تھا۔ آپ پر سایہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر کدو کا درخت اگایا جو آپ پر سایہ کرتا تھا۔ اگرچہ کدو کی بیل ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت اور آپ کے اعجاز کے سبب کدو کو ایک درخت کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اعلیٰ حضرت نے یقین کا ترجمہ کدو کا پٹر کیا ہے اگرچہ یقین کا معنی صرف بیل ہے جیسا کہ شرح المعانی میں ہے کل شجرة لاساق لها فہو یقین یعنی بیل جس میں تنہا نہیں اس کو یقین کہتے ہیں لیکن اس بیل سے مراد کدو ہی ہے۔ اس لیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ بیل سے مراد کدو کی بیل ہے اور وہ بھی اس وقت فقط بیل نہیں محض بلکہ ایک درخت تھا۔

اب روح المعانی سے عبارت پیش کر رہا ہوں جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کدو
کا درخت مُراد ہے یعنی قدرتِ الہی سے اسے درخت بنا دیا گیا تھا:

والمراد به علی ماجاء عن الحسن التستبيط وابن عباس في رواية
وابن مسعود وابي هريرة وعمرو بن ميمون وقتادة وعكرمة
وابن جبير ومجاهد في احدى الروايتين عنهما الدباء وهو القرم
المعروف وكان النبي صلى الله عليه وسلم يحب وانبتها الله تعالى
مظلة عليه لانها تجمع عصا الابرج الظل والملمس وعظم الورق
وان الذباب لا يقع عليها ما قيل وكان عليه السلام لرقعة جلده وبمكة
في بطن العوث يوزيه الذباب ومما سته ما فيه خشونة ويؤلمه
حر الشمس ويستطيب بار الظل فلطف الله تعالى به بذلك
وذكر ان ورق القرم انفع شئ لجن ينسلخ جلده واشتبهت ان
الشجر ما كان على ساق من عود فيشكل تفسير الشجرة هنا بالدبار واجاب
ابو حيان بانه يحتمل ان الله تعالى انبت بها على ساق
لتظله خرقا للعبادة - يعني اس جگہ تقطین سے مراد ان تمام
حضرات کے نزدیک (جن کے اسمائے گرامی عربی عبارت میں موجود ہیں) دبا ہے
دبا سے مراد مشہور و معروف ہے وہ کدو ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پسند
فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام پر اس کو اس لیے اگایا تاکہ
آپ پر سایہ کرے اور آپ کو ٹھنک پہنچائے اور آپ کو اس کے پتے مس کریں اور
اس کے بڑے پتے آپ پر رہیں تاکہ آپ پر ٹھنکیاں یہ پیٹھ سکھیں کیونکہ بیان کیا جاتا ہے
کہ کدو کے پتوں پر ٹھنکیاں نہیں بیٹھتیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کا کھلی کے پیٹ
میں رہنے کی وجہ سے چڑا نرم ہو گیا تھا۔ آپ کے لیے ٹھنکیاں باعث تکلیف بن
سکتی تھیں اور سخت پھیر کا مس کرنا اور سوج کی گرمی آپ کے لیے تکلیف کا باعث
بن سکتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو اس کے سایہ سے آرام

پہنچایا اور بیان کیا جاتا ہے کہ کدو کے پتے اترے ہوئے چڑے کے لیے بھی مفید ہوتے ہیں۔ تو گویا آپ کے لیے بھی مفید تھے۔

اب اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ شجرۃ اور لقطین دونوں کو حج کیا گیا ہے اور مرد کدو لیا ہے حالانکہ کدو کو شجرہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ شجرۃ تو اس درخت کو کہتے ہیں جس میں لکڑی کا تنا ہو حالانکہ کدو کی بیل میں لکڑی کا تنا نہیں ہوتا۔ اس کا جواب ابو حیان نے یہ دیا کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلاف عادت کدو کی بیل کو تنے والا درخت بنا دیا ہوتا کہ سایہ کرے۔ اس مقام پر یہ واضح ہوا کہ مراد کدو کا درخت ہی ہے اور یہی قول مفید ہے اور وہ بھی فقط بیل نہیں رہی تھی بلکہ اس کو تنے والا بنا دیا تھا۔

مدارک میں ہے: قبیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انک لقب القرم قال اجل ہی شجرۃ اخی یونس نبی کریم سے عرض کیا گیا کہ آپ کدو کو پسند کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! اس لیے کہ یہ میرے بھائی یونس کا درخت ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مقصود زیادہ ظاہر ہے۔

لَئِنْ أَشْرَكَتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (پہلے)

• کہ اگر تو نے شریک مان لیا تو اکارت جائیں گے تیرے عمل اور تو ہوگا ٹوٹے میں بڑا (محمود الحسن)۔

• اگر تو نے شریک مانا، اکارت جاویں گے تیرے کئے اور تو ہوگا ٹوٹے میں آما (شاہ عبد القادر)

• اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے۔ (فتح محمد)

• اگر شریک لاوے گا تو البتہ ناپید ہو جاویں گے عمل تیرے (شاعر فیح الدین)

• کہ اے سننے والے! اگر تو نے اللہ کا شریک کیا تو ضرور تیرا سب کیا دھرا

اکارت جائے گا اور ضرورتاً تو بار میں رہے گا (اعلیٰ حضرت)
 اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ”اس سننے والے الفاظ زیادہ گئے ہیں جب کہ دو کئے
 مترجمین نے ایسے الفاظ کی زیادتی نہیں کی۔ حالانکہ زیادتی ضروری تھی کیونکہ بظاہر مطلقاً
 یہ خطاب نبی کریم کو نظر آتا ہے اور نبی کریم سے شرک کا سرزد ہونا ممکن نہیں جب نبی
 کریم صغائر و کبائر سے پاک ہیں تو شرک جیسا جرم عظیم سرزد ہونا محال ہے۔ اور
 مولوی فتح محمد کے ترجمہ میں شرک کی نسبت جمیع انبیائے کرام کی طرف کی گئی ہے لہذا
 یہ بھی درست نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں یہ واضح کر دیا کہ یہ خطاب
 نبی کریم کو نہیں بلکہ آپ کی امت کو ہے اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم کو بھی ہو پھر بھی
 مراد آپ کی امت ہے۔ اور اگر خطاب نبی کریم کو مانا جائے اور مراد بھی آپ ہی لیے
 جاتیں تو بالفرض کے الفاظ نہ آئیں اور ”اس سننے والے“ الفاظ بھی نہ آئیں تو کیسے
 نبی کریم کی طرف اس خطاب کو منسوب کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مفسرین
 کرام نے مذکورہ توجیہات کو بیان کیا ہے اور اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی ان کے مطابق
 ہے۔ جلالین میں ہے :-

لئن اشركت يا محمد فرضاً

اس پر صاوی میں اس طرح ہے :-

فرضا ای علی سبیل التقدير وفرضا المعال

وهو جواب عن سوال مقدر كيف يقع الشرك من

الانبیاء مع عصمتهم وقيل المقصود بالخطاب

اممهم لعصمتهم من ذلك

یعنی اے نبی کریم اگر بالفرض محال آپ شرک ٹھہرائیں۔ صاوی نے بیان کیا

کہ علی سبیل الفرض کیوں کہا ہے؟ اس لیے کہ ایک سوال کا جواب دینا مقصود ہے۔

سوال یہ ہے کہ انبیائے کرام سے شرک کیسے واقع ہو سکتا ہے حالانکہ وہ معصوم

ہوتے ہیں؟ تو اس کا ایک جواب علی سبیل الفرض سے دیا کہ یہ کلام بالفرض پر مبنی

marfat.com

Marfat.com

ہے۔ دوسرا جواب اس کا یہ دیا کہ مقصود اس قسم کے خطاب سے انبیائے کرام نہیں ہوتے بلکہ ان کی امتیں ہوتی ہیں کیونکہ انبیائے کرام تو موصوم ہوتے ہیں۔ مدارک میں ہے۔
 وانما مع هذا الكلام مع علمه تعالى بان رسوله لا يشركون لان الخطاب
 للنبى صلى الله عليه وسلم والمراد به غيره ولانه على سبيل
 الفرض والمحال لا يصح فرضها۔

یعنی یہ کلام صحیح ہے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس کے
 رسول شریک نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم کو ہے لیکن حقیقتاً آپ کی
 امت کو ہے۔ اور یا کلام علی سبیل الفرض ہے اور محالات کو فرض کرنا صحیح ہوتا ہے
 تفسیر مدارک میں اس طرح ہے :- کیف مع هذا الكلام مع علم الله تعالى
 ان رسوله لا يشركون ولا تحبط اعمالهم والجواب ان قوله
 لئن اشركت ليحبطن عملك قضية شرطية و القضية الشرطية
 لا يلزم من صدقها صدق جزأيا الا ترى ان قوله لئن
 لو كانت الخمسة زوجا لكانت منقسمة بمساويين قضية
 صادقة مع ان كل واحد من جزأيا غير صادق قال الله تعالى
 لو كان فيهما الهة الا الله لفسدتا ولم يلزم من
 هنا صدق القول بان فيها الهة وبأنهما
 قد فسدتا۔

یعنی یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کلام کس طرح صحیح ہے جبکہ
 اسے معلوم ہے کہ اس کے رسول نہ شریک کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے اعمال ضائع ہوتے
 ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لئن اشركت
 ليحبطن عملك قضية شرطية ہے اور قضیہ شرطیہ کے سچا ہونے کے لیے یہ
 ضروری نہیں کہ اس کی جزا میں بھی سچی ہوں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمہارا قول لو كانت
 الخمسة زوجا لكانت منقسمة بمساويين اگر پانچ بخت ہوئے

تو برابر برابر کی طرف منقسم ہوں گے) یہ قضیہ سچا ہے حالانکہ اس کی جزائیں سچی نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی لو کان فیہما الہمتہ الامتہ لفسدتا قضیہ شرطیہ ہے اور سچا ہے لیکن اس کے سچا ہونے سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ زمین و آسمان میں متعدد خدا واقع بھی ہوتے ہوں اور فساد لازم آیا بھی ہو یعنی نہ خدا متعدد ہوتے اور نہ فساد لازم آیا۔ اسی طرح یہ کلام بھی بالفرض پر مبنی سے نہ شرک ہو اور عمل کا ضیاع لازم آیا۔ یہ بات بخوبی واضح ہوئی۔ قرآن پاک میں خطابِ نبی کریم کو بلا واسطہ ہے۔ امت کو بلا واسطہ یا خطابِ امت کو ہو گا بلا واسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اور یا خطابِ خود نبی کریم کو ہو گا۔ جب تک کسی قید کا اضافہ نہ کیا جائے ظاہر ہی سمجھا جائے گا کہ خطابِ نبی کریم کو ہے اور شاید نبی سے بھی شرک سرزد ہو سکتا ہے اور عمل ضائع ہو سکتے ہیں۔

عام ذہن رکھنے والے لوگ جو علمی مقام نہیں رکھتے، تفاسیر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی وہ اسی قسم کے تراجم کو دیکھ کر ایسی آیات کا سہارا لے کر خود تو بھٹک جاتے ہیں لیکن غیروں کو بھی بھٹکاتے رہتے ہیں اور یہی اردو تراجم کو دیکھ کر جہلِ مرکب کے مصداقِ علمیت کے دعوے دار، علمائے کرام کے لیے بھی دردِ سر بنے رہتے ہیں۔

لیکن بفضلِ تعالیٰ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھ کر کسی شخص کو اس قسم کا وہم نہیں ہوتا۔ وہ راہِ راست سے بھٹکتا نہیں۔ اس سے بڑھ کر اور ترجمہ کی خوبی کیا ہو سکتی ہے!

وَجِئْتِي بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۰۱)

• اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہو گا (عبدالماجد دریا آبادی)

• اور حاضر آئیں پیغمبر اور گواہ اور فیصلہ ہو ان میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (مولانا محمود الحسن) (شاہ عبدالقادر)۔

• اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جاویں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جاوے گا اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (اشرف علی)۔

• اعتبار اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا (مودودی)۔

• اور رائے جائیں گے انبیاء اور یہ نبی اور اس کی امت ان پر گواہ ہوں گے۔ اور لوگوں میں سچا فیصلہ فرما دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وضاحت کر انبیائے کرام پر گواہی دینے والے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت ہوگی۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت

کے ترجمہ میں یہ وضاحت پائی جاتی ہے کہ وہ فیصلہ لوگوں میں ہوگا یعنی انبیائے کرام کی امتوں میں ہوگا، لیکن صرف اتنا کہنے سے کہ ان میں انصاف ہوگا بات

واضح نہیں ہوتی کہ فیصلہ کن میں ہوگا۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جو وضاحت پائی گئی اس کی تائید میں جلالین کی عبات

ملاحظہ ہو: وجیتی بالنبیین والشہداء ای بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وامتہ

یشہدون والمرسل بالبلدغ۔ یعنی انبیائے کرام کی تبلیغ فرمانے پر کہ اے اللہ انبیائے کرام نے تیرے پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیئے تھے (نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم اور آپ کی امت گواہی دیں گے۔ اسی کو حاشیہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے :- وجیتی بالنبیین اولیٰ دعا علیٰ اممہم انہم بلغوہم

الرسالت وذا لک لان امثہ یجمع الخلافتی الاولین والآخرین فی سعید واحد شریقول الکفار والامم الم یاتکم نذیر فیکفون

ویقولون ما جاءنا من نذیر فیسأل انثہ الانبیاء عن ذالک فیکفون کذبوا قد بلغناہم فیسألہم البیتہ وهو اعلم بہم اقامتہ

لِلْحِجَةِ فَيَقُولُونَ اُمَّتٌ مَّحَمَّدٌ تَشْهَدُونَ فَيُؤْتِيهِمْ اَمْتٌ مَّحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَشْهَدُونَ
لَهُمْ اِنَّهُمْ قَدْ بَلَغُوا فِتْقَانَ اَلْاُمَّمِ الْمَاضِيَةِ مِنْ اِيْنِ عِلْمِهَا وَانْمَا كَانَ بَعْدَ نَافِيَا لِهَذِهِ
الْهَيْئَةِ فَيَقُولُونَ اَرْسَلْتَ الْيَنَابِيسَ سَوَالًا وَانزَلْتَ عَلَيْنَا كِتَابًا وَاخْبَرْتَنَا فِيهِ بِتَبْلِيغِ
الرُّسُلِ وَانْتَ صَادِقٌ فِيمَا اخْبَرْتَنَا ثُمَّ يُؤْتِي بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَسْأَلُ
اَللّٰهُ اُمَّتَهُ فَيُرِيهِمْ كَيْفَ يَشْهَدُ بَعْدَ رُجْعِ الْاَنْبِيَاءِ كَرَامٍ كُوْدِرْبَارِ الْاَلْحِي فِي اِسْ لِيْهِ حَاضِرٌ كَيْفَ جَائِغًا
تَاكُ وَهِيَ اَمْتُوْنَ پَرِ دَعْوَى كَرِيْمٍ كِه اَنْهَوْنَ نِي اِن لُوْكَوْل كُو اَحْكَام مِهْنِي چَا دِيْ هِي۔ يِه
اِس لِيْ كِه اللّٰهُ تَعَالَى اَتَمَام مَخْلُوْق لَكَلْ اُوْر كَھِيْلِيْ لُوْكَوْل كُو اِيْكَ بِلْتَد جَكِيْ پَر حَمَج كَرِيْ كَا
اُوْر كَا فَرُوْنَ كِيْ كُرُوْ هُوْنَ كُو كِهِيْ كَا، كِيَا تَهَا سِيْ پَاس كُو فَيِ ذُرَانِيْ وَ اِيْ نِهِيْ اِيْ
تَهِيْ اُوْر وَه كِهِيْ كِيْ سِيْ پَاس تُو كُو فَيِ ذُرَانِيْ وَ اِيْ نِهِيْ اِيْ، سِيْ پَر اللّٰهُ تَعَالَى
اَنْبِيَاء كَرَام نِيْ اِس كِيْ مَتَعَلَق سَوَال كَرِيْ كَا۔ وَه كِهِيْ كِيْ اِيْ اللّٰهُ اِيْ لُوْ كِيْ جُھُوْطِيْ
هِيْ سِيْ نِيْ تُو اِن كُو تَمَام اَحْكَام مِهْنِي چَا دِيْ تَهِيْ سِيْ پَر اللّٰهُ تَعَالَى اَنْبِيَاء كَرَام
سِيْ گُوَاھ پيش كَرِنِيْ كَا مَطَالِبِيْ كَرِيْ كَا حَالَا نِيْ اِيْ مَعْلُوْم هِيْ كِه اَنْبِيَاء كَرَام نِيْ
تُو تَبْلِيْغ فَرْمَا دِيْ لِيْ كِن اِس مَطَالِبِيْ سِيْ كَا فَرُوْنَ پَر حُجَّت قَائِم كَرِنَا مَقْصُوْد هُوْ كَا۔ لِيْ
اَنْبِيَاء كَرَام نَبِيْ كَرِيْم كِيْ اُمَّت كُو بَطُوْر گُوَاھ پيش كَرِيْ كِيْ جُو اِن كِيْ حَق مِيْ گُوَا هِيْ
دِيْ كِيْ كِه اِيْ اللّٰهُ اِن اَنْبِيَاء كَرَام نِيْ تُو تَبْلِيْغ فَرْمَا دِيْ تَهِيْ تَب وَه سِيْ پَر اُمَّتِيْ
كِهِيْ كِيْ اِيْ اللّٰهُ اِن كُو كِيْ مَعْلُوْم هِيْ۔ يِه لُوْ كِيْ تُو مَلَكِيْ بَعْد اِيْ نِيْ۔ تُو اِس وَتِ
تُو اللّٰهُ تَعَالَى نَبِيْ كَرِيْم كِيْ اُمَّت سِيْ پُوْ جِيْ كَا، تَم نِيْ كِيْ طَرَح گُوَا هِيْ دِيْ هِيْ؟ تُو
يِه لُوْ كِيْ عَرَض كَرِيْ كِيْ اِيْ اللّٰهُ تُو نِيْ هِمَا رِيْ طَرَف رَسُوْل صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُو بِيْجَا
اُوْر هِمَا رِيْ طَرَف بُو اَسْطَر رَسُوْل اللّٰهُ كِتَاب كُو نَا زِل فَرْمَا يَا اُوْر اِس كِتَاب مِيْ تُو نِيْ
هِيْ اَنْبِيَاء كَرَام كِيْ تَبْلِيْغ كِيْ خَبَر دِيْ كِه اَنْبِيَاء كَرَام نِيْ تَبْلِيْغ كِيْ لِيْ كِن اُن كِيْ اُمَّتُوْنَ نِيْ
اِنْكَار كِيْ اُوْر اِيْ اللّٰهُ تِيْ رِيْ خَبَر سَحِيْحِيْ هِيْ۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا جائے گا اور ان سے آپ کی اُمت کے
متعلق سوال ہوگا تو آپ اپنی اُمت کی پاکیزگی کا ذکر فرمائیں گے اور اُمت کی سچائی

کی گواہی دیں گے۔

تو اس طرح کافروں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ ان کو جہنم میں بھیجا ان سے انصاف ہوگا، ظلم نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس کے اہل ہوں گے۔ اب واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں جن گواہوں کا ذکر فرمایا ان سے مراد نبی کریم اور آپ کی امت ہے۔ اس مقصد کو اعلیٰ حضرت کے تقابلیہ میں واضح طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ دیگر تراجم وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کے ترجمہ میں یہ خوبی کامل طور پر پائی جاتی ہے کہ مقصد کو واضح کیا جاتا ہے اور تفاسیر کے مطابق ہوتا ہے جس مقام پر مفسرین کرام مقصد کو سمجھانے کے لیے بعض الفاظ کو نکالتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہوتا ہے۔

ذِي الطَّوْلِ (پط ۶)

مقدور کا صاحب (شاہ عبدالقادر) • مقدور والا (محمود الحسن)

• قدرت والا (مولانا شرف علی) • قدرت والا (عبد الماجد ریا آبادی)

• بڑے انعام والا (اعلیٰ حضرت)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا ذکر فرمایا، ان میں ایک یہ صفت بھی ہے۔

اعلیٰ حضرت نے اس کا معنی کیا ہے ”بڑے انعام والا“ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید جلالین میں دیکھیں :-

ذِي الطَّوْلِ اى الانعام الواسع - يعنى واسع النعام والا، بڑے انعام

والا۔ حاشیہ میں ہے: ذِي الطَّوْلِ اطول بالفتح الافضل يقال فلان

على فلان طول اى زيادة وافضل وسمى الغنى ايضا طولاً لانينال

به من المروات مالا ينال عند الفقر (روح) وفى الصراح طول بالفقر

منت نهادن و غزوفی کردن بر کسی وغالب آمدن در فضل و منت فالطولی

فى اللغة الزيادة والتفضيل والظاهر من امثله انه بالثواب

والانعام وبہذا قال التشارح الانعام الراسم وفسر الاخر وبيان
 المراد ههنا الفضل بترك العقاب المسقف یعنی لفظ طول کے طاء
 پر زبر ہے اور اس کا معنی زیادتی فضیلت ہے جس طرح کہا جاتا ہے لفلان
 علی فلان طول۔ اس کا یہ معنی ہوتا ہے کہ فلاں کو فلاں پر برائی اور
 فضیلت ہے۔ اسی وجہ سے غنی کو بھی ذوالطول کہا جاتا ہے کیونکہ جو مروت
 اس سے حاصل ہو سکتی ہے وہ فقیر سے نہیں ہو سکتی۔ اور صراح میں سے طول
 ظاہر کی زبر کی صورت میں اس معنی میں آتا ہے، کسی پر احسان کرنا، کسی کا کسی پر
 فضیلت حاصل کرنا، کسی کا کسی پر فضیلت میں غالب آنا۔ طول کا لغوی معنی
 زیادتی اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت میں ظاہر ہی ہے کہ اس کا
 معنی ثواب اور انعام عطا کرنا۔ اسی وجہ سے شارح نے بڑے انعام والا معنی کیا
 ہے۔ اور حضرات نے یہ تفسیر بھی کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
 عذاب کے مستحقین سے عذاب کو ترک فرما کر ان پر اپنا فضل فرماتا ہے۔ کبیر میں ہے
 ذی الطول ای ذی التفضیل یقال طال علینا طولاً ای
 تفضل علینا تفضلاً۔ یعنی ذوالطول کا معنی صاحب تفضل ہے کہا جاتا
 ہے۔ طال علینا طولاً اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو ہم پر فضیلت حاصل ہے
 ائحضرت کا ترجمہ صحیح ہے اور مقصد بھی یہی ہے۔

مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَيِّمٍ وَلَا سَفِيحٍ يُطَاعُ (پا ۲۶)

• کوئی نہیں گنہگاروں کا دوست اور نہ سفارش کہ جس کی بات مانی جائے۔

(محمود الحسن)

• کوئی نہیں گنہگاروں کا دوست اور نہ کوئی سفارش (شاہ عبدالقادر)

• اور ظالموں کا نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارش جس کا کہا مانا جائے

(اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت نے ظالمین کے ترجمہ میں بھی لفظ ظالموں کو ہی استعمال کیا ہے یعنی ظالموں کا نہ کوئی دوست ہو گا نہ سفارش کیونکہ ظلم کا اطلاق شرک پر بھی ہے : ان الشریک لظلم عظیم - بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے اور ترجمہ میں ظالم کو لانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ظالمین سے مراد مشرکین، کافرین ہیں۔ لیکن گنہ گار کہنے میں حرج ہے کہ شاید کسی گنہ گار کا کوئی سفارشی، شفاعت کرنے والا نہیں ہو گا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ پہلے دو مرتبہ مسئلہ شفاعت کو ذکر کیا جا چکا ہے اور اس آیت کریمہ کی تفسیر میں بھی علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ گنہ گاروں کے لیے شفاعت کے منکر معتزلہ ہیں : احمق اکثر الہ حنزلتہ فی نفع الشفاعت عن المذنبین بقولہ تعالیٰ ما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع قالوا نفی حصول شفیع لہم یطاع فوجب ان لا یحصل لہم ہذا الشفیع - اجاب اصحابنا عنہ من وجہ الاول انہ تعالیٰ نفی ان یحصل لہم شفیع یطاع و ہذا الایات علی نفی الشفیع الاثری انک اذا قلت ما عندی کتاب یباع فہذا یقتضی نفی کتاب یباع ولا یقتضی نفی کتاب یعنی اکثر معتزلہ نے اس آیت کریمہ ما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع سے دلیل پکڑی ہے کہ گنہ گاروں کے لیے شفاعت نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب ایسا شفیع جس کی بات مانی جائے اس کی نفی ثابت ہوئی تو اس سے پتا چلا کہ کوئی شفیع نہیں ہو گا۔ اس کا جواب کسی وجہ سے دیا گیا ہے : ایک یہ ہے کہ یہاں نفی اس شفیع کی ہے جس کی بات کو مانا جائے۔ اس سے مطلقاً شفیع کی نفی نہیں کی تھیں معلوم نہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے پاس کوئی کتاب نہیں جس کو بیچا جائے تو اس کلام سے کتاب کی نفی نہیں بلکہ کتاب کے بیچنے کی نفی ہے۔

اس کا دوسرا جواب علامہ رازی نے اس طرح دیا ہے : ان المراد من الظالمین ہمنا الکفار والدلیل علیہ ان ہذہ الایۃ و...

فی زجر الکفار الذین یجادون فی آیات اللہ فوجیب ان یکرہن مختصاً بہم وعندنا انہ لا شفاعة
فی حق الکفر یعنی اس آیت میں ظالموں سے مراد کفار ہیں اور دلیل اس پر یہ ہے کہ یہ
آیت کفار کو زجر و توبیح کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ جن کفار کا ذکر اللہ تعالیٰ نے
فی آیات اللہ (وہ جو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں) میں ہے۔ پس
واجب ہے کہ یہ آیت ان کے ساتھ ہی مختص ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ہی ہے کہ شفاعت
کافروں کے لیے نہیں ہوگی۔

اس سے واضح ہوا کہ مطلقاً گناہ کار کہنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، البتہ ظالم
کہنے سے مقصد حاصل ہے کیونکہ ظالم سے مراد خود اللہ تعالیٰ نے کافر ہی لیے ہیں۔

وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ (پ ۲۶۸)

• اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اس پر پڑے گا (عبدالماجد دریا آبادی)
• اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس کے جھوٹ کا ضرر اسی کو ہوگا (فتح محمد)۔
• اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ (محمود الحسن)۔

• " " " " (شاہ عبدالقادر)۔

• اگر وہ جھوٹا ہی ہو تو اس کا جھوٹ اس پر پڑے گا (اشرف علی)۔

• اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پڑے گا (مودودی)۔

• اور اگر بالفرض وہ غلط کہتے ہیں تو ان کی غلط گوئی کا وبال ان پر (حضرت

علی حضرت کے ترجمہ پر خود قرآنی پاک شاہد ہے کیونکہ اس آیت کریمہ کا مکمل مفہوم

یہ ہے کہ آل فرعون سے ایک شخص جو ایمان کو چھپاتا تھا، اس نے کہا، کیا تم اس

شخص کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ بے شک وہ تمہارے رب

کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیل لایا ہے۔ اگر وہ بالفرض جھوٹے ہیں تو ان کی

غلط گوئی کا وبال ان پر، اور اگر وہ سچ کہتے ہیں تو جس کا تمہیں وعدہ دیتے ہیں

تمہیں بھی بعض پہنچ جائے گا۔

اب قرآن پاک سے ہی واضح طور پر یہ سمجھ میں آ گیا کہ یہ کلام اس شخص کی ہے جو درپردہ ایمان رکھتا تھا اور کلام موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے۔ لہذا یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ وہ شخص جو ایمان دار تھا وہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حقیقتاً یہ خیال کرتا تھا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر پڑیگا جھوٹ۔ بلکہ اس کا مطلب ہی تھا کہ اگر وہ بالفرض غلط کہتے ہیں تو غلط کہنے کا وبال ان پر۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ حقیقت اور ادبِ ہر مہربانی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (پہلے)

- تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان (مولانا محمود الحسن)۔
- " " " " " (شاہ عبدالقادر)۔
- آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے۔ (مولانا اشرف علی)
- تمہیں کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے (مودودی)۔
- (نزولِ وحی سے پہلے) آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا چیز ہے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔
- اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکامِ شرع کی تفصیل (اعلیٰ حضرت)
- اس مقام پر تمام مترجمین نے نزولِ وحی سے قبل ایمان کے علم کی بھی نفی کر دی کہ نبی کریم وحی سے پہلے ایمان کو نہیں جانتے تھے۔ یعنی آپ کو پتا ہی نہیں تھا کہ ایمان کیا چیز ہے۔ حالانکہ نبی کریم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کہیں: **وَأَنَا أَوْلُ الْمَسْلُومِينَ** کہ میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کو ماننے والا ہوں۔ صاوی میں ہے: **ان الأولیۃ بالنسبۃ لعالم ضہی حقیقتہ**۔ یعنی آپ فی الواقع حقیقتاً سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننے والے تھے۔ اس سے پتا چلا کہ آپ ایمان کو تو پہلے سے ہی جانتے تھے۔ یہ کہنا کہ

آپ وحی سے پہلے ایمان بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے، یہ غلط ہے۔
جلالین میں ہے : وَلَا اِيْمَانَ اِي شِرَاطِئِهِ وَمَعَالِمِهِ لِيَعْنِي اِيْمَانُ
سے مراد احکام شرع کی تفصیل ہے۔

انخطیب میں ہے : وَاِنْ كَانَ قَبْلَ النُّبُوَّةِ قَدْ كَانَ يَمُوقِرُ اَبُو اَحَدِ الثَّمِيَّةِ
امثہ تعالیٰ وعظمت یعنی ایمان کا معنی احکام شرع کی تفصیل کیوں کیا ہے
اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے قبل بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
وعظمت کا اقرار فرماتے تھے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ

روپہ ۲۵ (۶)

- اور نہیں ہے کسی آدمی کو کہ بات کرے اس سے اللہ مگر وحی میں ڈال کر یا
پچھے پردے کے سے (شاہ رفیع الدین)۔
- یہ کسی بشر کا مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر ہاں یا تو وحی سے یا
کسی اڑے سے (عبدالماجد دریا آبادی)۔
- اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے
ذریعے سے یا پردے کے پچھے سے (فتح محمد)
- اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارے سے
یا پردہ کے پچھے سے (مولانا محمود الحسن)۔
- اور کسی آدمی کی حد نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارے سے یا
پردہ کے پچھے سے (شاہ عبدالقادر)۔
- کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمائے مگر یا تو الہام
سے یا حجاب کے باہر سے (مولانا اشرف علی)۔
- کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے۔ اس

کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے
(مودودی)

اور کسی آدمی کو نہیں پہنچتا کہ اللہ اس سے کلام فرمائے مگر وحی کے طور پر
یا یونکہ وہ بشر پر وہ عظمت کے ادھر ہو (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں تراجم میں فرق یہ ہے کہ باقی حضرات نے ترجمہ یہ پیش کیا ہے کہ اللہ
تعالیٰ پردے کے پیچھے سے کلام کرتا ہے یا یہ کہا ہے کہ حجاب کے باہر سے لیکن
اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "یا یونکہ پردہ عظمت کے ادھر ہو" اعلیٰ حضرت کا
ترجمہ ایک اعتراض کو اٹھا رہا ہے جو علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کر کے پھر
اس کا جواب دیا ہے تفسیر کبیر میں جو ذکر کیا گیا ہے اس کا اہم حاصل یہ ہے :-

قوله تعالى او من وراء حجاب وانما يصم ذلك لو كان مختصا
بمكان معين وجهة معينة والجواب ان ظاهر اللفظ وان او هم
ما ذكرتم الا انه دللت الدلائل العقلية والنقلية على ان تعالى
يتمتع حصوله في المكان والجهة فوجب حمل هذا اللفظ على
التاويل والمعنى ان الرجل اذا سمع كلاما مع انه لا يرى ذلك المتكلم
كان ذلك شبيها بما اذا تكلم من وراء حجاب والعشابهة بسبب لجواز اللجاء
یہاں اعتراض یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد او من وراء حجاب یہ اس
وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ایک معین مکان سے اور ایک معین جہت سے مختص
ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ مکان و جہت سے پاک ہے تو یہ کیسے صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہر الفاظ سے تو اگرچہ ایسا ہی وہم ہوتا ہے جیسا تم
نے ذکر کیا ہے لیکن عقلی اور نقلی دلائل اس پر دال ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مکان و
جہت ثابت کرنا منع ہے۔ اس لیے اس لفظ کی تاویل ضروری ہے۔ اب بعد از
تاویل معنی یہ ہو گا کہ جب کوئی شخص کلام کو سنتے اور متکلم کو نہ دیکھتا ہو تو اس کو
مثبت حاصل ہے۔ اس سے جو پردے کے پیچھے سے کلام کرے اور شائبہ

مجاز کے جواز کا سبب ہے۔

علامہ رازی کی اس تقریر سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے سے کلام نہیں فرماتا اور نہ اس کی شان کے لائق ہے کہ وہ پردے کے پیچھے ہو۔ البتہ انسان جو اس کو نہ دیکھ سکے تو وہ سمجھتا ہے کہ گویا وہ پردے کے پیچھے ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں کہ وہ بشر پر وہ عظمت کے ادھر ہو یعنی انسان خود اللہ تعالیٰ کے پردہ نہ عظمت کے ایک طرف ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ انسان سے پردے میں کلام فرماتا ہے جب اس کا پردے میں ہوتا جائز نہیں تو یہ ترجمہ کرتا کہ وہ پردے سے پیچھے کلام کرتا ہے، یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ (پہلے)

• کہہ اگر ہوتی واسطے رحمن کے اولاد، پس میں پہلا عبادت کرنے والا ہوں۔

(شاہ رفیع الدین)

• ان سے کہو اگر واقعی رحمان کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا (مودودی)۔

• کہہ دو اگر خدا کے اولاد ہوتیں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوں (فتح محمد)

• تو کہہ اگر ہو رحمن کے واسطے اولاد تو میں سب سے پہلے پوجوں (محمود الحسن)

• " " " " " " (شاہ عبدالقادر)

• آپ کہیے کہ اگر خدائے رحمن کی اولاد ہو تو سب سے اول اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں۔ (مولانا اشرف علی)۔

• آپ کہہ دیجیے اگر خدائے رحمن کی اولاد ہو تو سب سے اول عبادت کرنے والا تو میں ہوں (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• تم فرماؤ بغرض مجال رحمن کے کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں پوجتا (علی شہ)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں بفرض مجال کے الفاظ نہیں جب کہ دیگر تراجم میں نہیں۔
 صحیح بھی یہی ہے کہ بفرض مجال کی قید ہونی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد
 ہے کہ : مَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَانِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا - سُبْحَانَ مَنْ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ -
 اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ جب اس کی اولاد کا ہونا ممکن ہی نہیں تو پھر یہی
 صحیح ہے کہ یہ کلام بفرض مجال پر مبنی ہے۔

خیال ہے کہ عربی کے قواعد و ضوابط سے باخبر آدمی جو تفاسیر سے بھی باخبر
 ہے اسے اردو ترجمہ کے سہارا کی بھی ضرورت نہیں اور جو اردو تراجم کا محتاج ہے
 اس سے اس قسم کے مقامات پر جب صحیح راستہ کی نشاندہی نہ کی جائے تو اس کا راہِ راست
 سے بھٹک جانا عین ممکن ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں تفسیر مدارک کی عبارت دیکھیں جو اس طرح ہے :
 وَهَذَا كَلَامٌ وَارِدٌ عَلَى سَبِيلِ الْفَهْمِ وَالْمُرَادُ نَفْيُ الْوَلَدِ وَذَلِكَ لِأَنَّهُ عَلَّقَ الْعِبَادَةَ
 بِكَيْفِيَّةِ الْوَلَدِ وَهِيَ مَحَالٌ فِي نَفْسِهَا فَكَانَ الْمَعْلُوقُ بِهَا
 مَحَالٌ مِثْلَهَا - یعنی یہ کلام بفرض مجال کے طریقہ پر وارد ہے اور مراد
 نَفْيُ وُلْدٍ ہے کیونکہ عبادت کو اولاد کے ہونے پر معلق کیا ہے۔ اور اولاد کا ہونا فی
 ذاتہا محال ہے جو اس کے ساتھ معلق ہے وہ بھی اسی طرح محال ہوگا۔ جلالین

میں ہے : قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ لَفَرَضْنَا قَنَاقًا وَآلَ الْعَابِدِينَ
 لِلْوَلَدِ لَكِنْ ثَبَتَ أَنْ لَا وُلْدَ لِلتَّعَالَى فَاتَّعَبْتَ عِبَادَتَهُ لِيَعْنِيَ آيَةُ فَرَادِي كَمَا كَرِهَ الْبَاطِنُ
 رَجْمًا كَا كَوْنِي بِيَوْمٍ هُوَ تَوَسُّبٌ مِنْ أَسْمَاءِ كَوْنِي بِيَوْمٍ هُوَ تَوَسُّبٌ ثَابِتٌ
 ہے کہ اس کی اولاد نہیں تو اس کی اولاد کی عبادت بھی خود بخود منسفی ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا حسن و کمال ظاہر ہے۔ اٹھتے بیٹھتے توحید، توحید کے
 نعرے لگانے والے شانِ انوریت کو بھی اس طرح نہ سمجھ سکے جس طرح ایک
 محبِ مصطفیٰ نے سمجھا۔ حبِ مصطفیٰ ہی تو باعثِ علم و فضل و کمال اور شرطِ
 توحید ہے۔

إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (پہلے)

- ہم ہیں کہ سنانے والے اس میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا (محمود الحسن)
- " " " " " " (شاہ عبدالقادر)
- بے شک ہم ہیں ڈر سنانے والے اس میں بانٹ دیا جاتا ہے ہر حکمت والا کام (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر تراجم میں فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے مندرین کا ترجمہ ڈر سنانے والے کیلئے ہے جبکہ دیگر حضرات نے "کہہ سنانے والے" کیلئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ لغت اور تفاسیر کے مطابق۔ دوسرے تراجم لغت اور تفاسیر سے دور ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے کل امر حکیم کا ترجمہ کیا ہے "ہر حکمت والا کام" جب کہ دیگر مترجمین نے ترجمہ کیا ہے "ہر کام جانچا ہوا"۔ یہ معنی بھی لغوی نہیں اور نہ ہی تفاسیر اس کی تائید کرتی ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تفاسیر میں مدارک کی عبارت پیش کی جا رہی ہے :-
 كَمَا نَزَّلْنَا نَازِلًا مِّنْ سَمَاءٍ مِّنَ السَّمَاءِ لِنُنذِرَ الَّذِينَ يُكْفِرُونَ وَيُنذِرَ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ
 وَكَانَ نَزْلُهَا آيَاتٍ فِي هَذِهِ السَّبِيلَةِ خَصِصُوا لَهَا مِنْ نَزْلِ الْقُرْآنِ مِنْ
 الْأَمْرِ الْحَكِيمِ وَهَذِهِ السَّبِيلَةُ مَفْرُوقٌ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ وَمَعْنَى يُفْرَقُ
 يُفَصَّلُ وَيَكْتَبُ كُلُّ أَمْرٍ مِنْ أَرْزَاقِ الْعِبَادِ وَاجَالِهِمْ وَجَمِيمٍ أَمْرٍ
 مِنْ هَذِهِ السَّبِيلَةِ إِلَى لَيْلَةِ الْقَدْرِ الَّتِي تَجِي فِي السَّنَةِ
 الْمُسْتَقْبَلَةِ حَكِيمٌ ذِي حِكْمَةٍ أَيْ مَفْصُولٌ عَلَى مَا يَقْتَضِيهِ
 الْحِكْمَةُ وَهُوَ مِنَ الْأَسْنَادِ الْمَجَازِي لِأَنَّ الْحَكِيمَ صِفَةُ صَاحِبِ
 الْأَمْرِ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَوَصْفِ الْأَمْرِ بِمَجَازٍ -

یعنی اللہ تعالیٰ کی اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ تعالیٰ نے فرمایا: قرآن
 ہم نے اتارا اور ہماری ہی شان ہے کہ ہم عذاب سے ڈرائیں۔ اور قرآن پاک

اس رات (لیلیۃ القدر یا لیلیۃ البرأت) کو ہی ہم نے اس لیے اتارا کہ قرآن پاک کا اتارنا حکمت والے کاموں میں سے ایک کام ہے اور تمام حکمت والے کام اس رات کو ملتے جاتے ہیں کیونکہ یُفَرِّقُ کا معنی بانٹنا جانا، علیحدہ کیا جانا۔ بندوں کے تمام امور رزق، اجل، آئندہ سال اس رات کے آنے تک لکھے جاتے ہیں حکیم کا معنی حکمت والا۔ یہاں ابر کو حکمت والا مجازاً کہا گیا ہے کیونکہ حقیقت میں حکیم صاحبِ امر اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: - کل امر حکم حکیم فالعکیم معناه ذوالحکمة وذالک لان تخصیص اللہ تعالیٰ کل احد بحالته معین من العمر والرزق والوجل والسعادة والشقاوة یدل علی حکمتہ بالغتہ لئلا یغفل فیما کان من تلك الافعال والاقضية دالۃ علی حکمتہ فاعلمها وصفته بکونہا حکمیۃ وهذا من الاسناد المجازی لان الحکیم صفتہ صاحب الامر علی الحقیقۃ ووصف الامر بہ مجاز -

یعنی کُلُّ امرِ حکیم میں حکیم کا معنی حکمت والا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے ایک حال کو معین کیا۔ ہر ایک کی عمر، رزق، اجل، نیک سنجتی، بد سنجتی، کو خاص کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی کامل حکمت پر دال ہے جب کہ یہ افعال اور فیصلے فاعل کی حکمت پر دال ہیں تو ان کو بھی حکمت والے کہا جائیگا۔ البتہ یہ اسناد مجازی ہے کیونکہ حکیم صاحبِ امر کی صفت ہے اور امور کو حکمت سے متصف کرنا مجاز ہے۔

تفاسیر کے بیان سے یہ واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مترجم کی علمی بصیرت کو روز روشن کی طرح ظاہر کر رہا ہے۔

وَاسْتَغْفِرْ لِدَنِّكَ وَاللُّسُوْسِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ اِلٰہِہٖم

اور بخش ماہگ واسطے گناہ اپنے کے اور واسطے ایمان والوں کے اور

ایمان والیوں کے (شاہ رفیع الدین)۔

• اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی

(فتح محمد)

• اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی (مولانا مودودی)۔

• اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایمان دار مردوں اور عورتوں کے لیے (محمود الحسن)۔

• اور معافی مانگ اپنے گناہ کو اور ایمان دار مردوں کو اور عورتوں کو (شاہ عبدالقادر)۔
اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لیے (مولانا اشرف علی)۔

• اور اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سارے ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے بھی (عبدالماجد وریا آبادی)۔

• اور اے محبوب! اپنے قاصوں اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر مترجمین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گناہوں کی نسبت کی ہے کہ آپ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! یہ سب غلط ہے۔ نبی گنہگار نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کرنے کے بعد گناہوں کی معافی مانگیں لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں گناہوں کی نسبت نبی کریم کے خصوصی اہل قرابت کی طرف ہے نبی کریم کی طرف نہیں۔ حق تو یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کی علمیت اور آپ کے ترجمہ کی برتری کا اقرار کیا جاتا اور کہا جاتا کہ اگرچہ نظریات کا اختلاف ہے لیکن مولانا احمد رضا خان یرویلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا ترجمہ مبنی بر حقیقت ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ان الفاظ کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔

” اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگ ” ایسا بے بنیاد ترجمہ ہے جس سے کلام الہی کے روح کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل بریلوی نے الفاظِ قرآنی سے بالکل ہٹ کر اس کا ترجمہ عام مردوں و عورتوں وغیرہ کر کے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ اگر ایسے ہی اپنی مرضی سے جو شخص قرآنی مفہوم متعین کرنے لگے تو قرآن کی امتیازی حیثیت کس طرح برقرار رکھے گی۔“

مترجمین کے اس اعتراض کا اندفاع اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی تفاسیر کے حوالے سے پیش کی جا رہی ہے کہ یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کی اپنی اختراع نہیں بلکہ تفاسیر سے منقول ہے۔ اگر کسی کی علمیت کا محور ہی اردو تراجم یا اردو تفسیر بیان القرآن ہو تو اس کا اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی سے بے خبر رہنا حقیقت ہے۔ اس کی علمی کمزوری کا ہم انکار نہیں کرتے۔ اب خیال یہ کیا جائے کہ ذنب کی نسبت نبی کریم کی طرف جو بظاہر نظر آتی ہے اس کی مفسرین کرام نے مختلف تاویلات پیش کی ہیں جس سے یہ واضح ہے کہ اس کا معنی اردو زبان میں گناہ کرنا غلط ہے کیونکہ عام آدمی اتنا ہی جانتا ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں، صغیرہ اور کبیرہ۔ جبکہ انبیائے کرام صغائر اور کبائر سے پاک ہیں تو پھر گناہ کی نسبت کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔

مرقاۃ باب الایمان یا القدر میں بیان کیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نخواست اور معصیت کی نسبت صرف بمعنی مخالفت کے ہے اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں۔ اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے: لعصمة الانبياء من الكبائر والصغائر قبل النبوة وبعدھا۔ یعنی انبیائے کرام نبوت سے پہلے اور بعد میں بھی تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

تفسیر کبیر میں علامہ رازی فرماتے ہیں :-

۱۔ لو صدر الذنب عنهم لكانوا اقل درجة من عصاة الامة و ذلك غير جائز ولا يجوز ان يكون النبي اقل حالاً من عدول الامة۔

۲۔ لو صدر الذنب عن النبي فلا يكون مقبول الشهادة لقوله تعالى ان

ان جاء كمر فاسق بنبا، فتبينوا الكنه مقبول التمهاده لقول
تعالى ويكون الرسول عليكم شهيدا -

۳ - ان محمدا صلى الله عليه وسلم ليراني بالمعصية لوجب
علينا الاقتداء به فيها لقوله تعالى فاتبعوني فيفضي الى
الجمع بين الحرمة والوجوب وهو محال واذ اثبت ذلك في
حق محمد صلى الله عليه وسلم ثبت ايضا في سائر الانبياء -

۴ - قوله تعالى انهم كانوا ايسار عوث في الغيبرات ولفظ الغيبرات للعموم
فيتناول الكل ويدخل فيه فعل ما ينبغي وترك ما لا ينبغي فثبت
ان الانبياء كانوا فاعلين لكل ما ينبغي فعله وتاركين كل ما
ينبغي تركه وذلك يتنافى صدور الذنب عنهم -

۵ - انه تعالى قسم الخلق قسمين فقال اولئك حزب الشيطان الا ان
حزب الشيطان هم الخاسرون - وقال في الصنف الاخر اولئك
حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون ولا شك ان حزب
الشيطان - هو الذي يفعل ما يرتضيه الشيطان
والذي يرتضيه الشيطان هو المعصية فكل من عصا الله
تعالى كان من حزب الشيطان فلو صدرت المعصية
من الرسول لصدق عليه انه من حزب الشيطان ويصدق عليه
انه من الخاسرون ويصدق على زهاد الامت انهم من حزب
الله وانهم من المفلحين فحينئذ يكون ذلك الواحد من
الامة افضل بكثير عند الله من ذلك الرسول وهذا لا يقوله المسلم
۶ - ان الرسول افضل من الملائكة فوجب ان لا يصدق الذنب
عن الرسول لانه تعالى وصف الملائكة بتترك الذنب فقال
لا يعصون الله ما امرهم وينعلون ما امرهم فلو صدرت

المعصية عن الرسول لا مستتم كونه افضل من الملك لقوله تعالى
 ام نجعل الدين اسنوا و عملوا الصلحتا المفسدين في الارض لم نجعل التغير
 كالنصار - (المختصر من الكبير - الجزء الاول في ذكر آدم)

تفسیر کبیر میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے عصمتِ انبیاء پر بہت سے دلائل
 قائم کئے۔ ان میں سے چند بطور خاص نقل کئے گئے ہیں :-
 ۱۔ ایک دلیل یہ ہے : اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو نبی اپنی امت کے گنہگاروں
 سے بھی کم درجہ ہوگا کیونکہ جتنا مقرب ہو اسی طرح اس کے گناہ بھی بہ نسبت عوام
 کے بڑے سمجھے جائیں گے۔ اور یہ جائز نہیں کیونکہ نبی تو اپنی امت کے برگزیدہ
 آدمیوں سے بھی کم درجہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اور یہ دلیل دی گئی ہے کہ اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو نبی کی شہادت قبول
 نہیں ہو سکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر قاصق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس
 کی تفتیش کر لیا کرو حالانکہ نبی کریم تو مقبول شہادت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
 گرامی ہے : ویکون الرسول علیکم شہیدا۔ اور نبی کریم آخرت میں تم پر گواہ
 ہوں گے۔

۳۔ اور یہ دلیل دی گئی کہ اگر نبی کریم سے گناہ سرزد ہو تو ہمیں بھی اس گناہ میں
 آپ کی اقتدار لازم ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَاتَّبِعُونِي" یعنی نبی کریم سے
 امت کو کہلوایا کہ تم میری تابعداری کرو۔ اس طرح عورت اور وجوب جمع ہو جائیں
 گے اور یہ تو محال ہے۔

۴۔ اور دلیل اس طرح ذکر کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام کی تعریف اس
 طرح کی ہے کہ وہ خیرات میں جلدی کرتے ہیں خیرات کا لفظ عام ہے۔ کل کو شامل
 ہے جس کام کا کرنا اچھا ہے اس کو کرنا یا جس کام کا کرنا اچھا نہیں اس کو چھوڑنا۔
 اس سے پتا چلا کہ انبیائے کرام بھلائی کے کام کرتے ہیں اور بُرے کاموں کو
 چھوڑتے ہیں جب اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کی تعریف فرماتا ہے تو ان سے گناہ کا

سرزد ہونا منع ہے۔

۵۔ اسی طرح اور لیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو دو قسموں پر منقسم فرمایا۔ ایک گروہ کو شیطان کی جماعت کہا ہے کہ شیطان کی جماعت خسارے میں اور دوسری جماعت کو اللہ کی جماعت کہا ہے کہ اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے۔ شیطان کی جماعت تو یقیناً وہ ہوگی جو وہ کام کرے گی جس کو شیطان پسند کرتا ہے اور شیطان تو گناہوں کو پسند کرتا ہے۔ جو شخص گناہ کرے گا، اللہ کی نافرمانی کرے گا اور یہی شیطانی گروہ میں داخل ہوگا۔ اگر انبیائے کرام سے بھی گناہ سرزد ہو تو مساوا ان پر شیطانی گروہ میں داخل ہونا سچا آئے گا اور ان کا خسارے میں ہونا لازم آئے اور یقیناً امت کے نیک لوگ اللہ کے گروہ میں ہونگے۔ تو امتی کا نبی سے اس کے نزدیک زیادہ مرتبہ ہونا لازم آئے گا۔ اس کا کوئی مسلمان قائل نہیں ہو سکتا اب اس بیان کے بعد واضح ہوا کہ انبیائے کرام تمام صغائر و کبائر گناہوں سے پاک ہیں۔ لہذا ایسا ترجمہ "کہ معافی مانگ لئے گناہ کے واسطے" کتنا ہی حقیقت سے دور ہے۔ انبیائے کرام کی شان کا سچا نہیں کیا گیا۔ اردو ترجمہ بھی وہی صحیح ہو سکتا ہے جس سے مفسرین کرام کی پیش کردہ تاویلات واضح سمجھ آئیں اپنے غلط تراجم کو صحیح کرنے کی کوشش میں گمراہ کن الزامات اور حد سے تجاوز اور یہ کہنا کہ اعلیٰ حضرت نے غلط ترجمہ کیا ہے اور اس ترجمہ میں گناہ کیا ہے۔ یہ بہت بڑا الزام ہے۔ اپنی بے علمی کا واضح اعلان کر دیا۔ گویا دوسرے لغظوں میں تو یوں کہا گیا ہے کہ ہمیں صرف مخالفت کے پیش نظر اعتراض کرنا آتا ہے اور الزام تراشی ہمارا وطیرہ ہے۔ تفاسیر کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا، کتب کی ورق گردانی، عرق ریزی یہ کام ہم سے مشکل ہے۔ کیونکہ ہم سمجھنے کی اہلیت سے عاری ہیں۔

آئیے! اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفسیر کبریٰ کے آئینہ میں دیکھیں۔ علامہ رازی اس آیت کریمہ کی توجیہات میں بیان فرماتے ہیں :- وقال بعض المناس
لذنبك اي لذنب اهل بيتك وللمؤمنين وللمؤمنات

ای الذین یسوا منک باہل بیتک - یعنی اس میں ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لذتک سے مراد اہل بیت کے گناہ ہیں (اگرچہ اس سے مراد بھی خلاف اولے کا ارتکاب) آپ اپنے اہل بیت اور مومن مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی مغفرت طلب کریں۔

اب علامہ رازی کے اس بیان کے بعد کسی کو ہوش نہ آئے اور عناد کی کدورت کو دل سے نہ نکالے اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو غلط کہے تو اس پر کیا اعتراض کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ انبیائے کرام کو بھی لوگوں نے جادو کر اور جھوٹے کہہ دیا ہے۔ اب تفسیر کبیر کی بھی عبارت کو سامنے رکھ کر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں اور اے محبوب! اپنے خاص اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔ تو کتنا صحیح ترجمہ نظر آئے گا اور نبی کریم کی شان کے عین مطابق سمجھ آئے گا۔ اگرچہ اس کی اور توجیہات بھی پیش کی گئی ہیں لیکن اردو میں اسکا ترجمہ بھی یہ نہیں کہ آپ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔

مفسرین کرام کی پیش کردہ توجیہات کو دیکھ کر خود اندازہ کریں کہ ترجمہ کیا ہونا چاہیے: وجعل الاستغفار کتایہ: عما یلزم من التواضع وھضم النفس والاعتراف بالتقصیر لانہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم و مغفور ہونے کے باوجود مجزا نہ طور پر استغفار کرتے رہتے تھے کیونکہ خود نبی کریم کا ارشاد ہے: ما اصحبت غداة قط الا استغفرت اللہ فیہا مائة مرة۔ کوئی ایسی صبح ہرگز نہیں آئی کہ جس میں میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک سو مرتبہ استغفار نہ کی ہو۔

اب اس تاویل کے مطابق اردو ترجمہ یہ ہوگا کہ اے نبی کریم آپ استغفر اللہ پڑھتے رہا کیجئے (یہ آپ کے مدارج کی باندی کا سبب ہے)۔ دوسری توجیہ یہ پیش کی گئی ہے:

وقد ذكروا ان النبي غاف
كل لحظة عرجا الى مقام اعلى مما كان
فيه فيكون ما عرج منه في نظر الشريف
ذنب بالنسبة الى ما عرج اليه فيستغفرو
منه وحنوا على ذلك قوله عليه السلام وانه
ليغان على قلبي - (العديث)

(انہ لیغان علی قلبی وانی لا استغفر اسثہ کل یوم مائتہ
مرة) (روح المعانی)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدارج میں لخطہ یہ لخطہ عروج تھا اور آپ
جن مدارج سے دوسرے مدارج کی طرف ترقی فرماتے تو آپ کے دل میں ایک
خشش سی پیدا ہوتی۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے
دل میں ایک پیکس اور ٹرپ سی ہوتی ہے تو میں ہر دن ایک سو مرتبہ استغفار
کرتا ہوں۔

اب اس تاویل کے مطابق اردو ترجمہ یہ مناسب ہوگا کہ اے محبوب!
آپ اپنے مدارج کی بلندی کے لیے استغفار (دعا) کرتے رہیں۔
تفاسیر کے اس بیان ذی شان سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا ذی شان ہوتا
اظہر من الشمس ہوا۔ اور ایسا ترجمہ کرنا جس میں نبی کریم کو معاذ اللہ گنہگار ٹھہرایا
جائے۔ ہزار عیبوں سے ہی ایک عیب بڑا ہے۔

اللهم ثبتنا على حب رسول الله
صلواته عليه وسلم -

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (پ ۲۶)

تاکہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے
 تو کہ بختے واسطے تیرے خدا جو کچھ ہوا تھا پہلے گناہوں تیرے سے
 اور جو کچھ پیچھے ہوا۔ (شاہ رفیع الدین)

تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے
 (مولانا محمود الحسن)

تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے
 (شاہ عبدالقادر)

تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے (مولانا اشرف علی)

تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے (موردی)

تاکہ اللہ آپ کی (سب) اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے (عبدالماجد دریا آبادی)

تاکہ اللہ تمہارے سب سے گناہ بخٹے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے

پچھلوں کے۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر بھی اعلیٰ حضرت نے گناہوں کی نسبت نبی کریم کی طرف

نہیں کی۔ یہ ترجمہ نہیں کیا کہ تمہارے اگلے پچھلے گناہ بخش دے۔ لیکن دوسرے

حضرات نے نبی کریم کو معاذ اللہ گناہگار ٹھہراتے ہوئے ترجمہ کیا تاکہ تمہارے

اگلے پچھلے گناہ، خطائیں، کوتاہی معاف کر دے۔ پھر اپنے غلط تراجم پر اترتے

ہوتے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ان الفاظ سے موردِ طعن و تشنیع بنایا گیا، اس آیت

میں تمہارے اگلے پچھلے کا لفظ مولانا بریلوی کی ذاتی اختراع ہے، سبحان اللہ

کیا سارق اور شاطر کہ اپنے غلط تراجم کے عیوب پر پردہ ڈالنے کیلئے اعلیٰ حضرت کے

ترجمہ کو موردِ الزام ٹھہرایا لیکن ایسی فریب کاریوں سے مسلمانوں کو دھوکا میں نہیں ڈالا

جاسکتا۔ کیونکہ سب مسلمان عصمتِ انبیاء کو جانتے ہیں کہ انبیاء کرام سے گناہ سرزد نہیں ہوتے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذاتی اختراع کہنے والے اگر تفاسیر کو دیکھنے کی تکلیف کرتے تو یہ بہتان نہ باندھتے اور جرمِ عظیم کا از کتاب نہ کرتے۔ آئیے اگر تفاسیر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں تو میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید پر تفاسیر کی عبارات پیش کر کے مطلب سمجھادیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ضد اور عناد کی کدورت کو دل سے نکالے اور ربِ قدوس تمہیں سمجھنے کی توفیق دے۔

جلالین میں ہے وهو مؤول لعصمة الانبياء عليهم الصلوة والسلام

کہ یہ آیت کریمہ اپنے ظاہر پر نہیں کہ نبی کریم کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے بلکہ اس آیت کریمہ کی ضروری طور پر تاویل کی جائے گی۔ اس لئے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں ان سے گناہ نہیں ہوتے۔ جب وہ گناہ نہیں کرتے تو اگلے پچھلے گناہوں کے معاف کرنے کا کوئی مقصد نہیں جبکہ جلالین کے مطابق آیت کریمہ کی تاویل ضروری ہے تو وہ تاویل کیا ہوگی وهو مؤول ای اسناد الذنب لہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤول اما بان المراد ذنوب امتك (صاوی) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنوب کی نسبت مؤول ہے اس کی تاویل ضروری ہے وہ تاویلیں کہی ہیں لیکن ان میں سے ایک ہے کہ ذنوب سے مراد نبی کریم کے عقائد، ذنوب نہیں بلکہ امت کے ذنوب ہیں۔ البتہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور فرمائیں کہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشتے تمہارے اگلوں اور پچھلوں کے۔ صاوی کی اس تاویل کے کتنا ہی مطابق ہے یعنی آپ کی اہمیت کے بعد میں آنیوالے لوگ اور تمہارے زمانے کے لوگ جو نسبت بعد میں آنیوالوں کے اگلے ہیں تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ ان تمام کے گناہ بخشتے اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے لم یکن للنبي ذنوب فماذا یغفر لہ قلنا الجواب من وجوه احدھا المراد ذنوب المومنین یعنی تفسیر کبیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم کے گناہ جب نہیں ہیں تو گناہوں کے معاف کر نیکیا کیا مطلب اور یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ تاکہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔ تو فرماتے ہیں اس کا جواب

کئی وجہ سے دیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ گناہوں سے مراد مومنوں کے گناہ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب سے تمہارے اگلوں اور پھلوں کے گناہ معاف فرما دے۔ کمالین میں اسی طرح پیش کیا گیا ہے وعن بعض ما تقدم هو ذنب ابوليث آدم وحواء ما اخرج ذنوب امتك یعنی بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ما تقدم سے مراد ذنب آدم وحواء ہے اور ما اخرج سے مراد آپ کی امت کے ذنوب ہیں اگرچہ یہاں بھی یہ ترجمہ کرنا صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب سے آپ کے اگلوں اور پھلوں کے ذنوب معاف فرمائے لیکن خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس تاویل کے مطابق جو تفسیر کبیر اور صاوی سے پیش کی جا چکی ہے کمالین کی اس تاویل کے مطابق نہیں کیونکہ جمیع انبیاء کرام معصوم ہیں اس لئے اس تاویل کے مطابق بھی اردو زبان میں آپ کے اگلوں اور پھلوں کے گناہ معاف فرما دے درست نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی یہ بھول تھی گناہ نہیں تھا البتہ اس تاویل کو اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر جو اعتراض اس طرح کیا ہے کہ لگے اور پھلے مولانا بریلوی کی ذاتی اختراع ہے ان کو سمجھایا جاسکے کہ یہ اختراع نہیں بلکہ تفسیر کا بیان ہے سمجھنے کے لئے علمیت ضروری ہے مذکورہ بالا تفسیر کے بیان کی روشنی میں صاحب ایمان کو یہ سمجھنے میں کوئی استحالہ درپیش نہیں کہ انبیاء کرام معصوم ہیں لہذا یہ گناہ غلط ہے کہ نبی کریم کے اگلے اور پھلے گناہ معاف کرنے کا ذکر ہے بلکہ آپ کی امت کے اگلے اور پھلے لوگوں کے گناہ معاف کرنے کا ذکر ہے۔ مدارج النبوة میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں صغائر و کبار گناہوں سے پاک ہیں آپ فرماتے ہیں لیخفرك الله ما تقدم من ذنوبك وما اخرج احوال درینجا بسیار است یعنی گفتہ اند مراد چیز نیست کہ واقع شدہ جاہت پیش از نبوت و امامت سبکی گفتہ این مردود است زیرا کہ نبود پیغمبر خدا را صلی اللہ علیہ وسلم جاہت و صلی اللہ علیہ وسلم معصوم است پیش از نبوت و بعد از وہ سے زنجیری در کشف الغائب و بیضاوی نیز درینجا توجیہ فرماتے ہیں کہ مراد جمیع انبیاء و پیغمبروں کی طرف سے گناہوں کا نہ ہونا ہے۔

محل عتاب گردد و امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی گفتہ کہ اس قول نیز مردود است بوجہ ثبوت عصمت انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین و تحقیق اجماع کردہ اندامت در عصمت ایشان و انہاں کہ تجویز صفا کر دند نصی و دلیل ندارند برآں بلکہ از ہمیں آیت و امثال آن گرفتہ اند۔ (مختصر از مدارج) یعنی اس آیت کریمہ میں کئی اقوال ہیں۔ بعض نے یہ کہا کہ یہاں وہ خطائیں مراد ہیں جو نبوت سے قبل واقع ہوئیں لیکن امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو رد فرمایا اور کہا کہ یہ قول مردود ہے کیونکہ نبی کریم نے کوئی زمانہ بھی جاہلیت میں نہیں گزارا بلکہ آپ نبوت سے پہلے اور بعد موصوم ہیں۔ آپ سے کوئی گناہ قبل از نبوت یا بعد از نبوت نہیں سرزد ہوا۔ زنجبیری نے کشاف میں ذکر کیا ہے اور علامہ بیضاوی نے بھی اس کی تائید اسی کی ہے اور کہا ہے کہ یہاں سے مراد وہ لغزشیں ہیں جو محل عتاب ہیں لیکن امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بھی رد فرمایا کہ یہ قول بھی مردود ہے کیونکہ انبیاء کرام کی موصومیت پر امت کا اجماع ہے اس کے بعد شیخ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے نبی کریم سے صفا کر گناہوں کے واقع ہونے کو جائز قرار دیا ہے ان کے پاس کوئی دلیل اور نص نہیں بلکہ وہ اسی آیت کریمہ یا اس قسم کی مثل آیتوں سے دلیل پکڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اب شیخ کی اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی ظاہر و باہر ہو گئی۔ فقط آپ کا ترجمہ ہی عصمت نبی الانبیاء پر دال ہے جبکہ دیگر تراجم سے نبی کریم کا گناہ ہونا اور گناہوں کی بخشش کے ذکر کا اظہار ہوتا ہے۔

فتویٰ برکینہ (۲۱۲)

تو وہ اپنے بل بوتے پر اکر گیا۔
 تو اس نے اپنی جماعت کے گھنڈہ پر منہ موڑ لیا۔
 پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر۔
 پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر۔

marfat.com

Marfat.com

(مردود)

(فتح محمد)

(مولانا محمود الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

لیکن اس نے اپنی قوت کے زعم میں ہر تابی کی۔ (عبدالماجد دریا آبادی)
 تو اپنے لشکر سمیت پھر گیا۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر فرعون کا ذکر ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے دعوت
 حق دی تو وہ ایمان لانے سے بے بسچ اپنے لشکر کے پھر گیا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی
 یہی ہے اس پر جلالین کی عبارت دیکھیں جو اس طرح ہے۔ فتویٰ ای اعرض
 عن الایمان بمرکت مع جنودہ لانہم لہ کالرکن
 یعنی اسے ایمان لانے سے اعراض کیا بمع اپنے لشکر کے کیونکہ لشکر کے لوگ
 اس کے ارکان تھے مع جنودہ یشیر الی ان الباء بمعنی مع الرکن الجند
 لانہم کالرکن ما یرکن الیہ الانسان من مال وولد یعنی لفظ مع ذکر کیا گیا
 ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بار بمعنی مع کے ہے اور رکن سے مراد لشکر
 ہے کیونکہ لشکر بھی رکن کی طرح ہی ہے۔ تفسیر کبیر میں بھی ایک وجہ یہ بیان کی گئی
 ہے والرکن اشارۃ الی القوم کانہ تعالیٰ یقول اعرض مع قومہ
 یعنی رکن سے مراد فرعون کی قوم ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی کلام کا یہ معنی ہے اعراض
 مع قومہ اپنے لشکر سمیت پھر گیا۔ روح المعانی میں بھی ایک وجہ یہ بیان ہے
 وقال قتادہ ثولی بقومہ علی ان الرکن بمعنی القوم لانہ یرکن
 الیہم ویقفوی بہم اس نے اپنی قوم سمیت منہ پھیرا کیونکہ رکن بمعنی قوم کے ہے
 کیونکہ انسان ان کی طرف میلان کرتا ہے اور ان سے قوت حاصل کرتا ہے۔
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تفاسیر زیادہ دال ہیں اور مقصد کے مطابق آپ کا ترجمہ ہی ہے۔ اگرچہ
 قوت و زور والا معنی بھی ملتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی واضح ہے مولانا مودودی
 صاحب کا ترجمہ فقط لفاظی پر مبنی ہے نیز مولوی فتح محمد صاحب کے ترجمہ میں گھنٹ
 کسی عربی لفظ کا معنی نہیں ہے۔

وَالنَّجْمُ إِذَا هَوَىٰ

تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے

قسم تارے کی جب گرے

قسم ہے تارے کی جب گرے

قسم ہے تارے کی جب گرے

قسم ہے ستارہ کی جب وہ مغرب ہونے لگا۔

قسم ہے تارے کی جب وہ مغرب ہوا۔

قسم ہے ستارہ کی جب وہ ڈوبنے لگے۔

(فتح محمد)

(شاہ رفیع الدین)

(محمود الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(مولانا اشرف علی)

(موزودی)

(عبدالماجد دریا آبادی)

اس پیارے چمکے تارے محمد کی قسم جب یہ معراج سے اترے (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہوی سے مراد آپ کے معراج سے واپس نزول فرمانا

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید روح المعانی سے ملتی ہے وقل جعفر الصادق

رضی اللہ تعالیٰ عنہ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو یہ نزولہ من السماء لیلۃ المعراج وجوز

علیٰ هذا ان یروا بھویہ صعودہ وعرجہ علی الصلوة والسلام الی منقطع الامین

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم ہیں اور ہوی سے مراد آپ کا شب معراج آسمانوں سے نزول فرمانا

ہے اور فرماتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ہوی سے مراد آپ کا آسمانوں پر

وہاں تک عروج فرمانا جہاں مکان کی حدود ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تفسیر

سراج المنیر میں ہے وقل جعفر الصادق یحییٰ بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل

من السماء لیلۃ المعراج والھوی المنزول ہوی بھوی ہویا

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ النجم سے مراد محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جبکہ آپ نے آسمانوں سے شب معراج کو نزول فرمایا

الھوی کا معنی اترنا ہے اس سے ہوی بھوی ہویا ہے البحر المحیط میں

ہے وذلٰل بن جبیر الصادق هو النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو یہ نزولہ لیلۃ المعراج

حضرت ابن جریر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور صہوی سے مراد آپ کا شب معراج کو اترنا ہے۔ الجامع لا یحکم البیان بقربی میں اسی طرح ہے والنجم یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اذا ہوی اذا نزل من السماء لیلۃ المکواج النجم سے مراد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جب آپ نے شب معراج کو آسمانوں سے نزول فرمایا۔

ان مذکورہ بالا تفاسیر کی عبارات سے یہ واضح ہوا کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کو تارے سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ لیکن انہوں نے کہ تفاسیر کو دیکھنے کی تکلیف کے بغیر ہی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو طعن و تشنیع کا نشانہ ان الفاظ میں بنایا گیا ہے۔ والنجم اذا ہوی اس آیت میں نجم کا معنی اے پیارے چمکتے تارے سے مراد غلط اور من گھڑت ہے۔ معترض کے اعتراض سے اس کا یہ مطلب ہوا کہ جتنی تفاسیر کا ادراک کر گیا ہے وہ سب غلط اور من گھڑت ہیں۔ خدا سمجھنے کی توفیق دے۔ حالانکہ اس سورۃ طیبہ میں نبی کریم کے معراج کو ہی بیان کیا گیا ہے آپ کا قریب ہونا اور بیدار باری تعالیٰ سے محترم ہونا۔ گویا کہ انیوالا بیان بھی اس پر دلیل ہے کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ ہی پیارے چمکتے تارے ہیں۔ معترض صاحب کی علمیت کا اندازہ تو یہاں سے ہی ہو جاتا ہے کہ اعتراض کرتے ہوئے نجم بغیر الف لام کے ذکر کیا ہے حالانکہ الف لام اس پر لازم ہے بغیر الف لام کے نجم سے تارے کے معنی میں نہیں آتا بلکہ تھوڑا حصہ اور عام تارے کے معنی دیتا ہے اس کے بعد انیوالی آیات کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے اس طرح فرمایا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج کی رات نبی کریم کو رب قدوس کا بہت زیادہ قرب حاصل ہوا جو بلا کیف صورت تھی۔ اسی طرح رب تعالیٰ کو بلا کیف آپ نے دیکھا، مشاہدہ فرمایا۔ پہلے تو آپ چند آیات کے تراجم کا فرق دیکھیں پھر ان پر تفاسیر کی رائے۔

عَلَمَةُ شَدِيدِ الْقُوَى ذُومِرَّةٌ فَاسْتَوَى

اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے زور آورنے پھر سیدھا بیٹھا۔

(مولانا محمد الحسن)

ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا یعنی جبرائیل طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آتے۔

(فتح محمد)

اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے زور آورنے پھر سیدھا بیٹھا۔

(شاہ عبدالقادر)

ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے پیدائشی طاقتور ہے وہ فرشتہ اصلی صورت میں نمودار ہوا۔

(مولانا اشرف علی)

انہیں بڑی قوت والا (فرشتہ) سکھاتا ہے پیدائشی طاقتور پھر وہ اصلی صورت پر ظاہر ہوا۔

(عبدالماجد دریا آبادی)

انہیں سکھایا سخت قوتوں والے طاقتور نے پھر اس جلوہ نے قصد فرمایا

(اعلیٰ حضرت)

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى

پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا۔

پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا۔

پھر وہ فرشتہ نزدیک آیا۔

پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا۔

پھر وہ نزدیک ہوا اور زیادہ نزدیک ہوا۔

پھر قریب ہوا اور آگے بڑھے۔

پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا اور خوب اتر آیا۔

(مولانا محمود الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(مولانا اشرف علی)

(مورودی)

(عبدالماجد دریا آبادی)

(فتح محمد)

(اعلیٰ حضرت)

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (پ ۶)

پھر رہ گیا فرق دو کان کی برابر یا اس سے بھی نزدیک - (محمود الحسن)
 تو دو کان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم - (فتح محمد)
 پھر رہ گیا فرق دو کان کا میان یا اس سے بھی نزدیک - (شاہ عبدالقادر)
 پھر اور نزدیک آیا سو دو کانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم - (اشرف علی)
 یہاں تک کہ دو کانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا (موردی)
 سو دو کانوں کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم - (عبدالماجد دریا آبادی)
 تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم
 (اعلیٰ حضرت)

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ (پ ۶)

اور اس نے اس کو دیکھا اترتے ہوئے ایک بار اور بھی - (مولانا محمود الحسن)
 انہوں نے اسی کو ایک اور بار بھی دیکھا - (فتح محمد)
 اور اسی کو اس نے دیکھا ہے ایک دوسرے تارے میں (شاہ عبدالقادر)
 اور انہوں نے اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے (مولانا اشرف علی)
 اور ایک دفعہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو اترتے دیکھا (موردی)
 اور انہوں نے اس (فرشتہ) کو ایک بار اور بھی دیکھا ہے -
 (عبدالماجد دریا آبادی)

انہوں نے تو وہ جلوہ دوبار دیکھا - (اعلیٰ حضرت)

ان مذکورہ بالا آیات مبارکہ کے ترجمے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ
 اعلیٰ حضرت نے واقعہ معراج مراد لیا ہے اور رب تعالیٰ کے قریب ہونا
 اور اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا مراد لیا ہے جبکہ دیگر مترجمین نے جبرائیل کی ملاقات

مراد لی ہے۔ اگرچہ تفاسیر میں اس کا ذکر بھی ہے لیکن راجح قول وہی ہے جو اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے ظاہر ہے۔ دوسرا قول مرجوح ہے۔ تفسیر طبری میں ہے ثم دنا فتدلی وقال اخرون بل معنی ذلك ثم دنا الرب من محمد صلى الله عليه وسلم فتدلی حدثنا يحيى بن سعيد الاموي قال حدثنا محمد بن عمرو عن ابي سلمة عن ابن عباس ثم دنا فتدلی قال دنی رب فتدلی حدثنا الربیع قال حدثنا ابن وهب عن سليمان بن بلال عن شريك بن ابی نمر قال سمعت انس بن مالك يحدثنا عن ليلة المسرى برسول الله صلى الله عليه وسلم انه عرج جبرائيل برسول الله صلى الله عليه وسلم الى السماء السابق ثم غلب به بما لا يعلم الى الله حتى جاء سدرة المنتهى ودنا الجبار رب العزة فتدلی حتى كان منه قاب قوسين او ادنى فاوحى الله اليه فيها وحي خمسين صلوة على امتك كل يوم وليلة وذكر الحديث

تفسیر طبری نے اس طرح بیان کیا کہ ثم دنا فتدلی سے مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نبی کریم کے قریب ہوا اور زیادہ قریب ہوا (چونکہ رب تعالیٰ کا قرب بلا کیف تھا اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا پھر وہ جلو نزدیک ہوا پھر وہ خوب اتر آیا) حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم کے معراج کی رات کا ذکر فرمایا کہ جبرائیل امین نبی کریم کو ساتویں آسمان تک اوپر لے گئے پھر آپ کو اور اتنی بلندی حاصل ہوئی جس کو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کو سدرۃ المنتہی پر رب قدوس کے جلوے کا قرب حاصل ہوا وہ اتنا زیادہ قرب حاصل ہوا کہ محبوب اور اس کے جلوے میں دو ہاتھ کا

فاسد رہ گیا یا اس سے بھی کم تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے لئے ہر رات اور دن میں سچا سچ نمازوں کا حکم فرمایا آپ کو وحی فرمائی تفسیر مظہری میں ہے

قال البغوی روينا في قصة المعراج عن شريك بن عبد الله بن انس وروى الجبار بن الرب العزة فتدلى حتى كان منه صلى الله عليه وسلم قاب قوسين أو أدنى

یعنی حضرت عبداللہ بن انس نے نبی کریم کے واقعہ معراج میں یہ بیان کیا کہ نبی کریم کو رب کے جلوے کا اتنا زیادہ قرب حاصل ہوا یہاں تک کہ نبی کریم اور اس جلوے میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا یا اس سے بھی کم۔

تفسیر القطر بی میں ہے وعن ابن عباس ایضاً فی قولہ تعالیٰ شردنا فتدلى ان معناه ان الله تبارك وتعالى دنا من محمد صلى الله عليه وسلم فتدلى یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شردنا فتدلی کا معنی یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا جلوہ نبی کریم کے قریب ہوا۔ پھر اور زیادہ قریب ہوا۔ اسی موضوع (کہ نبی کریم کو رب کا قرب حاصل ہوا اور اللہ کا بلا کیف دیدار کیا) کو مفسر قرآن مفکر اسلام حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب مدظلہ العالی نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں بڑی بساطت سے بیان فرمایا۔ مکمل تفسیر کوئی دیکھنا چاہے تو تفسیر ضیاء القرآن کا مطالعہ کرے انشاء اللہ منصف مزاج کے دل کو تسکین ہوگی لہذا اس میں سے کچھ حصہ من وعن پیش کر رہا ہوں تاکہ اس موضوع کو سمجھنا آسان ہو جائے عن ابن عباس ما کذب الغواد ومارای ولقد مرأه نزلت اخذی قال ساء بغوادہ مرتین رواہ مسلم

ترجمہ حضرت ابن عباس نے ان آیات کے بارے میں فرمایا کہ حضور نے اپنے رب کا دیدار اپنے دل کی آنکھوں سے دو مرتبہ کیا۔ امام ترمذی روایت کرتے ہیں قال ابن عباس رأی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ربہ قال عكرمة قلت اليس الله يقول لا تدركه الابصار
وهو يدرك الابصار قال ويحك ذلك اذا تجلج بنوره
الذي هو بنوره وقد رأى رب مرتين ترجمہ
حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
رب کا دیدار کیا۔ عکرمہ (آپ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیا
اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں لا تدرك الابصار وهو يدرك
الابصار کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں آپ نے فرمایا انہوں
تم سبھی نہیں یہ اس وقت ہے جبکہ وہ اس نور کے ساتھ تجلی فرماتے جو اس
کا نور ہے حضور نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث
دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

ابن عمر دریں سند مراجعت ہوئے کردہ پر سید کہ صل رأی
محمد ربہ پس گفت راہ پس ابن عمر تسلیم نمودہ و قطعاً براہ
تردد انکار زرفتہ۔ (اشعة اللغات چہارم ص ۱۳۱)

ترجمہ حضرت ابن عمر نے حضرت ابن عباس سے اس سند کے
بائے میں رجوع کیا اور پوچھا کیا حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا تو اپنے کہا ہاں آپ نے دیکھا تھا
ابن عمر نے ان کے اس قول کو تسلیم کیا اور تردد و انکار کا راستہ اختیار
نہیں کیا۔ علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری میں مندرجہ جزیل روایات
نقل کرتے ہیں روی ابن خزیمہ باسناد قوی عن
النس قال رأی محمد ربہ وبہ قال سائر اصحاب
ابن عباس و کعب الاخبار والزہری و صاحبہ
معمر۔ ترجمہ ابن خزیمہ قوی سند سے حضرت انس رضی
اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے کہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے اپنے رب کو دیکھا اسی طرح ابن عباس کے شاگرد کعب اخبار نبوی

اور مکر کہا کرتے تھے۔ اخرج النسائی باسناد صحیح و صحیحہ الحاکم ایضاً من طریق حکرمہ عن ابن عباس ان تجبون ان تكون الخلة لابراهيم والكلام لموسی والروية لمحمد صلى الله تعالى عليه وسلم۔ یہ روایت نسائی نے سند صحیح کے ساتھ اور حاکم نے بھی صحیح کے ساتھ حکرمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباس سے نفع کی ہے۔ آپ کہا کرتے کہ کیا تم لوگ اس پر تعجب کرتے ہو کہ خلت کا مقام ابراہیم علیہ السلام کے لئے اور کلام کا شرف موسیٰ علیہ السلام کے لئے اور دیدار کی سعادت محمد رسول اللہ کیلئے ہو۔ امام مسلم حضرت ابو ذر سے روایت کرتے ہیں۔ قال سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم هل آيت ربك قال نعم اراه اس لفظ کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے نورانی اراہ اور دوسرا نورانی اراہ پہلی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا۔ ابو ذر کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے آپ نے فرمایا وہ نور ہے میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ سر پائو ہے میں نے اسے دیکھا۔ مسلم کے اسی صفحہ پر ایک روایت ہے۔ عن عبد الله بن شقيق قال قلت لابي ذر لو سأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فسألته فقال عن اى شئ كنت تسأله قال كنت اسأله هل آيت ربك قال ابو ذر قد سألته فقال رأيت نوراً کہ میں نے نور دیکھا ہے یہ روایت بھی دوسری توجیہ کی تائید کرتی ہے۔

حكى عبدالنذاق عن معمر عن الحسن انه حلف ان محمد رأى رب

(عمدة القاسمی ص ۱۹۸ جلد ۱۹)

حسن بصری اس بات پر قسم کھاتے تھے کہ حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا و اخرج ابن خزيمة عن عروة بن زبير اثباتاً عروة بن زبير سے ابن خزيمة نے نقل کیا ہے کہ وہ بھی روایت کے قائل تھے۔ علامہ ابن حجر نے امام احمد کے بارے میں لکھا۔ فروى الخلال فى كتاب السنة

عن المروزی قلت لا حمد انهم یقولون ان عائشہ قالت
من رحمہ ان محمد راى ربہ وقد ابعظم على الله الفریة فباى
شیء یرفع قولها قال بقول النبی صلی الله تعالی علیه وسلم
رأیت ربی - قول النبی صلی الله تعالی علیه وسلم اکبر من
قولها - (فتح الباری ص ۲۹۲ جلد ۸) ترجمہ

مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں ام المومنین یہ کہا
کرتیں کہ جس نے یہ کہا کہ حضور نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ
پر بڑا بہتان باندھا ہے۔ تو حضرت عائشہ کے قول کا کیا جواب دیا جائے گا آپ نے
فرمایا حضور کے اس ارشاد کے ساتھ روایت ربی کہ میں نے اپنے رب کو دیکھا
حضرت عائشہ کے قول کا جواب دیں گے۔ اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا
ارشاد حضرت عائشہ کے قول سے بہت بڑا ہے یہ مختلف اقوال ہیں جو قائلین روایت
کی طرف سے بطور استدلال پیش کئے جاتے ہیں ان میں قول صحابہ مثلاً ابن عباس
کوب۔ احبار۔ انس، ابی ذر کے علاوہ کبار تابعین عروہ، بن زبیر، حسن بصری، عکرمہ
جیسے اکابر تابعین بھی موجود ہیں حضرت امام احمد کا قول بھی آپ پر چپکے میں ان اقوال
کے علاوہ متعدد احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں ان تمام دلائل کو بالتفصیل پیش
کرنیکے بعد علامہ نووی لکھتے ہیں

فی اثبات الرؤیہ وجب العمد علی اثباتها فانها لیست مما یدرك
بالعقل ویؤخذ بالظن فانما یتلقى بالسماع ولا یتجزأ احد
ان یظن بابن عباس انہ متکلم بهذه المسئلة بالظن

والاجتهاد ثم ان ابن عباس اثبت شیئا۔ نفاہ غیرہ والمثبت
مقدم علی النافی۔ ترجمہ۔ حضرت ابن عباس سے جب صحیح روایات ثبوت

کو پہنچ گئیں کہ انہوں نے ایسا کہا ہے تو اب ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ آپ نے
اتنی بڑی بات محض اپنے قیاس اور ظن کے بنا پر کہی ہو تو یقیناً انہوں نے کسی

مرفوع حدیث کی بنا پر ایسا کہا ہوگا نیز ابن عباس ایک چیز کو ثابت کر رہے ہیں دوسرے حضرات نفی کر رہے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ مثبت کا قول نافی پر مقدم ہوتا ہے علامہ کلام کو علامہ نووی اس طرح بیان کرتے ہیں۔ الحاصل ان الیراجح عند اکثر العلماء ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رأی ربہ بعینیہ واسہ لیتنا الاسراء و هذا مما لا ینبغی ان یتشکک فیہ۔ کہ حاصل بحث یہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شب معراج اللہ تعالیٰ کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا اور اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں علامہ نووی نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت صدیق نے اپنے موقف کی تائید میں کوئی حدیث مرفوع پیش نہیں کی لیکن بعض نے اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لیا اس پر علامہ ابن حجر نے کہا کہ صحیح مسلم جس کی شرح علامہ نووی کر رہے ہیں اسی کے لگے صفحے پر حدیث مرفوع موجود ہے ام المؤمنین نے فرمایا کہ میں ولقد راہ بالافق المبین اور ولقد راہ نزلة النبی کے بارے میں حضور سے پوچھا تو حضور نے فرمایا وہ جبرائیل امین تھے جب مسلم میں یہ حدیث موجود ہے تو تیرت ہے کہ شارح مسلم علامہ نووی نے کیسے انکار کیا

علامہ ابن حجر کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت صدیق نے ولقد راہ بالافق المبین کے بارے میں حضور سے استفسار کیا اور حضور نے فرمایا کہ وہ جبرائیل ہیں اور یہ بلاشبہ درست ہے کیونکہ یہ آیت بڑی بگور کی ہے اور وہاں حضرت جبرائیل کا ہی ذکر ہے۔ ارشاد ہے وانہ لقول رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع ثامین وما صاحبکم بمجنون ولقد راہ بالافق المبین۔ یہ سارا ذکر جبرائیل امین کا ہے ہم پہلے بتاتے ہیں (ضیاء القرآن میں دیکھیں) کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں ان کی اصلی صورت

دیکھنے کی خواہش کی تو آپ آسمان کے افق پر نمودار ہوئے۔ وہ افق جہاں جبرائیل نمودار ہوئے اسے افق مبین کہا گیا ہے لیکن یہاں جس افق کا ذکر ہو رہا وہ ہو بالا افق لاعلیٰ ہے۔ آسمان اور زمین کے افق کو افق مبین تو کہہ سکتے ہیں لیکن افق اعلیٰ وہ ہو گا جو تمام آفاق سے بلند تر ہو یعنی فلک الافلاک کا کنارہ۔ اس لئے امام نووی کا قول ہی درست ہے کہ شب معراج نفی روایت کے بارے میں کوئی حدیث مرفوعہ نہیں ہے علامہ سید محمد آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تشریح و تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد دیدار الہی کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کو یوں پیش کرتے ہیں وانا اقول بروایت صلی اللہ علیہ وسلم ربہ سبحانہ و بदनوہ منہ سبحان علی الوجہ اللائق (روح المعانی) اور میں یہ کہتا ہوں کہ سرور عالم اپنے رب کریم کے دیدار سے مشرف ہوئے اور حضور کو قرب الہی نصیب ہوا لیکن اس طرح جیسے اس کی شان کبریائی کے لائق ہے حضرت امام محمد بن جنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب دریافت کیا جاتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپ جواب میں فرماتے رہ راہ حتیٰ ینقطع نفسہ (روح المعانی) ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ یہ جملہ اتنی بار دہراتے کہ آپ کا سانس ٹوٹ جاتا مولانا سید النور شاہ شمشیری صاحب اس مسئلے پر مکمل بحث کر نیکی بعد رقمطراز ہیں ولکنہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم مشرف بروایتہ تعالیٰ ومن علیہ رب بہا وکرمہ وتفضل علیہ بنو الہ و افاض علیہ من افضالہ فراہ فراہ کما قال احمد رحمۃ اللہ مرتین الا انہ راہ کما یرى الحبيب الى الحبيب والعبد الى مولاه لاهو یملاک ان یکف عنہ نظرو ولا هو یستطیع ان یشخص الیہ بصرہ و هو قولہ تعالیٰ ما زاغ البصر وما طغى (فیض الباری شرح البخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیدار الہی سے مشرف ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس دولت سرمدی سے آپ کو نوازا اور اپنے فضل و احسان سے عزت افزائی پس حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا جس طرح امام احمد نے فرمایا ہے مگر یہ دیدار الیسا تھا جیسے حبیب اپنے حبیب کا دیدار کرتا ہے نہ کہ وہ آنکھیں بند کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ کھلی بانہ کھڑے دلدار کو دیکھتا رہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے۔ ما سوا غم البصر وما طغی (انتہی)

مندرجہ بالا مضمون کی وضاحت سے یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کو تارا کہا گیا ہے لہذا پیارا چمکتا ہوا تارا کہنا صحیح ہے اسی طرح آپ کو رب کا قرب حاصل ہوا اسی وجہ سے تعدنی فتدی کا ترجمہ چہرہ جلوہ نزدیک ہوا پھر خوب اترا آیا یہی ترجمہ صحیح ہے ایسے ہی ولقد راہ نزلة اخرى کا ترجمہ اور انہوں نے تو وہ جلوہ دو مرتبہ دیکھا یہ ترجمہ ہی تفاسیر اور حدیث کے مطابق ہے اور اسی میں نبی کریم کی شان کا لحاظ کیا گیا ہے۔

قِيَايَ الْاَوْسَايِكَ تَتَمَارِي (پتا ع)

اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھلائے گا۔ (مولانا محمود الحسن)

اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھلاوے گا۔ (شاہ عبدالقادر)

سو تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں میں شک کرتا رہیگا (عبدالماجد ریا آبادی)

سو تو اپنے رب کی کون کونسی نعمت میں شک کرتا رہیگا (مولانا اشرف علی)

تو اسے سننے والے اپنے رب کی کون سی نعمتوں میں شک کریگا (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے اسے سننے والے الفاظ کا اضافہ کیا لیکن دیگر ترجمین نے ان الفاظ کا اضافہ نہیں کیا دیگر ترجمین کے تراجم سے شک کر رہی نسبت نبی کریم کی طرف نظر آتی ہے کیونکہ قرآن پاک کے براہ راست

مخاطب نبی کریم میں حالانکہ نبی کریم کی طرف نسبت غلط ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پرتائید تفسیر میں موجود ہے۔ کیونکہ ان الفاظ کی زیادتی کے بغیر ترجمہ ادب و احترام کے منافی ہے۔ تفسیر جلالین میں ہے۔ فبای الامور بک ایھا اللہ علی و حدانیتہ و قدرہ تتمان ی تشک ایھا الانسان۔ اسے انسان تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں میں شک کریگا جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت پر وال ہیں۔ تفسیر مدارک میں ہے فبای الامور بک ایھا المخاطب تتمان ی تشک بما او لاک من النعماء سننے والے مخاطب تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں میں شک کریگا۔ روح المعانی میں ہے وقیل الانسان علی الاطلاق وهو اظہر یہاں مطلق خطاب عام انسان کو ہے اور یہی قول زیادہ مناسب ہے تفسیر کے ان بیانات سے یہ واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی شان بنی الانبیاء کا پاسدار ہے جبکہ دیگر تراجم اس منصب جلیل سے خالی ہیں۔

الَّذِينَ عَلَّمُوا الْقُرْآنَ لِخَلْقِ الْإِنْسَانِ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۶۲)

رحمن نے سکھایا قرآن بنایا آدمی پھر سکھایا اسکو بات کرنا (مولانا محمود الحسن)
 رحمن نے سکھایا قرآن پیدا کیا آدمی کو سکھایا اس کو بولنا

(شاہ رفیع الدین)

خدا جو نہایت مہربان اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی اسی نے

انسان کو پیدا کیا اسی نے اسکو بولنا سکھایا (مولانا فتح محمد)

رحمن نے سکھایا قرآن۔ بنایا آدمی پھر سکھائی اسکو بات (شاہ عبدالقادر)

رحمن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اس کو بولائی

سکھلائی۔ (مولانا اشرف علی)

نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے اسی

نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا (مولانا مودودی)

خدا نے رحمن ہی نے قرآن کی تعلیم دی اسی نے انسان کو پیدا کیا

اس کو گویا ہی سکھلاتی۔ (عبدالماجد دریا آبادی)

رحمن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا۔ ما

کان وما یکون کا بیان انہیں سکھایا۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے واضح ہو رہا ہے کہ علم کا ایک مفعول

محذوف ہے اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی رحمن نے

اپنے محبوب کو قرآن سکھایا۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے یہ پتہ چلتا ہے

کہ خلق الانسان میں انسان سے مراد بھی نبی کریم ہیں جو انسانیت کی جان ہیں۔

نبی کریم انسانیت کی جان ہیں اس کا اردو محاورہ میں ایک مطلب یہ ہے کہ آپ

تمام انسانوں کے محبوب ہیں اس پر بحث پیش لفظ میں گزر چکی ہے کہ آپ

کو محبوب ماننا ہی ایمان ہے اور آپ کو اپنے والدین، اولاد سے اور تمام

لوگوں سے زیادہ محبوب ماننا ایمان سے دوری کی علامت ہے انسان کی

جان کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ باعث تخلیق انسان ہیں۔ بلکہ آپ

باعث تخلیق کائنات ہیں جیسا کہ حدیث قدسی ہے لولاک لہما

خلقت الافلاک۔ اے محبوب اگر آپ نہ ہوتے تو یہ کائنات

کا معرض وجود میں آنے کا نظم و نسق قائم نہ ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ

اس حدیث کو مولانا حسین احمد مدنی نے الشہاب الثاقب میں صحیح

قرار دیا ہے آپ کا اصل کائنات ہونا انسانیت کی جان ہونے میں

کوئی استخارہ نہیں۔ اسی طرح روح المعانی پک میں ہے العالم

جسد روح النبوة ولا قیام للجسد بدون روح

تمام جہان ایک جسم ہے اور نبی کریم اس کی روح ہیں جسم کا قیام بغیر

روح کے ممکن نہیں پتہ چلا کہ نبی کریم کائنات کی جان ہیں اسی طرح اعلیٰ حضرت

کے ترجمے سے یہ واضح ہوا کہ علم البیان کا مطلب یہ ہے کہ حبیب پاک
 علیہ التحیۃ والثناء کو ماکان وما یكون کا علم عطا کیا گیا لیکن دیگر مترجمین اپنے تراجم
 میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شان کو بیان کرنے سے قاصر رہے۔ اوپر
 تین طرح کا جو فرق پیش کیا گیا ہے اس کو تفاسیر کی روشنی میں پیش کیا جا رہا
 ہے تاکہ تفاسیر سے بے خبر لوگوں کے اس اعتراض کی حقیقت بے نقاب ہو جائے
 جو اپنی کم علمی کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ان الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں
 ماکان وما یكون کی جان ماکان وما یكون کسی قرآنی لفظ کا ترجمہ نہیں
 فاضل بریلوی نے الفاظ اپنی تسکین طبع کیلئے ناجائز طور پر قرآنی ترجمہ میں سمویئے
 آئیے ملاحظہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کے تائید میں تفاسیر کس طرح
 ماکان وما یكون کے علم کو پیش کر رہی ہیں اور انسان سے بھی نبی محترم علیہ
 الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں۔ روح المعانی میں ہے۔ ونصبہ (ای القرآن)
 علی انہ مفعول ثانٍ لعلّٰہ ومفعولہ الاول محذوف۔ آپ
 فرماتے ہیں کہ لفظ القرآن پر نصب اس وجہ سے ہے کہ علم کا یہ مفعول ثانی ہے
 اور پہلا مفعول محذوف ہے اس سے اگے اقوال بیان کرتے ہوئے ایک
 قول نقل فرماتے ہیں۔ وقیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وہ
 پہلا مفعول جس کو قرآن سکھایا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ خلق اللان
 وقال ابن کسان الانسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ خلق اللان
 میں انسان سے مراد نبی کریم ہیں اس کے بعد علم البیان کے متعلق ایک
 قول نقل فرمایا القرآن نفسه علی ما سمعت۔ یعنی بیان سے مراد خود قرآن
 پاک ہے جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے تم نے سنا ہے۔ وہ آپ کا
 پہلا بیان قرآن کے متعلق یہ ہے۔ واخرج ابن جرییر وابن
 جریر عن ابن مسعود انزل فی هذا القرآن علم کل
 شئہ بین لنا فیہ کل شیء ولكن علمنا یقصر عما بین لنا

فی القرآن وقال ابن عباس لوضاع لی عقل بعیر لوجدت
فی کتاب اللہ تعالیٰ وقال السمرسی جمع القرآن علوم
الاولین والآخرین۔ یعنی قرآن پاک تمام عزیزوں کے علوم پر مشتمل ہے
اور قرآن پاک ہمیں ہر چیز کا علم بتاتا ہے لیکن ہمارا اپنا علم قرآن پاک کو مکمل سمجھنے سے
قاصر ہے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگر میرے اور نیک کی رسی گم
ہو جائے تو میں اسے بھی کتاب الشکی راہنمائی میں تلاش کر لوں۔ اور
مرسی کہتے ہیں کہ قرآن پاک اولین و آخرین کے علوم کا حامل ہے اور علامہ آلوسی
فرماتے ہیں۔ ولعل ابن کیسان یقدر مقبول علم الانسان
مراد ابہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی ابن کیسان کی مراد شانیدر
ہو کہ علم کا مقبول مقدر ہے وہ ہے الانسان اور اس سے مراد نبی کریم صلی
علیہ وسلم ہی ہیں۔ اسی طرح قاضی ثناء الشریانی پتی تفسیر منظر ہی میں بیان فرماتے
ہیں وجازان یقال خلق الانسان یعنی محمد صلی اللہ علیہ
وسلم علم البیان یعنی القرآن فیہ بیان ماکان وما یکون
من الانزل الی الانبیاط بقالبیان من معنی من التویل ہدایۃ
للناس وأیۃ علی نبوتہ۔ جائز ہے کہ یہ کہا جائے کہ خلق الانسان میں
انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں علم البیان میں بیان سے مراد
قرآن پاک ہے جس میں ماکان وما یکون کا علم انزل سے ابد تک موجود ہے جو
پہلے انبیاء کرام کے ذکر و بیان کے مطابق ان کے احوال پر مشتمل ہے لوگوں
کیلئے ہدایت اور آپ کی نبوت پر نشانی ہے۔ الجامع لاحکام البیان للقربی
میں ہے۔ علم البیان وعن ابن عباس وایضا عن ابن کیسان
الانسان ہما یراد بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی
علم البیان میں ضمیر منصوب کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کہ بیان
سکھایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ والبیان بیان المحلال والمحرام

والهدی من الضلال وقیل ماکان وما یکون لانه بین عن
 الاولین والاخرین ویوم الدین اور علم البیان میں بیان سے مراد
 یا تو حلال و حرام کا علم اور گمراہی سے ہدایت دینا اور یا بطرح بیان کیا گیا ہے
 کہ بیان سے مراد ماکان وما یکون کا علم ہے کیونکہ حبیب پاک علیہ التحیۃ والتنا
 نے اولین و آخرین اور قیامت کا ذکر فرمایا ہے جب آپ جمیع گزرے ہوئے
 اور آنیوالے اور واقعات قیامت سے مطلع فرمایا تو آپ کو ماکان وما یکون
 کا علم حاصل ہے الوحیز للواحدی میں ہے الرحمن علم القرآن ای علم
 نبیہ القرآن لیس کما یقول المشرکون انما یعلمہ بشر
 خلق الانسان یعنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم علمہ البیان
 یعنی القرآن الذی فیہ بیان کل شیء - یعنی الرحمن علم القرآن کا
 مطلب یہ ہے کہ رحمن نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھایا
 ایسا نہیں جیسا مشرک کہا کرتے تھے کہ ان کو کوئی بشر قرآن سکھاتا ہے اور
 خلق الانسان میں انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں علم البیان
 میں بیان سے مراد قرآن پاک ہے جس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے یعنی
 ماکان وما یکون کے بیان پر مشتمل ہے سراج المنیر میں اس طرح بیان کیا
 گیا ہے - وعن ابن عباس ایضا وابن کسیر المراد
 بالانسان ہمہنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 والمراد من البیان المحلول والحرام والهدی من
 الضلال وقیل ماکان وما یکون لانه بین عن الاولین
 والاخرین وعن یوم الدین حضرت ابن عباس اور
 ابن کسیر سے اس طرح مروی ہے کہ الانسان سے مراد یہاں
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بیان سے مراد حلال و حرام اور
 گمراہی سے ہدایت دینے کا بیان مراد ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ

بیان سے مراد ماکان و مایکون کا علم ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اور پچھلے لوگوں کا بیان فرمایا اور واقعات قیامت سے مطلع فرمایا لہذا یہ ماکان و مایکون کا علم ہی ہے تفسیر حسینی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے

علم القرآن بیا موحثہ است قرآن مرصیب خود را علمہ
 البیان بو وجود آمد و محمد را و بیا موزا بسند و پرا بیان آنچہ
 بود و بہت و باشد چنانچہ مضمون فحمت علم الاولین والآخرین ازین معنی خبر میدہد
 یعنی تفسیر حسینی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ علم القرآن سے مراد یہ ہے کہ رحمن نے اپنے حبیب کو قرآن سکھایا۔ یہاں اس پریشانی کا حل بھی موجود ہے کہ اعلیٰ حضرت "محبوب" کیوں ذکر کرتے ہیں علم البیان نبی کریم کو معرض وجود میں لایا اور آپ کو بیان سکھایا یعنی جو ہو چکا موجود ہے اور ہو گا سب کا علم عطا کیا (ماکان کا ترجمہ صاحب حسینی نے بود سے کیا اور مایکون کا ترجمہ است اور باشد سے کیا) اس پر نبی کریم کا ارشاد والی ہے کہ مجھے تمام پہلوں اور کھپوں کا علم عطا کیا گیا ہے تفسیر جمل میں ہے

وقیل اراد بالانسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم علمہ
 البیان یعنی بیان مایکون و ماکان لانہ صلی اللہ علیہ وسلم
 ینبئ عن خیر الاولین والآخرین وعن یوم الدین۔ بیان کیا گیا ہے کہ انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور علم البیان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ماکان و مایکون کا علم دیا گیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام پہلے اور آئیوالے لوگوں کے حالات سے مطلع فرمایا اور واقعات قیامت کا تذکرہ فرمایا۔ اب ان مذکورہ تفاسیر کے بیان میں یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ ذاتی رائے نہیں۔ ہاں البتہ آپ کے ترجمہ کو مورد الزام ٹھہرانے والوں کو پریشانی صرف اس بات کی ہے کہ نبی کریم کی شان کو آپ نے اردو خوان کے سامنے کیونکر واضح کر دیا۔ کیونکہ آپ کی یہ شان تو معتبر تفاسیر میں موجود ہے جو ضخیم ہونے کی وجہ سے

عام آدمی کی وسعت میں نہیں کہ خرید سکتے اور ہر آدمی کا ان کو سمجھنا بھی مشکل ہے اس لئے اردو مترجمین کے اذہان میں جس شانِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو پوشیدہ رکھنا مقصود تھا اسکو اعلیٰ حضرت نے محترم مگر جامع انداز میں سمجھا دیا یہی پریشانی کا سبب بنا اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذاتی رائے اور بے ہودہ الفاظ سے ان کا ذکر کرنا شروع کیا۔ لیکن حقیقت آشکارا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی وجہ سے معتبر تفاسیر سے اس مسئلہ کو واضح کر دیا۔ اب اگر نبی کریم کی شان کسی کو نہ پسند آئے تو ہمیں اس سے کیا غرض یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے

فَاتَمُّمُوا اللّٰهَ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا (پہ ۲۸)

پھر پہچان پر اللہ جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ (مولانا محمود الحسن)
 پھر پہچان پر اللہ جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ (شاہ عبدالقادر)
 سو ان پر خدا ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا۔ (مولانا اشرف علی)
 مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ تھا۔ (مودودی)
 مگر خدا نے ان کو وہاں سے آ لیا جہاں سے ان کا گمان بھی نہ تھا (فتح محمد)
 تو اللہ کا حکم لے کے پاس آیا جہاں سے ان کا گمان بھی نہ تھا۔ (اعلیٰ حضرت)
 اللہ تعالیٰ آنے جانے سے پاک ہے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ آگیا یہ

اس کی شان کے لائق نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے مقصد کو اپنے ترجمہ سے واضح کر دیا اور وہ الفاظ استعمال فرمائے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہیں اور مقصد بیان کے مطابق بھی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری تفاسیر کے مطابق سے بہت زیادہ روشن ہے۔ جلالین میں ہے۔ فاتمّموا اللہ امرہ وعذابہ کہ اللہ کا حکم اور عذاب ان کے پاس آیا۔ ملائکہ میں ہے۔ فاتمّموا اللہ ای امر اللہ وعقابه۔ یعنی ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا امر اور عذاب آیا تفسیر کبیر میں ہے فی الایۃ وجہان الاول ان یکون الضمیر فی قولہ

فَاتَاهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَإِلَى اللَّهِ عِوَابُ الْأَشْقَاءِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَإِلَى اللَّهِ عِوَابُ الْمُنِيفِينَ
 اِی فَاتَهُمْ عَذَابُ اللَّهِ وَتَقْوِيَّتِهِ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَجْتَسِبُوا
 یعنی اس آیت کریمہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ فاتہم میں ضمیر کا مرجع بیوردیہا تو اب
 معنی یہ ہوگا کہ ان کے پاس اللہ کا عذاب اور اس کی گرفت آئی جہاں سے ان کو
 گمان بھی نہ تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع مؤمنین ہوں تو اس صورت
 میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ کی امداد اور تقویت ان کے پاس آئی جہاں سے ان کو گمان
 بھی نہ تھا اب توجہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ کتنا شاندار ہے۔ کہ اللہ کا حکم ان کے
 پاس آیا۔ یہ حکم کا لفظ علامہ رازی رحمۃ اللہ کی دونوں توجیہات کو شامل ہے
 اس سے آگے علامہ رازی نے فیصد ہی فرمایا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اللہ ان کے
 پاس پہنچا۔ بیان کرتے ہیں۔ فَاتَاهُمْ اللَّهُ لَا يُمْكِنُ اجْرَاهُ عَلَى ظَاهِرِهِ
 باتفاق جمہور العقلاء فدل علی ان باب التاویل
 مفتوح وان صرف الایات عن ظواہرہا بمقتضی الدلائل
 العقلیۃ جائز۔ یعنی جمہور عقلاء کا اتفاق ہے کہ فاتاہم اللہ
 کا ظاہری معنی لینا کہ اللہ ان کے پاس پہنچا یہ ممکن ہی نہیں۔ تاویلات کا دروازہ
 کھلا ہوا ہے اس ضابطہ کے مطابق تاویل کرنی ضروری ہوئی اور آیات کو دلائل عقلیہ
 کے پیش نظر ظاہر سے پھیرنا جائز ہے۔

الْبَارِئِ الْمُصَوِّدِ (پہا ۳)

(محمود الحسن) نکال کھڑا کر نیوالا، صورت کھینچنے والا۔
 (شاہ عبدالقادر) نکال کھڑا کرتا، صورت کھینچتا۔
 (اعلیٰ حضرت) پیدا کر نیوالا ہر ایک کو صورت دینے والا۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ فصاحت و بلاغت میں یکتا اور مقصود کو سمجھانے میں اپنی مثال

آپ ہی ہے۔ کیونکہ نکال کھڑا کرنا۔ وضاحت سے خالی ہے اور ضروری نہیں کہ اس کو "پیدا کر نیوالا" کے معنی میں استعمال کیا جائے کیونکہ نکال کھڑا کرنا کا معنی تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کو ایک علاقہ، ایک جگہ سے نکال کر دوسرے علاقہ اور دوسری جگہ میں بھیج دیا جائے۔ حالانکہ یہ مقصد ہی نہیں۔ مقصد بیان تو پیدا کر نیوالا ہی ہے اسی طرح المصور کے معنی صورت کھینچنے والا بھی کامل نہیں کیونکہ صورت کھینچنے والا تو فوٹو گرافر بھی ہوتا ہے بخلاف صورت دینے والا یہ کسی اور صورت میں استعمال نہیں صرف اسی صورت میں استعمال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو شکل و صورت عطا فرماتا ہے مدارک میں ہے الباری الموجد المصور فی الارحام یعنی الباری کا معنی معرض وجود میں لانیوالا اور المصور سے مراد ارحام میں یعنی شکم مادہ میں صورت عطا فرمانے والا۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں ان کا ترجمہ ایسا ہی کیا جائے جو رب قدوس کی شان کے لائق ہے۔

وَتَرَكَوكَ قَائِمًا (پہلے)

- | | |
|------------------------|---------------------------------------|
| (مولانا محمد الحسن) | اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا۔ |
| (شاہ عبدالقادر) | اور تجھ کو چھوڑ جاویں کھڑا۔ |
| (اشرف علی) | اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جائیں۔ |
| (مولانا مورودی) | اور تمہیں کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔ |
| (عبدالماجد دریا آبادی) | اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔ |
| (فتح محمد) | اور تمہیں کھڑے کا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ |
| (شاہ رفیع الدین) | اور چھوڑ جاتے ہیں تجھ کو کھڑا۔ |
| (اعلیٰ حضرت) | اور تمہیں خطبے میں کھڑا چھوڑ گئے |

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ پوری تفصیل پر مشتمل ہے آیت کریمہ کے شان نزول اور اصلی صورت حال کی وضاحت کر رہا ہے جیسا کہ تفسیر میں اس آیت کریمہ

کے شان نزول کو پیش کیا گیا ہے جلالین میں ہے۔ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم
یغطب یوم الجمعة فقدمت غیر وضرب لقدم ومھا الطبل
علی العادة فخرج لھا الناس من المسجد غیر اثنی
عشر سا جلا فتنزل۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جموعہ کے
دن خطبہ دے رہے تھے کہ ایک قافلہ اونٹوں پر غلہ لایا اور اعلان کیلئے عادت
کے مطابق دف بجائی گئی تو بارہ آدمیوں کے سوا باقی سب غلہ خریدنے کی غرض
سے چلے گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح خطبہ کے حال میں کھڑے تھے و ترکوٹ
قائمًا فی الخطبة اور تمہیں خطبہ میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مارک میں بھی اسی طرح
ہے و ترکوٹ علی المنبر قائمًا تخطب اور تمہیں منبر پر
خطبے میں کھڑا چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح
ہے جبکہ دیگر تراجم سے یہ نہیں پتہ چل سکتا کہ وہ کیسے حال میں نبی کریم کو چھوڑ گئے تھے

یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (پہلے)

(مولانا محمود الحسن)
(شاہ عبدالقادر)
(فتح محمد)
جس دن کہ کھولی جائے پنڈلی۔
جس دن کھولی جاوے پنڈلی
جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائیگا۔
جس دن ایک ساق کھولی جائے گی۔ (جس کا معنی اللہ ہی جانتا ہے
اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ جسم اور اعضاء سے پاک ذات ہے اس لئے پنڈلی
کھولنے کا کیا مقصد۔ اس پر مفسرین کرام نے بہت بحثیں کی ہیں جن کا لب لباب
یہ ہے وان الایة من المشابہ (روح المعانی) کہ یہ آیت مشابہات
سے ہے جس پر اتنا ہی ایمان کافی ہے کہ جو اللہ کی مراد ہے وہ حق ہے یعنی
کا معنی اللہ ہی جانتا ہے۔ جلالین اور مارک میں ہے کہ اس سے مراد اللہ

ہے ہو عبارة عن مشددة الامر بيوم القيمة للحساب والجزاء
یعنی قیامت کے دن حساب و جزا کیلئے شدت امر ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ
جس دن ساق کھولی جائے گی (جس کا معنی الشدہ ہی جانتا ہے) خوب تر ہے
کیونکہ ساق سے مراد کیا ہے الشدہ ہی بہتر جانتا ہے مشابہات پر ایمان لانا
کہ ان کا معنی الشدہ ہی جانتا ہے۔ مشابہات کے نزول میں یہی حکمت ہے
اس لئے ساق کا معنی پیٹلی کرنا اور اس کا کھولا جانا مقصود ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ
کی شان کے لائق ہے

اِنَّ لَقَوْلِ رَسُوْلِ كَرِيْمٍ (پہلا پتہ)

یہ کہا ہے ایک پیغام لانیوالے سردار کا۔ (مولانا محمود الحسن)

یہ کہا ہے ایک پیغام لانیوالے سردار کا۔ (شاہ عبدالقادر)

یہاں قرآن (کلام الہی) ہے فرشتہ کا لایا ہوا۔ (عبدالماجد دریا آبادی)

بے شک یہ قرآن ایک کرم والے رسول سے باتیں ہیں (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ واضح ہے کہ انہ کی ضمیر کا مرجع قرآن پاک
ہے اور رسول کریم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سراپا کرم ہیں لیکن دیگر
ترجمہ سے یہ مراد واضح نہیں کیونکہ یہ کہا۔ ترجمہ کرنا اس سے یہ نہیں پتہ چلتا
کہ مراد قرآن پاک ہے نہ ہی پیغام لانیوالے سردار سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے
صیب پاک علیہ التحیۃ والشاہدین جو کرم والے ہیں۔ جلالین میں ہے۔ اسنادی
القرآن لقول رسول کریم ای قالہ رسالۃ عن اللہ
سبحانہ وتعالیٰ اس پر جمل میں یہ بیان کیا گیا۔ کریم ای
علی اللہ فہو فی غایۃ الکرم الذی ہو البعد عن
ساوی الاخلاق وهو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
وقولہ قالہ رسالۃ ای تبلیغ لاناہ وصف لہ کما انہ کذاک

اللہ تعالیٰ یعنی بے شک قرآن پاک کرم ولے رسول پر اللہ نے نازل فرمایا اور انہوں نے مخلوق پر پیش فرمایا۔ کریم سے مراد وہ بلند و بالا ذات جو بہت زیادہ کریم ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی کریم وہ قرآن اللہ کی طرف سے مخلوق پر پیش فرمایا اصل میں ایک سوال کا جواب ہے کہ قرآن پاک تو اللہ کا کلام ہے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہنا کیسے صحیح ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک بلاشبہ اللہ کا کلام ہے لیکن اللہ نے نبی کریم پر پیش فرمایا یہ مراد نہیں کہ آپ کا اپنا کلام ہے۔ توجہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ کس طرح مقصد کے مطابق اور واضح اور تفسیر سے کیسے مطابقت رکھتا ہے۔

لَاخِذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ (پہا ۱۱)

تو ہم پکڑ لیتے اس کا دایا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن۔ (مولانا محمود الحسن)

تو ہم پکڑتے اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی ناک۔ (شاہ عبدالقادر)

تو ہم اس کا دایا ہاتھ پکڑ لیتے اور رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ (موردوی)

تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے (فتح محمد)

البتہ پکڑتے ہم اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے ہم اس سے

رگ گردن کی۔ (شاہ رفیع الدین)

مرد ہم ان سے بقوت بدلہ لیتے پھر ان کی رگ کاٹ لیتے۔ (اعلیٰ حضرت)

اگرچہ دایا ہاتھ سے پکڑنا لغوی معنی درست ہے لیکن مراد یہی

ہے جو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا "قوت سے بدلہ لیتے" تفسیر کبیر میں ہے ان

اليمين بمعنى القوة والقدرة۔ یعنی یمین کا معنی قوت و قدرت

ہے۔ اعلیٰ حضرت نے و تین کا ترجمہ رگ دل کیا ہے۔ اور باقی حضرات گردن، ناک

رگ گردن۔ تفسیر کی رو سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی اجماع ہے تفسیر کبیر میں ہے

الوتين هو العرق المتصل من القلب بالرأس الذي

اذا قطع مات الحيوان یعنی الوتین اس رگ کو کہتے ہیں جو دل سے سر تک جاتی ہے اس کو جب کاٹ دیا جائے تو حیوان مر جاتا ہے۔ ہارک میں ہے ہونیاط القلب اذا قطع مات صاحب وہ رگ دل ہے جس کی کاٹ دی جائے وہ مر جاتا ہے۔ جلالین میں ہے۔ الوتین نیاط القلب وهو عرق متصل بہ اذا انقطع مات صاحب رگ دل ہے جس کے کاٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے صراح میں نیاط القلب کا معنی رگ گردن کیا گیا ہے تفاسیر کی مذکورہ عبارات سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی ہی برتری عیاں ہے۔

إِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهُ مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ (پہ ۲۹)

اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے ٹھکانوں میں سننے کے واسطے (مولانا محمود الحسن) اور جو کہ ہم پہلے آسمان میں سننے کیلئے کچھ موقعوں پر بیٹھا کرتے (اعلیٰ حضرت) اس جگہ منہا میں ضمیر کا مرجع السماء ہے جو انا لسمنا السماء میں پہلے اچکا ہے۔ ہارک میں بھی و انا کنا نقعد من السماء اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو واضح کر رہا ہے کہ جن پہلے آسمان میں سننے کیلئے کچھ موقعوں پر بیٹھا کرتے تھے، صرف ٹھکانوں میں سنا، مقصد کو واضح نہیں کرتا

يَأْتِيهَا الْمُرْتَلِّ قِيمَ اللَّيْلِ الْأَقْلَبِيَّةِ (پہ ۲۹)

اسے جھرمٹ ماننے والے کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات (شاہ عبدالقادر) کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات (مولانا محمود الحسن) اسے جھرمٹ مارنے والے رات میں قیام فرما سوا کچھ رات کے (اعلیٰ حضرت) اس جگہ آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم کو اختیار دیا گیا کہ آپ رات کو عبادت فرمائیں آدمی رات، یا اس سے کم یا اس سے زائد آپ کو اس میں

اختیار ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ مقصد واضح ہے کہ آپ رات میں قیام فرمائیں
 سوا کچھ کے یعنی کچھ کے سوا سے کیا مراد ہے وہ آدمی رات یا اس سے زائد یا اس
 سے کم۔ لیکن اگر یہ ترجمہ ہو کہ کچھ رات کو مگر کسی رات اس ترجمہ سے ہر وہ شخص
 بخوار دوزبان سے واقف ہو گا وہ یہی سمجھے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ
 کئی راتیں قیام کریں اور کئی راتیں قیام نہ کریں حالانکہ یہ مفہوم معتبر نہیں۔
 اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مقصد کے مطابق ہے تمام تفاسیر اس مقصد کو ظاہر کریں
 ہیں جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ الاقلیلا استثناء من اللیل وقولہ تعالیٰ
 نصف بدل من قلیلا بدل الكل او النقص من عطف
 علی امر السابق قلیلا ای نقصا قلیلا او مقدار اقلیلا
 بعیث لا یخط عن نصف النصف او زد علی عطف
 کما سبق وهو تخیر صلی اللہ علیہ وسلم بین ان
 یقوم نصف اللیل او اقل من النصف او اکثر روح المعانی
 مختصراً یعنی الاقلیلا، لیل سے مستثنیٰ ہے اور نصف قلیل سے بدل الكل
 ہے اور محطوف علیہ ہے او النقص اور او زد علیہ اس کے محطوف میں یعنی
 وہ جو مستثنیٰ ہے وہ کیا ہے وہ نصف رات یا اس سے کم یا زائد ہے دوسرا
 جو لفظ قلیلا ہے اس سے مراد محطوف ہی مقدار ہے یعنی نصف سے کم تو ہو
 لیکن محطوف ہی مقدار تاکہ پورا تعانی صدر سے کم نہ ہو۔ اب اس تفصیل کے بعد
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور دیگر تراجم میں فرق کی طرف توجہ کریں خود بخود واضح
 ہو گا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مقصد کے مطابق ہے دیگر مذکورہ تراجم مقصد کی
 وضاحت سے قاصر ہیں

وَالْتُرِغَتْ غَرْقًا نَبِيًّا

قسم ہے گھسیٹ لانے والوں کی ڈوب کر۔ (شاہ عبدالقادر)

marfat.com

Marfat.com

قسم ہے گھسیٹ لاسنے والوں کی غوطہ لگا کر۔
 (مولانا محمد الحسن)
 قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں۔
 (موردی)
 ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔
 (فتح محمد جالندھری)
 قسم ہے ان کی کہ سکتی سے جان کھینچیں۔
 (اعلیٰ حضرت)
 اس مقام پر ان ملائکہ کی قسم اٹھائی گئی ہے جو روح قبض کرتے ہیں
 یعنی عزرائیل اور اس کے ساتھ انبوالے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مطلب آسانی
 سے اخذ کیا جاسکتا ہے لیکن دوسرے تراجم سے مطلب کو حاصل کرنا نہایت دشوار
 بلکہ یوں کہا جائے کہ ظاہر طور پر صرف ترجمہ سے مطلب حاصل کرنا ممکن ہی نہیں اور تفاسیر
 میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے۔ جلالین میں ہے۔ والمنزحت
 الملائكة تنزل ارواح الكفار غرقاً نزعاً بشدة۔ اسی طرح کبیر میں ہے
 والمنزحات غرقاً۔ ہی الملائكة التي ينزحون نفوس بني آدم فاذا انزلوا
 نفس الكفار نزعوا بشدة۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب اور مولانا موردی کے تراجم
 فرشتوں کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے؟

وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ (پتہ ۱)

اور جب تارے میلے ہو جائیں۔
 (مولانا محمد الحسن)
 اور جب تارے میلے ہو جائیں۔
 (شاہ عبدالقادر)
 اور جب تارے بے نور ہو جائیں۔
 (فتح محمد)
 اور جس وقت کہ تارے گد لے ہو جائیں۔
 (شاہ رفیع الدین)
 جب تارے بکھر جائیں گے۔
 (موردی)
 اور جب ستارے بے نور رہ جائیں۔
 (عبدالماجد)
 اور جب تارے جھڑپڑیں۔
 (اعلیٰ حضرت)

یہاں قیامت کے احوال کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے

یہ مفہوم جو مفقود ہے وہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے کیونکہ میلے ہونے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنی جگہ ہوتے ہی بے نور ہو جائیں گے یا کہ گرہ پڑیں گے اور گرنے کی وجہ سے بے نور ہوں گے بیان کا مقصد بھی یہ کہ ستارے زمین پر ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی اس کو ظاہر کرتا ہے کہ جب تارے بھر پڑیں گے اور تقاسیر کی تائید بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو حاصل ہے مدارک میں ہے واذ النجوم انکسرت تساقطت۔ جب تارے بھر کر گر پڑیں گے جلالین میں ہے واذ النجوم انکسرت انقضت وتساقطت۔ تارے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑیں گے تفسیر کبیر میں ہے واذ النجوم انکسرت اسی مناسرت وتساقطت۔ تارے بھر جائیں گے گر پڑیں گے۔

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (تہذیب)

- بے شک تیرا رب لگا ہے گھات میں۔ (مولانا محمود الحسن)
- تیرا رب لگا ہے گھات میں۔ (شاہ عبدالقادر)
- بے شک آپ کا رب گھات میں ہے۔ (مولانا اشرف علی)
- تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔ (مورودی)
- بے شک آپ کا پروردگار تاک میں ہے۔ (عبدالماجد دریا آباری)
- بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔ (فتح محمد)
- تحقیق تیرا رب بیچ گھات کے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)
- بے شک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

اس جگہ عام مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے، رب گھات میں ہے حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اس لئے کہ کسی کی گھات میں ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے سے نظر بچا کر چھپ بیٹھا ہوا ہے اور چھپ کر دوسرے سے چھپ کر بچتا ہے اللہ تعالیٰ کا چھپ کر بیٹھنا گھات میں دوسرے پر حملہ کرنا، سزا دینا

یہ اس کی شان سے کوسوں دور ہے۔ وہ بیٹھنے اور چھپنے سے پاک ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ شان الوہیت کے عین مطابق ہے آپ چونکہ زبانی کلامی توحیدی ہونے کے دعویدار نہیں تھے کہ شان الوہیت بھی نہ سمجھ آئے بلکہ آپ حقیقتہً توحید و رسالت کے مراتب کا پاس کرنیوالے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کا ترجمہ کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ^{نہیں} تفسیر کی تائید بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو حاصل ہے۔ جلالین میں ہے۔ یرصد اعمال العباد فلا یفوت منها شیء لیجازیہم علیہما اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو نگاہ میں رکھتا ہے اس سے کچھ بھی مخفی نہیں وہ ان کو ان کے مال کی جزا دے گا۔ روح المعانی میں ہے۔ و فی الکلام استعارة تمثیلیة مشبکونہ تعالیٰ حافظ لاجمال العصاة۔ یہ کلام استعارہ تمثیلیہ کے طور پر ہے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو عذاب دے گا کیونکہ وہ ان کے اعمال کو نظر میں رکھتا ہے۔

لَا أَقِيمُ بِهَذَا الْبَلَدِ وَأَنْتَ جِلُّ بِهَذَا الْبَلَدِ وَالِدِ

وَمَا وَلَدًا بِهَذَا

قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور تجھ کو قید نہ رہے گی اس شہر میں اور جینے کی اور جو جانا۔

(شاہ عبدالقادر)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں اور قسم ہے جینے کی اور جو اس نے جانا۔

(مولانا محمد الحسن)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونیوالی ہے اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی

(اشرف علی)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی

(عبدالاجد دریا آبادی)

مجھے اس شہر کی قسم کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو اور تمہارے باپ ابراہیم کی قسم اور اس کی اولاد کی کہ تم ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت نے و انت حل بهذا البلد کا ترجمہ کیا ہے کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو اگر دیگر تراجم بھی تفاسیر سے ملتے ہیں تاہم عظیم حضرت کا ترجمہ تفسیر کبیر کے اس قول سے مطابقت رکھتا ہے و انت مقيم بهذا البلد نازل في حال به كان تعالى عظم مكة من جهة انه عليه الصلوة

والسلام مقيم بها۔ یعنی اللہ تعالیٰ انبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ میں مقیم ہونے کی وجہ سے اس کو عظیم سمجھتے ہوئے قسم اٹھائی کہ مجھے اس شہر کی قسم اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔ اسی طرح باقی مترجمین نے والد اور ولد کو عام رکھا۔ باپ اور اولاد کی قسم، یا جننے یا جو جینا اس کی قسم۔

لیکن اعلیٰ حضرت نے والد سے مراد ابراہیم علیہ السلام اور اولاد سے مراد آپ کی نذر اولاد جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قسم اسی لئے اٹھائی گئی ہے کہ والد سے مراد بھی معظم ہستی اور اولاد سے مراد معظم ہے روح المعانی میں ہے

وقيل ابن ابراهيم عليه السلام وولده اسمعيل عليه السلام والنبى صلى الله عليه وسلم

یعنی والد سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اولاد سے مراد حضرت اسمعیل علیہ السلام اور نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مدارج النبوة میں شیخ فرماتے ہیں

معزز و مکرم است نزديق تعالى بوقت حلول ونزول ذي دران وازيجا

گفتہ اند شرف المكان بالمکین۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے کی وجہ

سے وہ شہر معزز و مکرم ہوا اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ شرف المكان

بالمکین۔ کہ مکان کو رہنے والے کی وجہ سے بزرگی حاصل ہے

کے متعلق فرماتے ہیں

اگر مراد بوالد آدم است وما ولد ذریت است آنحضرت داخل است

در عموم ذریت و اگر ابراہیم علیہ السلام است مراد بذریت آنحضرت
خواہد بود صلی اللہ علیہ وسلم پس درین صورت دو قسم است از پورگان
عزوجل بحیب وی صلی اللہ علیہ وسلم -

یعنی اگر والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں اور ذریت سے مراد آپ کی
اولاد تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام اولاد میں داخل ہیں اگر والد سے مراد حضرت
ابراہیم علیہ السلام ہوں تو ولد سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ بہر حال
اس نیک پاک میں نبی کریم کی دو مرتبہ قسم اٹھانی گئی۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (پتہ چلے)

- پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی۔ (محمود الحسن)
- پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی۔ (شاہ عبدالقادر)
- اور اللہ نے آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتلایا۔ (اشرف علی)
- تمہیں ناواقف راہ پایا پھر ہدایت بخشی۔ (موردی)
- اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سید ہارستہ دکھایا۔ (مولوی فتح محمد)
- اس نے تجھ کو بھولا بھٹکا پایا پھر راہ پر لگایا۔ (وحید الزمان)
- آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتا دیا۔ (عبدالماجد دریا آبادی)
- پس پایا تجھ کو راہ بھولا ہوا پس راہ دکھائی۔ (شاہ رفیع الدین)
- اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی صحیح ہے اور اسی میں نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم کی شان کا لحاظ کیا گیا ہے جبکہ دیگر تراجم میں نبی کریم بھٹکا ہوا بھولا
بھٹکا ہوا، بے خبر۔ ناواقف کہہ کر گرفتار انداز اختیار کیا گیا ہے اگر نبی کریم اعلان
نبوت سے پہلے معاذ اللہ بھولے بھٹکے ہوئے۔ شریعت سے بے خبر اور ہدایت
اور سید ہی راہ سے ناواقف تھے تو اس کفر کی سرین میں تو بھٹکے سامنے سجدہ ریز بھی ہونے کفار کی

طرح معاذ اللہ عام برائیوں کا ارتکاب بھی کرتے۔ حالانکہ نبی کریم اور جمیع انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور بعد میں تمام صفات و کمالات سے پاک ہوتے ہیں اسی وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور راہِ حق سے باخبر ہوتے ہیں۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں اپنی عبودیت اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اپنی نبوت اور اپنے دیگر کمالات کا اعلان فرماتے ہیں تو کیا وہ بے خبری، ناواقفی، بھولے بھٹکے ہوئے حالات میں کرتے ہیں یا کہ سب کچھ جانتے ہوئے یہ اعلان فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام اپنے عہد میں اپنے عہد ہونے کو جاننے کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے باخبر ہونے کو بیان کرتے ہیں۔ اور اپنی نبوت اور اپنے کمالات اور کئی شرعی احکام سے علم رکھنے کا برملا اعلان کرتے ہیں تو یقیناً نبی محترم جمیع انبیاء کرام سے افضل ہونے کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ ہر مخالف بھی اعلیٰ حضرت کی بڑی کوتاہی سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اس مقام پر جا کر کیا کہ صحیح غلط اور غلط صحیح نظر سمجھ آنے لگا اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ان الفاظ سے اعتراض کیا گیا۔ ووجدك ضالاً اس جگہ اپنی محبت اور اپنی طرف کے جملے من گھڑت ہیں۔ افسوس کہ اگر تفسیر کا مطالعہ کیا ہوتا تو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تفسیر کی عبارت ملاحظہ فرمائیں جن سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی ذمہ داری واضح ہے تفسیر کبیر میں علامہ رازی نے اس آیت کریمہ کی بیس توجیہات بیان کی ہیں لیکن ان میں سے وہ وجہ جس سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی بڑی سبب آتی ہے وہ یہ ہے۔ الضلال بمعنی المحبۃ کما فی قولہ انک لفی ضلالک القدیم ای محبتک ومعناہ انک محب فہدیتک الی الشرائع الی بہا متقرب الی خدمتہ محبوبک یعنی اس جگہ ضلال بمعنی محبت ہے جس طرح انک لفی ضلالک القدیم میں ضلال کا معنی محبت ہے۔ یہاں معنی یہ ہو گا کہ بے شک آپ محب ہیں یعنی آپ کو اپنی محبت میں وارفتہ پایا تو اپنی طرف ہدایت دی ان راستوں کی راہنمائی کی جی جیسے محبوب کی خدمت کا قرب حاصل ہو گا نبی کریم کا محبوب اللہ تعالیٰ کی ذات ہی تو ہے۔ روح المعانی میں ہے۔

ووجدك ضالاً عن معنى محض المودة الا اول فسقائك كما سامن شراب القرية
 والمودة فهداك به الى معرفته عزوجل وقال جعفر الصادق رضی اللہ
 عنہ كنت ضالاً عن محبتك في الانهال فمكنت عليك بمعرفتي - آپ حقیقتہ
 محبت میں وارفتے تھے تو آپ کو شراب قرب و محبت کا جام پلایا اپنی معرفت کی راہ دی
 حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کا مقصود یہ ہے کہ آپ کو ازل میں میری
 جو محبت حاصل تھی آپ اس میں وارفتے تھے پھر میں نے آپ پر احسان کیا کہ اپنی
 معرفت کی طرف راہ دی تفسیر مظہری میں اس طرح ہے وقال بعض الصوفیة معناه
 ووجدك محبا عاشقا مفرطاً في الحب والعشق - صوفیائے کرام نے فرمایا کہ
 اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو اپنی محبت و عشق میں وارفتہ عاشق و محب پایا الجامع الکلام
 البیان للقرطبي میں ہے وقيل ووجدك محبا للمهداية فهلاك اليها
 ويكون الضلال بمعنى المعبة ومنه قوله تعالى انك لبي
 ضلالك القديم - آپ کو اپنی محبت کی راہ تلاش کرنے میں وارفتہ پایا تو اپنی طرف
 راہ دی یہاں ضلال بمعنی محبت ہے جیسا کہ انک لبی ضلالک القديم
 میں ضلال بمعنی محبت ہے اس مقام کے نانک ہونے کی وجہ سے مفسرین کرام توجیہات
 کرتے نظر آتے ہیں ورنہ آسانی سے وہ بھی کہہ سکتے تھے تمہیں بھٹکا ہوا پایا تو ہدایت
 دی - علامہ رازی کی پیش کردہ توجیہات سے کچھ پیش کر رہا ہوں -

۱- ان قد يخاطب السيد ويكون المراد قومه فقوله
 ووجدك ضالاً اى وجد قومك ضالاً - فهداهم
 بك وبشرعك - یہاں خطاب آقا کو اور مراد آپ کی امت ہے کہ
 آپ کی قوم کو بھٹکا ہوا پایا اور ان کو راہ دی - اس صورت میں ترجمہ
 بھٹکا ہوا اگرنا درست ہے لیکن نسبت قوم کی طرف لکھتے اور ترجمہ
 بھی ایسا ہی ہونا چاہئے جسٹن میں قوم کا ذکر ہو -

۲- ووجدك ضالاً عن المهجبة متعیناً فی مید قریش

متمنيا فزاقهم وكان لا يملكك الخس وجم بدون
 اذنه تعالى فلا اذنه ووافق الصديق عليه
 آپ ہجرت کیلئے بیتاب تھے قریش کو چھوڑنے کی آپ تمنا رکھتے
 تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر آپ کو ہجرت کرنا ممکن نہیں تھا
 پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما
 کے ہمراہ ہوئے۔

۳۔ ضلالت عن القبلة فان كان يتمنى ان تجعل الكعبة
 قبلته وما كان يعرف ان ذلك هل يحصل له
 ام لا فهداه الله بقوله فلمولينك قبلة ترضاها
 فكانه ذلك التحير بالضلال۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ
 وسلم بیت المقدس سے کعبہ المکرمہ کے تبدیل ہونے کی بہت زیارہ تمنا رکھتے
 تھے کہ کعبہ قبلہ بدلے گا تو اللہ تعالیٰ نے اسے تھمیر و بے قراری سے
 راہ دی اور یہ ارشاد فرمایا فلمولينك قبلة ترضاها
 آپ کی مرضی کے مطابق ہم قبلہ بدل رہے ہیں اسی تھمیر و بے قراری کا
 نام ضلال ہے۔

اس طرح کئی توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ صرف اسی وجہ سے
 تاکہ نبی کریم کو کوئی بھولا بھٹکا ہوا نہ کہے۔ لیکن افسوس کہنے والوں نے پھر
 بھی کہہ دیا۔ اسی طرح مدارج النبوة میں شیخ نے کئی وجوہ بیان کی ہیں ایک
 وجہ ہے جس کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے۔ آپ نے اس طرح ذکر فرمایا
 انکہ مراد بضعال محبت است یعنی یافت تراحب وطالب معرفت من تسمیہ
 محب بضعال بسیار آمدہ است کہ گم می گردد و از اختیار و قرار خود بر نہج
 معقول نمی تواند رفت چنانکہ انالذکر فی ضلال بین وانک لفی ضلالک للقدیم
 یعنی ضلال کا معنی محبت ہے مطلب یہ ہوا کہ میں نے اپنی محبت میں وارفتہ (گم)

پہا پھر اپنی طرف راہ دی۔ ضال محب کے معنی میں بہت آتا رہتا ہے۔ کیونکہ محبت میں اختیار برقرار نہیں رہتا جیسے انا لئراک فی ضلال مبین اور انک لفی ضلالک القدیم میں ضلال بمعنی محب کا محبت میں گم ہونا ہے

وَالْعَصْرِ (۱۶)

قسم ہے عصر کی - (محمود الحسن)
 قسم ہے زمانہ کی - (عبدالماجد)
 زمانے کی قسم - (مردودی)
 عصر کی قسم - (فتح محمد)
 اس زمانہ محبوب کی قسم - (اعلیٰ حضرت)

اگرچہ اس مقام پر تمام اقوال ملتے ہیں لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے محبت حبیب کبریا علیہ التحیۃ والتناہ کا واضح ثبوت ملتا ہے اس پر تفاسیر کے اقوال بھی موجود ہیں۔ اسی قول کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پسند کرتے ہوئے مدارج النبوة میں درج فرمایا۔ روح المعانی میں ہے وقیل المراد به عصر النبوة وكانه عنق به وقت حياته عليه الصلوة والسلام فانما شرف اعصار تشریف النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی عصر سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ نبوت کی قسم ہے۔ گویا کہ آپ کی زندگی مطہرہ کے زمانہ کی قسم اٹھائی گئی ہے کیونکہ وہی زمانہ سب زمانوں سے اعلیٰ و مشرف ہے تفسیر کبیر میں ہے والعصر ای والعصر الذی انت فیہ فہو تعالیٰ اقسامہ بزمانہ فی هذه الایۃ وبمکانہ فی قولہ وانت احل بہذا المبلد و بعمرہ فی قولہ لعمرک فکانہ قل و عصرک و ببلدک و عمرک۔ یعنی والعصر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں اسے محبوب آپ

تشریف فرما ہیں۔ اس آیت میں نبی کریم کے زمانہ کی قسم ہے و انت حل
 بنہذا البلد میں نبی کریم کے شہر کی قسم۔ اور لعسک میں نبی کریم کی
 عمر کی قسم ہے۔ گویا رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ آپ سے محبوب آپ کے زمانہ اور
 شہر اور آپ کی عمر کی قسم۔ مدارج میں ہے پس قسم یاو کردومی تعالیٰ در یخبا
 بزمان رسول چنانکہ قسم خورد و بکمان و می صلی اللہ علیہ وسلم در لاقسم بہنا
 البلد و لعبرومی در قول خود لعمرک۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی قسم اور لاقسم بہذا البلد میں
 کہا ہے آپ کے شہر کی قسم اسی طرح لعمرک میں ارشاد آپ کی عمر کی قسم۔
 کلام مجید کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی قسمیں

اٹھا کر اس کی شان کو بلند و بالا فرمایا اور اسی شان کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی

رحمۃ اللہ علیہ نے یوں جاڑے سخن سے آراستہ فرمایا ہے

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا !!

کہ کلام مجید نے کھائی شہا توہے شہر و کلام و بقا کی قسم

(حدائق بخشش)

تمت بالخیر

وما علینا الا المبالغ

عبدالرزاق حطاروی۔ محتر الوی

بروز بدھ۔ یکم جنوری ۱۹۸۶ء
 ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ

فہرس

۴۶	وَأَنذَرْنَا فِي الْأَخِرَةِ لِمَنِ الصَّالِحِينَ	۱	ابتداء سخن
۴۷	قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا	۱۹	خطبہ
۴۸	لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ	۲۰	بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
۴۹	فَسَيَكْفِيكُمْ اللَّهُ	۲۲	الْحَمْدُ لِلَّهِ
۵۰	وَ يَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا	۲۳	إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
۵۱	إِلَّا لِنَعْلَمَ	۲۴	الَّذِي ذُكِرَ فِي الْكِتَابِ
۵۲	وَلَمَّا أَتَيْتُمُ الْمَدِيْنَةَ	۲۶	يُخَدِّعُونَ اللَّهَ
۵۳	فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ	۲۹	اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
۵۴	وَمَا أَهْلَ بَيْتِهِ لِيُفْرِقَ اللَّهُ	۳۰	وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ
۵۵	قَالُوا يَا بَشِئْرُ مُحَمَّدٍ	۳۲	وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ
۵۶	أُحِلَّ لَكُمْ كَيْفَ لَبِئَةِ الصِّيَامِ الرَّفَثُ	۳۳	إِلَّا عَلَى الْخَشِيعِينَ
۵۷	فَلَا رَفَثَ	۳۵	وَأَتُوا الزَّكَاةَ
۵۸	يَمْ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ	۳۶	وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ
۵۹	أَن يَأْتِيَهُمْ آيَةٌ	۳۸	وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً
۶۰	فَأَن تَوَّعَّتُمْ أَن يَأْتِيَكُمُ الْكُفْرُ	۴۲	ثُمَّ آتَاكُمْ الْوَعْدَ
۶۱	وَلَمَّا طَلَّكَ بِمَنَامٍ بِالْمَعْرُوفِ	۴۳	فَفَرِيَ كَذَبُكُمْ
۶۲	وَلَا تُخَالِفُوا لِشَاقَةِ الرَّسُولِ	۴۵	وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً

۱۰۴	فَكُلُوا مِنَّمَا آتَيْنَاكُمْ	۷۷	فَبِهِتَ الَّذِي كَفَرَ
۱۰۶	إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ	۷۹	الشَّيْطَانُ يُعِدُّكُمْ
۱۰۷	وَأَشْكُرُوا مَا آتَيْنَاكُمْ	۷۹	أَوْ نَذَرْتُمْ مِمَّنْ نَنْذِرُ
۱۰۸	وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ شَهْوَاهِهِمْ	۸۰	وَاصْطَفَيْكَ عَلَى الْعَالَمِينَ
۱۰۹	هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ	۸۲	نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ
۱۱۱	وَالْمَوْتَى يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ	۸۲	وَمَكْرُوا وَمَكْرَ اللَّهِ
۱۱۳	وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ	۸۵	إِنِّي مُتَوَقِّفٌ
۱۱۵	فَكُنْ مِنَ الظَّالِمِينَ	۸۶	ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ
۱۱۷	وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ	۸۸	وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ
۱۱۸	قُلْ أَدْعُوا مِن دُونِ اللَّهِ	۸۹	وَلِيَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
۱۲۰	فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا	۹۰	وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
۱۲۲	وَكَلَّا فَضَلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ	۹۲	أَفَأَنْ تَمَاتَ أَوْ قُتِلَ
۱۲۵	فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُسْتَرِينَ	۹۲	بَعْضُ مَا كَسَبُوا
۱۲۶	وَإِنْ تُطْعَمُوا أَكْثَرُ مِمَّنْ فِي الْأَرْضِ	۹۳	وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ
۱۲۸	وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ الَّذِينَ	۹۴	لَا يَغْنَثُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا
۱۲۹	فَوَافْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا	۹۴	إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ
۱۳۱	سَعَرُوا أَهْلِي النَّاسِ	۹۷	وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا
۱۳۲	وَلَا تَتَّبِعُوا سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ	۱۰۰	وَالْمُخَضَّنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ
۱۳۲	لَنْ كِيدِي مَتِينٌ	۱۰۱	مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ
۱۳۳	وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ	۱۰۲	أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ
۱۳۴	قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي	۱۰۳	إِنَّ السُّفِيهَاتِ يُخْدِعُونَ اللَّهَ

۱۳۵	وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ	۱۳۵	بِرَاءةٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
۱۳۸	قُلِ دَعُوا الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ	۱۳۸	فَتَبْطِغُوا
۱۳۹	يَأْخُذْ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا	۱۳۹	سَخَّرَ اللَّهُ مِنْهُمْ
۱۴۰	مُضِدُونَ فِي الْأَرْضِ	۱۴۰	فَسُوا اللَّهُ فَتَسِيَهُمْ
۱۴۱	قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	۱۴۱	السَّاعُونَ
۱۴۲	قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي	۱۴۲	فَرَأَيْتَهُ عَلَى الْعَرْشِ
۱۴۳	فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ	۱۴۳	قُلِ اللَّهُ أَشْرَعُ مَكْرًا
۱۴۸	وَأَتَيْنَهُ الْحُكْمَ صَبِيحًا	۱۴۸	وَأَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً
۱۵۰	وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ	۱۵۰	وَمَلِئْنَا بَاطِنَ الْاَعْلَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ
۱۵۱	إِذَا وَجِئْنَا إِلَىٰ آلِكَ مَا أُوحِيَ	۱۵۱	فَأَنَّا نَسْخَرُهُمْ
۱۵۲	وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا	۱۵۲	هُوَ الَّذِي بَنَىٰ قَوْمًا لَّهُمْ لَكُمُ
۱۵۶	قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذُكُرُ مُرِيحًا	۱۵۶	إِنَّا أَنَا نَلْفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ
۱۵۷	لَهُ إِبْرَاهِيمَ	۱۵۷	وَلَقَدْ هَمَمْتُ بِهِ وَهَمَرْتُ بِهَا
۱۶۳	قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ	۱۶۳	وَأَنخِرُوا الْمُنْزِلِينَ
۱۶۵	لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا ظُنُّوا كَانُوا مِن	۱۶۵	كَذَلِكَ كَذَّبْنَا لِيُؤْمِنُوا
۱۶۶	أَيُّكُمْ لِمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ	۱۶۶	إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ
۱۶۷	مَا أَرَسْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ	۱۶۷	حَسْبُ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ
۱۶۸	وَإِذَا التُّورُ إِذْ ذَهَبَ مُخْلَصًا	۱۶۸	مِن حَمَلٍ مُّسْتَوٍ
۱۶۹	فَلَذَكِّرُوا أَنَّهُم لِيُؤْخِطَهَا صَوَافٍ	۱۶۹	مِن نَّارِ السَّمُومِ
۱۷۰	وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ	۱۷۰	وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن دُونِي
۱۷۱	لَا تَبْقَىٰ لِلنَّاسِ	۱۷۱	تَشْفِدُونَ مِنِّي مَكْرًا

۲۳۸	فِي شُقْلٍ فَلَهِوَدَ	۲۱۹	مُتَكَبِّرِينَ بِهَا سِمْرَاتٍ مَجْرُودَ
۲۳۸	بَلْ هُوَ الْيَوْمَ مُسْتَلِمُونَ	۲۲۱	بَلْ اتَّبِعْتَهُمْ بِذِكْرِهِمْ
۲۵۰	فَرَأَعْمَلَهُمْ فُضْرًا بِالْيَمِينِ	۲۲۲	وَلَا تُكْرَهُوَ وَاقْتِيَاتِكُمْ عَلَى الْبِعَاءِ
۲۵۲	فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعَى	۲۲۳	وَقَدِمْنَا إِلَى مَا عَمِلُوا
۲۵۵	وَسَلَّمَ لِلْجَبِينِ	۲۲۶	إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ
۲۵۷	إِذَا بَقِيَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ	۲۲۷	وَتَنَحُّونَ مِنَ الْجِبَالِ بُوتًا
۲۵۷	وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهَا شَجَرًا مِنْ يَفْعُطِينَ	۲۲۸	وَأَدْخَلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ
۲۵۹	لَعْنُ أَشْرَكَتَ لِيَحْبِطَنَّ عَمَلُكَ	۲۲۸	الصَّالِحِينَ -
۲۶۲	وَجِئْتَنِي بِالْيَمِينِ وَالشَّهَادَةِ	۲۲۹	وَلَوْلَا أَنْ رَبَطْنَا عَلَى قَلْبِهَا
۲۶۵	ذِي الطَّوْلِ	۲۳۰	فَصُرْتُ بِهَا مِنْ جُنُبٍ
۲۶۶	مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَيْثُمْ قَالُوا سَفِيمٌ	۲۳۱	عَلَى أَنْ تَأْجُرَنِي تَمَانِي حَجِيرٍ
۲۶۸	وَإِنْ يَكُ كَذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ	۲۳۱	إِنَّكَ تَهْدِينِي مَنْ أَحْبَبْتَ
۲۶۹	مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْآيَاتُ	۲۳۳	وَلَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي
۲۷۰	مَا كَانَ لِيَشْرَأَنَّ بِكَلِمَةٍ مِنَ اللَّهِ الْأَوْحِيَّ	۲۳۴	وَلَنْذِيْقَتَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْآدِنِي
۲۷۲	قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَكَدٌّ	۲۳۵	فَأَخْرَجْتُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ
۲۷۴	فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ	۲۳۹	الَّتِي أَقُولُ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ نَفْسِهِمْ
۲۷۵	وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ	۲۴۰	مَنْ يَأْتِ بِكُفْرٍ يَأْحَسْتَهُ
۲۸۳	لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ	۲۴۱	وَتَخَشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحْوَنُ أَنْ تَخْشَى
۲۸۶	مِنْ ذَنْبِكَ	۲۴۲	إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا
۲۸۶	فَتَوَلَّى بِرُكْنِهِ	۲۴۶	لِيُجِبَالَ آوِيٍّ مَعَهُ
۲۹۰	عَلَّمَ شَدِيدُ الْقُوَى	۲۴۷	فَلَمَّا خَرَّ

۳۱۱	۲۹۰	لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ	نَمَدَنِي قَدَدِي
۳۱۲	۲۹۱	إِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ	فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ
۳۱۲	۲۹۹	يَأْتِيهَا الْمُرْمَلُ	فِي أَيِّ الْأَيُّورِيكَ تَسَارَىٰ
۳۱۳	۳۰۰	وَالْتُرَعِبْتَ عُزْرًا	الْوَحْشِينَ عَلَّمَ الْقُرْآنَ
۳۱۴	۳۰۶	وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ	فَاتَهُمُ اللَّهُ مِنْ جَيْثٍ لَا يَحْتَسِبُ
۳۱۵	۳۰۷	إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمُرْصَادِ	الْبَارِي الْمُنْصَوِّرُ
۳۱۶	۳۰۸	لَا أُقِيمُ بِهَذَا الْبَلَدِ	وَتَوَكُّوكَ قَائِمًا
۳۱۸	۳۰۹	وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ	يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ
۳۲۲	۳۱۰	وَالْعَصِيرِ	إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ

مجلد اول

والذي يجمع له انشاء على الكفار رحمة بيدهم

منظور احمد انور تلميذ امام الخطاطين جناب خورشيد قاسم لاهور